خواہشیں!

احادیث اہلبیتؑ کی روشنی میں

آیۃ اللہ محمد مہدی آصفی

مترجم: سید کمیل اصغر زیدی

مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

Presented by: www.jafrilibrary.com

”شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا رحم کرنے والا مہربان ہے“

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم : "انی تارک فیکم الثقلین، کتاب الله، وعترتی اهل بیتی ما ان تمسکتم بهما لن تضلّوا ابدا وانهما لن یفترقا حتّیٰ یردا علیّ الحوض".

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا تا ہوں: (ایک) کتاب خدا اور (دوسری) میری عترت اہل بیت (علیہم السلام)، اگر تم انھیں اختیار کیے رہو تو کبھی گمراہ نہ ہو گے، یہ دونوں کبھی جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچیں"۔

(صحیح مسلم: ۱۲۲/۷، سنن دارمی: ۴۳۲/۲، مسند احمد: ج ۳، ۱۴، ۱۷، ۲۶، ۵۹.
۳۶۶/۴ و ۳۷۱، ۱۸۲/۵، اور ۱۸۹، مستدرک حاکم: ۱۰۹/۳، ۱۴۸، ۵۳۳.
وغیرہ)

خواہشیں!

احادیث اہلبیتؑ کی روشنی میں

خواہشیں!

احادیث اہلبیتؑ کی روشنی میں

آیۃ اللہ شیخ محمد مہدی آصفی مدظلہ

مترجم: سید کمیل اصغر زیدی

مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

کتاب کا نام: خواہشیں! احادیث اہلبیتؑ کی روشنی میں

مصنف: آیۃ اللہ شیخ محمد مہدی آصفی مدظلہ

مترجم: سید کمیل اصغر زیدی

تصحیح: سید منظر صادق زیدی

نظر ثانی: سید احتشام عباس زیدی

پیشکش: معاونت فرہنگی ادارہ ترجمہ

ناشر: مجمع جہانی اہلبیتؑ

کمپوزنگ: سید حسن اصغر نقوی

طبع اول: ۱۴۲۶ھ ۲۰۰۵ء

تعداد ۳۰۰۰

پریس: لیلا

ISBN:964-529-067-8
www.ahl-ul-bayt.org
Info@ahl-ul-bayt.org

Presented by: www.jafrilibrary.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

بنام خدائے رحمان ورحیم

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ☆ مَلِكِ النَّاسِ ☆

اے رسول کہہ دیجئے کہ میں انسانوں کے پروردگار کی پناہ چاہتا ہوں جو تمام لوگوں کا مالک و بادشاہ

اِلٰهِ النَّاسِ ☆ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ☆ الَّذِى

اور سارے انسانوں کا معبود ہے شیطانی وسواس کے شر سے جو نام خدا سن کر پیچھے ہٹ جاتا ہے

يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ ☆ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ☆

اور جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کراتا ہے وہ جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔

Presented by: www.jafrilibrary.com

فہرست

پہلی فصل

Presented by: www.jafrilibrary.com

دوسری فصل

تیسری فصل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف اول

جب آفتاب عالم تاب افق پر نمودار ہوتا ہے کائنات کی ہر چیز اپنی صلاحیت وظرفیت کے مطابق اس سے فیضیاب ہوتی ہے حتی ننھے ننھے پودے اس کی کرنوں سے سبزی حاصل کرتے اور غنچے وکلیاں رنگ ونکھار پیدا کرلیتی ہیں تاریکیاں کافور اور کوچہ وراہ اجالوں سے پرنور ہوجاتے ہیں، چنانچہ متمدن دنیا سے دور، عرب کی سنگلاخ وادیوں میں قدرت کی فیاضیوں سے جس وقت اسلام کا سورج طلوع ہوا، دنیا کی ہر فرد اور ہر قوم نے اپنی قوت وقابلیت کے اعتبار سے فیض اٹھایا۔

اسلام کے مبلغ وموسس سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غار حراء سے مشعل حق لے کر آئے اور علم وآگہی کی پیاسی اس دنیا کو چشمۂ حق وحقیقت سے سیراب کردیا، آپ کے تمام الٰہی پیغامات ایک ایک عقیدہ اور ایک ایک عمل فطرت انسانی سے ہم آہنگ ارتقائے بشریت کی ضرورت تھا، اس لئے ۲۳ برس کے مختصر عرصے میں ہی اسلام کی عالمتاب شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں اور اس وقت دنیا پر حکمراں ایران وروم کی قدیم تہذیبیں اسلامی قدروں کے سامنے ماند پڑ گئیں، وہ تہذیبی اصنام جو صرف دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں اگر حرکت وعمل سے عاری ہوں اور انسانیت کو سمت دینے کا حوصلہ، ولولہ اور شعور نہ رکھتے ہوں تو مذہب عقل وآگہی سے روبرو ہونے کی توانائی کھودیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ایک چوتھائی صدی سے بھی کم مدت میں اسلام نے تمام ادیان و مذاہب اور تہذیب و روایات پر غلبہ حاصل کرلیا۔

اگرچہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ گرانبہا میراث کہ جس کی اہلبیت علیہم السلام اور ان کے

Presented by: www.jafrilibrary.com

پیرووں نے خود کو طوفانی خطرات سے گزار کر حفاظت و پاسبانی کی ہے، وقت کے ہاتھوں خود فرزندان اسلام کی بے توجہی اور ناقدری کے سبب ایک طویل عرصے کے لئے تنگنائیوں کا شکار ہو کر اپنی عمومی افادیت کو عام کرنے سے محروم کردی گئی تھی، پھر بھی حکومت و سیاست کے عتاب کی پروا کئے بغیر مکتب اہلبیت علیہم السلام نے اپنا چشمۂ فیض جاری رکھا اور چودہ سو سال کے عرصے میں بہت سے ایسے جلیل القدر علماء و دانشور دنیائے اسلام کو تقدیم کئے جنھوں نے بیرونی افکار و نظریات سے متاثر اسلام و قرآن مخالف فکری و نظری موجوں کی زد پر اپنی حق آگین تحریروں اور تقریروں سے مکتب اسلام کی پشت پناہی کی ہے اور ہر دور اور ہر زمانے میں ہر قسم کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا ہے، خاص طور پر عصر حاضر میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ساری دنیا کی نگاہیں ایک بار پھر اسلام و قرآن اور مکتب اہلبیت علیہم السلام کی طرف اٹھی اور گڑی ہوئی ہیں، دشمنان اسلام اس فکری و معنوی قوت و اقتدار کو توڑنے کے لئے اور دوستداران اسلام اس مذہبی اور ثقافتی موج کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے اور کامیاب و کامراں زندگی حاصل کرنے کے لئے بے چین و بے تاب ہیں، یہ زمانہ علمی اور فکری مقابلے کا زمانہ ہے اور جو مکتب بھی تبلیغ اور نشر و اشاعت کے بہتر طریقوں سے فائدہ اٹھا کر انسانی عقل و شعور کو جذب کرنے والے افکار و نظریات دنیا تک پہنچائے گا، وہ اس میدان میں آگے نکل جائے گا۔

(عالمی اہلبیتؑ کونسل) مجمع جہانی اہلبیت علیہم السلام نے بھی مسلمانوں خاص طور پر اہلبیتؑ عصمت و طہارت کے پیرووں کے درمیان ہم فکری و یکجہتی کو فروغ دینا وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اس راہ میں قدم اٹھایا ہے کہ اس نورانی تحریک میں حصہ لے کر بہتر انداز سے اپنا فریضہ ادا کرے، تاکہ موجودہ دنیائے بشریت جو قرآن و عترت کے صاف و شفاف معارف کی پیاسی ہے زیادہ سے زیادہ عشق و معنویت سے سرشار اسلام کے اس مکتب عرفان و ولایت سے سیراب ہو سکے، ہمیں یقین ہے عقل و خرد پر استوار ماہرانہ انداز میں اگر اہلبیتؑ عصمت و طہارت کی ثقافت کو عام کیا جائے اور حریت و بیداری کے علمبردار خاندان نبوتؐ و رسالت کی جاوداں میراث اپنے صحیح خدو خال

میں دنیا تک پہنچادی جائے تو اخلاق وانسانیت کے دشمن، انانیت کے شکار، سامراجی خوں خواروں کی نام نہاد تہذیب وثقافت اور عصر حاضر کی ترقی یافتہ جہالت سے تھکی ماندی آدمیت کو امن ونجات کی دعوتوں کے ذریعہ امام عصر (عج) کی عالمی حکومت کے استقبال کے لئے تیار کیا جاسکتا ہے۔

ہم اس راہ میں تمام علمی وتحقیقی کوششوں کے لئے محققین ومصنفین کے شکر گزار ہیں اور خود کو مؤلفین ومترجمین کا ادنیٰ خدمتگار تصور کرتے ہیں، زیر نظر کتاب، مکتب اہلبیت علیہم السلام کی ترویج واشاعت کے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، فاضل علامہ آیۃ اللہ شیخ محمد مہدی آصفی مدظلہ کی گرانقدر کتاب (الهوی فی حدیث اهل البیتؑ) کو سید کمیل اصغر زیدی نے اردو زبان میں اپنے ترجمہ سے آراستہ کیا ہے جس کے لئے ہم دونوں کے شکر گزار ہیں اور مزید توفیقات کے آرزومند ہیں، اسی منزل میں ہم اپنے ان تمام دوستوں اور معاونین کا بھی صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جنھوں نے اس کتاب کے منظر عام تک آنے میں کسی بھی عنوان سے زحمت اٹھائی ہے، خدا کرے کہ ثقافتی میدان میں یہ ادنیٰ جہاد رضائے مولیٰ کا باعث قرار پائے۔

والسلام مع الاکرام

مدیر امور ثقافت، مجمع جہانی اہلبیت علیہم السلام

مقدمہ مؤلف

آپ کے سامنے اس حدیث قدسی سے متعلق کچھ فکری کاوشوں کا نتیجہ حاضر خدمت ہے جو خواہشات نفس، ان کی پیروی اور مخالفت نیز انسانی زندگی میں ان کے آثار کے بارے میں وارد ہوئی ہے۔

یہ فکری کوشش درحقیقت ان یادداشتوں کا مجموعہ ہے جنہیں میں نے حوزہ علمیہ قم کے کچھ طلاب کے درمیان درس کے عنوان سے بیان کیا تھا، اور اب خداوند عالم نے انہیں اس شکل وصورت میں مرتب اور نشر کرنے کی توفیق عنایت فرمادی ہے۔

ان تمام عنایتوں پر اسکی حمد ہے۔ اور اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اسے مومنین کے لئے مفید بنادے اور اسکے صاحب تحریر کے لئے بھی اس دن فائدہ مند قرار دے کہ جس دن مال واولاد کچھ کام نہ آئیں گے۔

محمد مہدی آصفی

قم مقدسہ

۲۸ر شوال ۱۴۱۲ھ

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حدیث قدسی

عن الامام الباقر(ع):عن رسول الله(ص)قال:یقول الله عزوجل:

"وعزتی،وجلالی،وعظمتی،وکبریائی،ونوری،وعُلُوّی،وارتفاعِ مکانی، لایؤثرعبد هواه علیٰ هوای إلاشتّتُ أمره،ولبّست علیه دنیاه،وشغلت قلبه بها،ولم أوته منهاإلاماقدّرت له.

وعزتی،وجلالی،وعظمتی،وکبریائی،ونوری،وعُلُوّی،وارتفاع مکانی، لایؤثرعبد هوای علیٰ هواه إلااستحفظته ملائکتی،وکفّلت السماوات والارض رزقه،وکنت له من وراء تجارة کل تاجر،وأتته الدنیاوهی راغمة"(۱)

---

(۱)عدۃ الداعی:ص ۱۷۹۔اصول کافی:ج۲ص ۳۳۵۔بحارالانوار:ج۷۰ص ۷۸۔بحارالانوارج۷۰ص ۸۵ و۸۶۔الجواہرالسنیۃ فی الاحادیث القدسیۃ:ص۳۲۲۔اور شیخ محمد مدنی نے تقریباً انہیں الفاظ میں اسے:الاتحافات السنیۃ فی الاحادیث القدسیۃ:ص۲۷پرنقل کیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیم

حدیث قدسی

امام محمد باقرؑ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے:

''میری عزت وجلالت، عظمت وکبریائی، نور ورفعت اور میرے مقام ومنزلت کی بلندی کی قسم کوئی بندہ بھی اپنی ہوی وہوس کو میری مرضی اور خواہش پر ترجیح نہیں دیگا مگر یہ کہ میں اسکے امور کو درہم برہم کردونگا اسکے لئے دنیا کو بنا سنوار دونگا۔ اسکے دل کو اسی کا دلدادہ بنا دونگا اور اسکو صرف اسی مقدار میں عطا کرونگا جتنا پہلے سے اسکے مقدر میں لکھ دیا ہے''

''اور میری عزت وجلالت، عظمت وکبریائی، نور ورفعت اور مقام ومنزلت کی بلندی کی قسم کوئی بندہ میری مرضی کو اپنی خواہش پر ترجیح نہیں دیگا مگر یہ کہ ملائکہ اسکی حفاظت کرینگے۔ آسمان اور زمین اسکے رزق کے ذمہ دار ہیں اور ہر تاجر کی تجارت کی پشت پر میں اسکے ساتھ موجود ہوں گا اور دنیا اسکے سامنے ذلت ورسوائی کے لبادہ میں حاضر ہوگی''

یہ حدیث شریف ان روایات میں سے ہے جن کی شہرت کتب فریقین میں مستفیضہ ہونے کی حد تک ہے۔

ہم نے اس حدیث کو مختلف سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے جن میں سے بعض سندیں ہمارے نزدیک صحیح ہیں۔

اس حدیث کی تشریح تین فصلوں میں پیش کی گئی ہے۔

پہلی فصل: ہوائے نفس کی تعریف، اس کے عوارض کی تشخیص، اسکے علاج اور اس پر قابو پانے کے راستے پر مشتمل ہے یہ فصل در حقیقت اس کتاب (حدیث کی تشریح) کا مقدمہ ہے۔

دوسری فصل: اپنی خواہش کو خداوند عالم کی مرضی پر ترجیح دینے والوں کے ذکر میں ہے۔

تیسری فصل: خداوند عالم کی مرضی کو اپنی خواہش پر ترجیح دینے والوں کے ذکر میں ہے۔

پہلی فصل

خواہش

قرآن وسنت کی روشنی میں

''ہویٰ'' (خواہش) قرآن وحدیث کی روشنی میں

ہویٰ (خواہش) ایک اسلامی اصطلاح ہے جو قرآن وحدیث سے ماخوذ ہے۔ اسلامی تہذیب میں اسکے اپنے ایک خاص معنی مراد لئے جاتے ہیں۔

یہ لفظ قرآن اور احادیث میں کثرت سے استعمال ہوا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ أرأيت من اتخذ إلٰهه هواه أفأنت تكون عليه وكيلا ﴾(۱)

''کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہشات ہی کو اپنا خدا بنالیا ہے کیا آپ اس کی بھی ذمہ داری لینے کے لئے تیار ہیں''

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے: ﴿وأما من خاف مقام ربه ونهى النفس عن الهوىٰ فإن الجنة هي المأوىٰ﴾(۲)

''اور جس نے رب کی بارگاہ میں حاضری کا خوف پیدا کیا ہے اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکا ہے تو جنت اس کا ٹھکانا اور مرکز ہے''

---

(۱) سورۂ فرقان آیت ۴۳۔

(۲) سورۂ نازعات آیت ۴۰۔۴۱۔

سید رضی نے مولائے کائنات حضرت علیؑ کا یہ قول نہج البلاغہ میں نقل کیا ہے:

﴿إن أخوف ماأخاف عليكم إثنان: إتباع الهوىٰ وطول الأمل﴾

''مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ دو چیزوں کا خوف رہتا ہے: خواہشات کی پیروی اور آرزوؤں کا طولانی ہونا''

پیغمبر اکرم ﷺ اور امام جعفر صادقؑ دونوں سے ہی یہ حدیث نقل ہوئی ہے کہ آپ حضرات نے فرمایا:

﴿إحذروا أهوائكم كماتحذرون أعدائكم، فليس شي أعدىٰ للرجال من اتباع أهوائهم وحصائدالسنتهم﴾(۱)

''اپنی خواہشات سے اسی طرح ڈرتے رہو جس طرح تم اپنے دشمنوں سے ڈرتے ہو۔ کیونکہ انسان کیلئے خواہشات کی پیروی اور زبان کے نتائج سے بڑا کوئی دشمن نہیں ہے۔''

اور امام جعفر صادقؑ ہی سے یہ بھی منقول ہے کہ:

﴿لاتدع النفس وهواها، فإن هواها رداها﴾(۲)

''نفس اور اسکی خواہشات کو ہرگز یونہی نہ چھوڑ دینا کیونکہ نفسانی خواہشیں ہی اسکی پستی کا باعث ہیں''

بنیادی محرکات

انسانی زندگی میں نفس اور ''خواہشات'' کیا کردار ادا کرتے ہیں اسکے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ خداوند عالم نے ہر انسان کو متحرک وفعال رکھنے اور علم وکمال کی جانب گامزن کرنے کے لئے

---

(۱) اصول کافی ج۲ص ۳۳۵۔

(۲) گذشتہ حوالہ

اسکے وجود میں کچھ بنیادی محرکات رکھے ہیں اور انسان کی تمام ارادی اور غیر ارادی حرکات نیز اسکی مادی ومعنوی ترقی انھیں بنیادی محرکات کی مرہون منت ہے یہ چھ محرکات ہیں اوران میں بھی سب سے اہم محرک ''ہویٰ'' یعنی خواہشات نفس ہے۔

۱۔فطرت: اس کے ذریعہ خداوند عالم نے اپنی معرفت نیز وفاء، عفت، رحمت، اور کرم جیسے اخلاقی اقدار کی طرف رجحان کی قوت ودیعت فرمائی ہے۔

۲۔عقل: یہ انسانی وجود میں حق وباطل کے درمیان تشخیص اورتمیز دینے کی ذمہ دار ہے۔

۳۔ارادہ: کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کا انحصار اسی پر ہوتا ہے اور شخصیت کا استقلال اسی سے وابستہ ہے۔

۴۔ضمیر: عدل وانصاف پر مبنی درونی وباطنی آواز ہے جس کا کام انسان کو صحیح فیصلہ سے آگاہ اور غلط باتوں پر اسکی توبیخ کرنا ہے تاکہ انسان حد اعتدال پر قائم رہے۔

۵۔قلب، صدر، : آیات قرآنی کے مطابق علم ومعرفت کا ایک اور دروازہ ہے۔ اسی پر خداوند عالم کی جانب سے علم ومعرفت کی تجلی ہوتی ہے۔

۶۔ہویٰ (خواہشیں): وہ خواہشات اور جذبات جو انسان کے نفس میں پائے جاتے ہیں اور ہر حال میں انسان سے اپنی تکمیل کا مطالبہ کرتے ہیں اوران کی تکمیل کے دوران انسان لذت محسوس کرتا ہے انسان کو متحرک رکھنے اوراسے علم ومعرفت سے مالا مال کرنے کے یہ اہم ترین محرکات ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے انسانی وجود میں ودیعت فرمایا ہے۔ سردست ان کی تعداد اور تفصیلات کے بارے میں کسی قسم کی علمی اور تفصیلی گفتگو مقصود نہیں ہے۔

نفسیات کے اس گوشہ پر ابھی اسلامی نقطہ نظر سے مزید غور وفکر اور بحث وجستجو کی ضرورت ہے۔ خدا کرے کہ کوئی ایسا بلند پایہ مفکر سامنے آجائے جو آیات وروایات کی روشنی میں اس گوشے سے متعلق فکری جولانیاں دکھا سکے۔ فکر اسلامی کا یہ گوشہ نہایت شاداب ہونے کے ساتھ ساتھ

اچھوتا بھی ہے اور یہی دونوں خصوصیات علماء و مفکرین کے اشہب فکر کو مہمیز کرنے کیلئے کافی ہیں۔

لہٰذا خداوند کریم سے یہ دعا ہے کہ جو شخص اسلامی علوم کے خزانوں کے سہارے اس مہم کو سر کرنے کا بیڑا اٹھائے وہ اسکے لئے ہر طرح کی آسانیاں فراہم کردے۔

فی الحال اس کتاب میں ہویٰ کے معنی، اسکی تعریف، اور انسانی زندگی میں اسکے کردار نیز اسکے خصوصیات، اثرات، اس سے مقابلہ کا طریقہ اور اس سے متعلق دوسرے امور کا جائزہ لینا مقصود ہے لہٰذا ہم انسانی وجود میں موجود دوسرے محرکات سے صرف نظر کرکے صرف اور صرف ''ہویٰ'' خواہشوں کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

''ہویٰ'' کی اصطلاحی تعریف

جب ہم اسلامی علوم میں ہویٰ کے معانی تلاش کرتے ہیں تو ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تہذیب وتمدن میں ہویٰ ''انسان کے اندر پوشیدہ ان خواہشات اور تمناؤں کو کہا جاتا ہے جو انسان سے اپنی تکمیل کے خواہاں ہوتے ہیں۔''

انسان کی شخصیت میں ان کا اہم کردار ہوتا ہے کیونکہ یہ انسان کو متحرک بنانے اور اسے آگے بڑھانے کا ایک بنیادی سبب نیز اسکی تمام ارادی اور غیر ارادی حرکتوں کی اہم کنجی ہیں۔

''ہویٰ'' کے خصوصیات

انسانی زندگی کی تعمیر یا بربادی میں اسکی نفسانی خواہشوں کے مثبت اور منفی کردار سے واقفیت کے لئے سب سے پہلے ان کی اہم خصوصیات کو جاننا ضروری ہے لہٰذا ہم آئندہ صفحات میں اسلامی نقطۂ نگاہ سے خواہشات نفس کے اہم خصوصیات کا جائزہ لیں گے۔

۱۔ چاہت میں شدت

اپنی چاہت کی تکمیل میں بالکل آزاد اور بے لگام ہونا انسانی خواہشات کی سب سے پہلی

اوراہم ترین خصوصیت ہے البتہ سیر ہونے یا نہ ہونے کے اعتبار سے اس کے مختلف درجات ہیں کیونکہ کچھ خواہشات تو ایسی ہوتی ہیں جن سے کبھی سیری نہیں ہو پاتی اور چاہے جتنا بھی اس کی تکمیل کی جائے اس کی طلب اور چاہت میں کمی نہیں آتی۔جبکہ کچھ خواہشات ایسی ہیں جو وقت کے ساتھ سرد تو پڑ جاتی ہیں مگر بہت دیر کے بعد۔مختصر یہ کہ ان تمام خواہشات کے درمیان اعتدال اور توازن کے بجائے شدت طلبی ایک مشترکہ صفت ہے۔

جیسا کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿لَوْ کَانَ لِابْنِ آدَمَ وادٍ من مال لابتغیٰ إلیه ثانیاً،ولو کان له وادیان لابتغیٰ لهماثالثاً،ولایملأ جوف ابن آدم إلاالتراب﴾(۱)

''اگر فرزند آدم کے پاس مال ودولت کی ایک وادی ہوتی تو وہ دوسری وادی کی تمنا کرتا اور اگر اس کے پاس ایسی ہی دو وادیاں ہوتیں تب بھی اس کو تیسری وادی کی تمنا رہتی اور اولاد آدم کا پیٹ مٹی کے علاوہ کسی اور چیز سے نہیں بھر سکتا ہے''

پیغمبر اکرم ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے:

﴿لو کان لابن آدم وادیان من ذهب لابتغیٰ وراء هما ثالثاً﴾(۲)

''اگر آدمی کو سونے کی دو وادیاں مل جائیں تو بھی اسے تیسری وادی کی تلاش رہے گی''

جناب حمزہ بن حمران کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں یہ شکایت کی کہ مجھے جس چیز کی خواہش ہوتی ہے وہ مجھے مل جاتی ہے تب بھی میرا دل اس پر قانع نہیں ہوتا ہے اور مزید کی خواہش باقی رہتی ہے،لہٰذا مجھے کوئی ایسی چیز تعلیم فرمایئے جس سے میرے اندر قناعت پیدا ہو جائے اور مزید کی خواہش نہ رہے تو امامؑ نے فرمایا:

---

(۱)الجامع الصغیر للسیوطی بشرح المناوی۔ج۲ص۲۲۰ط۱۳۷۳ھ۔

(۲)مجموعۂ ورام ص۱۶۳۔

''جو چیز تمہارے لئے کافی ہے اگر وہ تمھیں مستغنی بنادے تو دنیا میں جو کچھ موجود ہے اس کا معمولی سا حصہ بھی تمھیں مستغنی بنانے کے لئے کافی ہے اور جو چیز تمہارے لئے کافی ہے اگر وہ بھی تمہیں مستغنی نہ بناسکے تو پھر پوری دنیا پا کر بھی تم مستغنی نہیں ہو سکتے ہو'' (۱)

امیر المومنینؑ فرمایا کرتے تھے:

''اے فرزند آدم، اگر تجھے دنیا صرف اتنی مقدار میں درکار ہو جو تیری ضروریات کے لئے کافی ہو سکے تو اس کا معمولی سا حصہ بھی تیرے لئے کافی ہے اور اگر تجھے وہ چیز بھی درکار ہے جو تیرے لئے ضروری نہیں تو پوری دنیا بھی تیرے لئے ناکافی ہے'' (۲)

مذکورہ روایات میں خواہشات کی مزید طلب برقرار رہنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ کبھی ان کی تکمیل ممکن ہی نہیں ہے بلکہ ان کی شدت طلب کو بتانا مقصود ہے اور یہ کہ عموماً خواہشات حد اعتدال پر قائم نہیں رہتے۔ ورنہ بعض خواہشات ایسی ہوتی ہیں جو زندگی کے آخری مرحلہ میں بالکل کمزور پڑ جاتی ہیں حالانکہ کچھ ایسی خواہشات بھی ہیں جو انسان کے آخری سانس تک بالکل جوان رہتی ہیں اوران میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوتی ہے۔ (۳)

---

(۱) اصول کافی ج ۲ ص ۱۳۹۔

(۲) بحار الانوار ج ۷۳ ص ۱۷۰۔

(۳) انس نے رسولؐ سے (جامع صغیر سیوطی حرف (ی) ج ۲ ص ۳۷۱) پر روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا ہے ''فرزند آدم بالکل بوڑھا پھوس ہو جاتا ہے مگر اس کے ساتھ دو چیزیں باقی رہ جاتی ہیں لالچ اور آرزو۔''

میں خداوند عالم کے ایک ایسے بندۂ صالح کو پہچانتا ہوں جس نے توفیق الٰہی کے سہارے جوانی میں ہی اپنے نفس پر غلبہ حاصل کرلیا تھا۔ جب ان کی عمر ۹۰ سال کے قریب ہوئی تو ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی وہ فرمایا کرتے تھے کہ بنیادی طور پر صرف تین خواہشات ہیں: ۱۔ جنسیات ۲۔ مال ۳۔ عہدہ پہلی دو خواہشات کو تو میں نے اپنی جوانی میں ہی رام کر کے ان پر غلبہ حاصل کرلیا تھا لیکن تیسری خواہش اب بھی میرے دل میں مسلسل ابھرتی رہتی ہے اور مجھے اس کی بنا پر شرک میں پڑنے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔

۲۔ خواہشات میں تحرک کی قوّت

خواہشات، انسان کی حرکت وفعالیت کا سب سے اہم اور طاقتور ذریعہ ہیں اور ان کے اندر پائی جانے والی قوت متحرکہ کے بارے میں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ خواہشات نفس وہ تنہا سبب ہیں جو جاہلانہ تہذیب وتمدن کو پروان چڑھاتے رہے ہیں اور تاریخی نیز جغرافیائی لحاظ سے یہی جاہلانہ تمدن روئے زمین کے بیشتر حصوں پر حکم فرما رہا ہے۔ اس جاہلانہ تمدن میں فطرت، ضمیر اور عقل کی حکم فرمائی کا سرے سے انکار تو نہیں کیا جاسکتا ہے لیکن یہ طے شدہ ہے کہ اس تمدن کی پیشرفت میں خواہشات ہی سب سے بڑا عامل اور سبب ہیں چاہے وہ جنگ وصلح کے معاملات ہوں یا اقتصاد اور علوم وفنون کے میدان یا دیگر جرائم سب اسی کی کوکھ سے جنم لیتے رہے ہیں۔

انسانی تاریخ کے بیشتر ادوار میں جاہلیت کی حکمفرمائی دیکھنے کے بعد خواہشات میں پائی جانے والی قوت متحرکہ کی وسعت کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ روایت میں ہے کہ جناب زید بن صوحان نے امیر المومنین ؑ سے سوال کیا:

﴿اى سلطان اغلب و أقوىٰ﴾ ''کس بادشاہ کا کنٹرول اور غلبہ سب سے زیادہ ہوتا ہے

تو آپ نے فرمایا: ﴿الهوى﴾ ''خواہشات کا۔''(۱)

اسی طرح قرآن مجید نے عزیز مصر کی بیوی کا یہ اقراری جملہ نقل کیا ہے:

﴿إن النفس لأمارة بالسوء إلا ما رحم ربى﴾ (۲)

''نفس تو برائیوں کی طرف ہی اکساتا ہے مگر یہ کہ جس پر خدا رحم وکرم کردے (وہی اس سے

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۰ ص ۷۶ حدیث ۶۔

(۲) سورۂ یوسف آیت ۵۳۔ علمائے نحو کے بقول اس جملے میں نحوی اعتبار سے اتنی تاکیدیں پائی جاتی ہیں جو بہت کم جملوں میں ہوتی ہیں جیسے یہ جملہ اسمیہ ہے اور اسکی ابتداء میں انّ پھر امارہ صیغۂ مبالغہ اور اسکے شروع میں لام تاکید یہ سب کثرت تاکید کی علامتیں ہیں۔

محفوظ رہ سکتا ہے)'' یہ مختصر سا جملہ انسانی زندگی پر خواہشات کے مستحکم کنٹرول کی ایک مضبوط سند ہے۔

اور امیر المومنینؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

﴿الخطایا"الشهوات"خیل شُمُسٌ حُمِل علیها أهلها،و خُلِعَت لُجُمها،فتقحمت بهم فی النار،ألاوان التقویٰ مطایا ذُلُلٌ،حُمِل علیها أهلها،و أُعطوا أزِمّتها،فأوردتهم الجنة﴾(۱)

''خطائیں اور''خواہشات'' وہ سرکش گھوڑے ہیں جن پر کسی کو سوار کر کے انکی لگام اتار دی جائے اور وہ اپنے سوار کو لیکر جہنم میں پھاند پڑیں لیکن تقویٰ وہ رام کی ہوئی سواریاں ہیں جن پر صاحبان تقویٰ کو سوار کر کے ان کی لگام انکے ہاتھ میں دیدی جائے اور وہ ان کو جنت میں پہونچا دیں''

شمس دراصل شموس کی جمع ہے اور شموس اس سرکش اور اڑیل گھوڑے کو کہتے ہیں جو کسی کو اپنے اوپر سوار نہیں ہونے دیتا اور نہ ہی سوار کا تابع رہتا ہے۔گویا سوار اسے لگام لگائے بغیر اس پر سوار ہو گیا تو وہ اسکے قابو میں نہیں رہتا اور وہ سوار کو لے اڑتا ہے اور سوار بھی اسے اپنے کنٹرول میں نہیں رکھ پاتا۔یہی حال خواہشات کا بھی ہوتا ہے جو اپنے اسیر انسان کو ہر طرف لئے پھرتی ہیں اور وہ ان خواہشات کو صحیح جہت نہیں دے پاتا اور ان پر اپنا قابو اسی طرح کھو بیٹھتا ہے جس طرح ایک سرکش گھوڑا بے قابو رہتا ہے۔

اسکے برخلاف تقویٰ انسان کو اسکے خواہشات نفس اور ہویٰ وہوس پر قابو رکھنے کی قوت عطا کرتا ہے اور نفس کو اسکا مطیع اور فرمانبردار بنا دیتا ہے جسکے بعد انسان جدھر چاہے انکا رخ موڑ سکتا ہے اور انہیں خواہشات کے ذریعہ وہ جنت میں پہنچ سکتا ہے۔

۳۔خواہشات اور لالچ کی بیماری

طمع اور لالچ خواہشات کی تیسری خصوصیت ہے جس کی بنا پر خواہشات کی طلب میں

---

(۱)نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۔

اور اضافہ ہو جاتا ہے اور اسکی خواہش بڑھتی رہتی ہے۔ جبکہ دیگر مطالبات میں معاملہ اسکے بالکل برعکس ہوتا ہے کیونکہ جب انسان کسی اور مطالبہ کو پورا کرتا ہے تو اسکی گذشتہ شدت اور کیفیت وکمیت باقی نہیں رہتی بلکہ شدت میں کمی آتی ہے اور سیرابی کا احساس ہوتا ہے۔

لیکن خواہشات(۱) کا معاملہ یہ ہے کہ اگر ان کے مطابق عمل کرتے رہیں تو ان کی طلب میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، ان کی چاہت کا لاوا مزید ابلنے لگتا ہے۔ جسکے بعد دھیرے دھیرے ان پر انسان کا کنٹرول نہیں رہ جاتا لیکن اگر معقول ضابطہ کے تحت، اعتدال کے دائرہ میں رہ کر ان خواہشات کو پورا کیا جائے تو پھر ان کے مطالبات خود بخود سرد پڑ جاتے ہیں اور انسان بخوبی انکے اوپر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔

مختصر یہ کہ بالکل آگ کی طرح ہوتی ہیں کہ اس میں جتنی زیادہ پھونک ماری جاتی ہے اسکے شعلے مزید بھڑکنے لگتے ہیں اسکی لپٹیں اور بلند ہو جاتی ہیں۔ لہذا شرعی حدود میں رہ کر مناسب اور معقول انداز میں ان خواہشات کو پورا کرنا ان کو آزاد اور بے لگام چھوڑ دینے سے بہتر ہے کیونکہ اگر بلا قید وشرط ان کی پیروی کی جائے تو ہر قدم پر تشنگی کا احساس ہوتا رہے گا اور خواہشات پر انسان کا اختیار بالکل ختم ہو جائے گا۔

ان دونوں ہی باتوں کی طرف روایات میں اشارہ موجود ہے۔

۱۔ خواہشات کی بلا قید وشرط تکمیل سے ان کی شدت میں اور اضافہ ہوتا ہے اور ان کے مطالبات بڑھتے ہی رہتے ہیں اور اسکے برعکس اگر صرف شرعی حدود کے دائرہ میں ان کی تکمیل ہو تو سیرابی حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ مولائے کائنات نے فرمایا ہے:

﴿رد الشهوة أقضى لها، وقضاؤها أشدّ لها﴾(۲)

---

(۱) خواہشات سے ہماری مراد تمام چاہتیں نہیں ہیں۔ کیونکہ بعض چاہتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں یہ قاعدہ درست نہیں ہے۔

(۲) غرر الحکم ج۱ ص۳۸۰۔

''شہوت اور خواہش کو ٹھکرا دینا ہی اسکے ساتھ بہترین انصاف ہے اور اسکو پورا کرنا اسے مزید بڑھاوا دینا ہے۔''

یہاں خواہش کو ٹھکرا دینے سے مراد محدود اور معقول پیمانہ پر ان کی تکمیل ہے۔اور تکمیل سے مراد انہیں بے لگام چھوڑ دینا اور ان کی تکمیل میں کسی قاعدہ وقانون کا لحاظ نہ رکھنا ہے۔

۲۔خواہشات کی بے جا تکمیل اور اس راہ میں افراط کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان خواہشات کے سامنے انسان اتنا بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنی خواہشات پر اس کا کوئی اختیار نہیں رہ جاتا اور وہ ان کا غلام اور نوکر بن کر رہ جاتا ہے لیکن اس کے برخلاف اگر انسان واقعاً کسی اصول وضابطہ کے مطابق محدود پیمانہ پر ان کی تکمیل کرے تو پھر اپنی خواہشات پر اسکا مکمل اختیار رہتا ہے اور وہ انہیں جدھر چاہے موڑ سکتا ہے۔

امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے:

﴿مثل الحریص علی الدنیا کمثل دود القز، کلما ازدادت من القز علی نفسها لفّاً کان أبعد لها من الخروج حتیٰ تموت﴾(۱)

دنیا کے لالچی انسان کی مثال ریشم کے اس کیڑے جیسی ہے کہ جو اپنے اوپر جتنا ریشم لپیٹا جاتا ہے اسکے نکلنے کا راستہ اتنا ہی تنگ ہوتا جاتا ہے اور آخر کار وہ موت کے منھ میں چلا جاتا ہے۔

خواہشات پر عقل کی حکومت

اگر چہ انسان پر خواہشات کی حکومت بہت ہی مستحکم ہوتی ہے لیکن عقل کے اندر ان خواہشات کو کنٹرول کرنے اور انہیں صحیح رخ پر لانے کی مکمل صلاحیت اور قدرت پائی جاتی ہے۔بشرطیکہ انسان خواہشات پر عقل کو فوقیت دے اور اپنے معاملات زندگی کی باگ ڈور عقل کے حوالہ کردے۔

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۳ ص ۲۳۔

صرف یہی نہیں بلکہ جس وقت خواہشات پر عقل کی گرفت کمزور پڑ جاتی ہے اور خواہشات اسکے دائرہ اختیار سے باہر نکل جاتے ہیں تب بھی عقل کی حیثیت حاکم وسلطان کی سی ہوتی ہے وہ حکم دیتی ہے، انسان کو برے کاموں سے روکتی ہے، اور خواہشات، نفس کے اندر صرف وسوسہ پیدا کرتے ہیں

حضرت علیؑ نے فرمایا ہے:

﴿للنفوس خواطر للهوىٰ، والعقول تزجر وتنهيٰ﴾(۱)

''نفسوں کے اندر مختلف خواہشیں سرابھارتی ہیں اور عقلیں ان سے مانع ہوتی ہیں اور انہیں روکتی رہتی ہیں''

آپؑ ہی سے منقول ہے:

﴿للقلوب خواطر سوء، والعقل يزجر منها﴾(۲)

''دلوں میں برے خیالات آتے ہیں اور عقل ان سے روکتی رہتی ہے''

اس کا مطلب یہ ہے کہ خواہشات کی بناء پر انسان کے نفس میں صرف برے خیالات، اوہام اور وسوسے جنم لیتے ہیں لیکن عقل کے پاس انہیں کنٹرول کرنے نیز ان سے روکنے کا اختیار موجود ہے اور اس کی حیثیت حاکم وسلطان کی سی ہے۔ اسی لئے مولائے کائناتؑ نے فرمایا ہے:

﴿العقل الكامل قاهر للطبع السُّوء﴾(۳)

''عقل کامل، بری طبیعتوں پر غالب ہی رہتی ہے''

جسکا مطلب یہ ہوا کہ انسانی مزاج اور اسکا اخلاق، بے جا خواہشات کی بناء پر بگڑ کر چاہے جتنی پستی میں چلا جائے تب بھی عقل کی حکومت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے اور عقل سلیم وکامل اپنے اندر

---

(۱) تحف العقول ص ۹۶۔

(۲) غرر الحکم ج ۲ ص ۱۲۱۔

(۳) بحار الانوار ج ۷۱ ص ۱۱۶۔

ہر قسم کی بری طبیعت اور مزاج کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ اسلامی تربیت کا ایک اہم اصول ہے جسکے بارے میں ہم آئندہ تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

انسان، عقل اور خواہش کا مجموعہ

یہاں تک ہم اس واضح نتیجہ تک پہونچ چکے ہیں کہ خواہشیں کتنی ہی قوی اور موثر کیوں نہ ہوں لیکن وہ انسان سے اسکا ارادہ اور قوت ارادی کو نہیں چھین سکتی ہیں۔ بشرطیکہ انسان عقل کو کامل بنالے اور معاملات زندگی میں عقل کو اہمیت دیتا رہے کیونکہ انسان، عقل اور خواہشات سے مل کر بنا ہے لہٰذا عقل اور خواہشات کے باعث انسان ہمیشہ ترقی و تنزلی کی منزلیں طے کرتا رہتا ہے انسان اپنے معاملات حیات میں جس حد تک عقل کی حاکمیت کا قائل ہوگا اور اپنی عقل کے تکامل کی کوشش کرے گا اسی حد تک ترقی اور کمال کی جانب قدم بڑھائے گا اسکے برخلاف عقل کو بالکل نظرانداز کرکے اور اس سے غافل ہوکر اگر خواہشات کو عقل پر ترجیح دے گا تو اسی کے مطابق پستیوں میں چلا جائے گا۔

لیکن حیوانات کی زندگی کا معاملہ انسان کے بالکل برخلاف ہے کیونکہ ان کے یہاں کہیں سے کہیں تک عقل کا گذر نہیں ہے اور وہاں سو فیصد خواہشات کی حکومت ہوتی ہے گویا وہ صرف ایک سبب کے تابع ہوتے ہیں اور ان کی زندگی صرف اسی ایک سبب کے تحت گذرتی ہے۔ مولائے کائناتؑ کا ارشاد ہے:

﴿إن الله ركّب في الملائكة عقلاً بلا شهوة، وركّب في البهائم شهوة بلا عقل، وركّب في بني آدم كليهما. فمن غلب عقله شهوته فهو خير من الملائكة، ومن غلبت شهوته عقله، فهو شر من البهائم﴾(۱)

''خداوند عالم نے ملائکہ کو صرف عقل دی ہے مگر خواہشات نہیں دیں اور حیوانات

---

(۱) وسائل الشیعہ، کتاب الجہاد: جہاد النفس باب ۹ ح ۲۔

کو خواہشات دی ہیں مگر عقل سے نہیں نوازا، مگر اولاد آدم میں یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ رکھی ہیں لہٰذا جسکی عقل اس کی خواہشوں پر غالب آجائے وہ ملائکہ سے بہتر ہے اور جس کی خواہشیں اسکی عقل پر غلبہ حاصل کرلیں وہ حیوانات سے بدتر ہے"

خواہشات کی شدت اور کمزوری

اسلامی تہذیب کا ایک اہم مسئلہ خواہشات کی شدت اور کمزوری کا بھی ہے۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ کوئی خواہش نہایت مختصر اور کم ہو اور ممکن ہے کہ بعض خواہشات بھڑک کر شدت اختیار کرلیں۔ چنانچہ اگر یہ مختصر ہوگی تو اس پر عقل حاکم ہوگی اور آدمی، انسان کامل بن جائے گا اور اگر یہی خواہشات شدت اختیار کرلیں تو پھر ان کا تسلط قائم ہوجاتا ہے اور انسان، حیوانیت کی اس پستی میں پہنچ جاتا ہے جہاں صرف اور صرف خواہشات کا راج ہوتا ہے اور عقل وشعور نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہ جاتی ہے۔

انسان چاہے اس حالت کے ماتحت ہو یا اس حالت کے ماتحت ہو ہر صورت میں خواہشات کی کمی یا زیادتی کا دارومدار خود انسان کے اوپر ہی ہوتا ہے کہ جب وہ خواہشات کا تابع ہوتا ہے اور ان کے تمام مطالبات کو پورا کرتا ہے تو خواہشات اور بھڑک اٹھتی ہیں اور انسان کو مکمل طور پر اپنا اسیر بنالیتی ہیں اور انسانی زندگی میں ایک مضبوط قوت کے روپ میں ابھرتی ہیں اور انسان کی زندگی میں ان کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔

اور اسی کے برعکس جب انسان اپنی خواہشات پر پابندی لگاتا رہے اور ان کو ہمیشہ حد اعتدال میں رکھے اور خواہشات پر انسان کا غلبہ ہو اور وہ عقل کے ماتحت ہوں تو پھر اسکی خواہشات ضعیف ہوجاتی ہیں اور انکا زور گھٹ جاتا ہے۔

ایک متقی کے اندر بھی وہی خواہشات ہوتے ہیں جو دوسروں کے اندر پائے جاتے ہیں لیکن ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ متقی افراد خواہشات کو اپنی عقل وفہم کے ذریعہ اپنے قابو میں رکھتے

ہیں جبکہ بے عمل افراد پر ان کے خواہشات حاکم ہوتے ہیں اور خواہشات ان کو قابو میں کر لیتے ہیں۔ اس دوراہے پر انسان کو کوئی ایک راستہ منتخب کرنا ہے وہ جسے چاہے اختیار کرے۔ خواہشات کو کچل کر ان کا مالک و مختار بن جائے یا انکی پیروی کر کے ان کا غلام ہو جائے۔

آئندہ صفحات میں ہم خواہشات پر غلبہ حاصل کرنے کے کچھ طریقے ذکر کریں گے لیکن فی الحال آیات و روایات کی روشنی میں ان باتوں کا تذکرہ کر رہے ہیں جن سے خواہشات کی کمزوری یا شدت اور ان صفات کے اسباب کا علم حاصل ہوتا ہے۔

سب سے پہلے قرآن کریم کی آیات ملاحظہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿ولکن الله حبّب إلیکم الایمان وزیّنه فی قلوبکم و کرّه إلیکم الکفر و الفسوق و العصیان﴾(۱)

"لیکن خدا نے تمہارے لئے ایمان کو محبوب بنا دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں آراستہ کر دیا ہے اور کفر، فسق اور معصیت کو تمہارے لئے ناپسندیدہ قرار دیدیا ہے"

فسوق (برائی) کی یہ نفرت خداوند عالم نے مومنین کے دلوں میں پیدا کی اور اہل تقویٰ اس سے ہمیشہ متنفر رہتے ہیں مگر فاسقین اس پر لڑنے مرنے کو تیار رہتے ہیں اسکے واسطے جان توڑ کوشش کرتے ہیں اور اس کی راہ میں بیش قیمت اشیاء کو قربان کر دیتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس ذات نے اس برائی کو مومنین کی نظروں میں قابل نفرت بنا دیا؟ کون ہے جس نے فاسقوں کی نگاہ میں اسے محبوب بنا دیا؟ یقیناً خداوند عالم ہی نے مومنین کو اس سے متنفر کیا ہے۔ کیونکہ مومن کا دل خدا کے قبضۂ قدرت میں رہتا ہے لیکن برائیوں کو فاسقوں کیلئے پسندیدہ بنانے والی چیز خود ان برائیوں اور خواہشات کی تکمیل نیز ان کو ہر قیمت پر انجام دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے جسکی بنا پر وہ ان کی

---

(۱) سورۂ حجرات آیت ۷۔

من پسند چیز بن جاتی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے:

﴿المداومة علیٰ الخیر کراهیة الشر﴾(۱)

''کارخیر کی پابندی برائیوں سے بیزار ومتنفر کرتی ہے''

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ اگر مسلسل کارخیر کی پابندی کی جاتی رہے تو خود بخود شر اور برائی سے نفرت پیدا ہوجاتی ہے شر سے مراد انسان کی وہ خواہشات اور لذتیں ہیں جن کے پیچھے لوگ دوڑتے رہتے ہیں۔یعنی فاسق اور گمراہ لوگ انھیں حرام خواہشات ولذائذ کے متلاشی رہتے ہیں۔

اس کے برعکس ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح کارخیر کی پابندی کے باعث برائی سے نفرت ہوجاتی ہے اسی طرح یہ بھی ایک فطری بات ہے کہ''برائیوں کی پابندی سے برائیوں کی محبت پیدا ہوجاتی ہے''

خطبہ متقین جو خطبہ ہمام کے نام سے مشہور ہے اس میں امیر المومنین کا یہ ارشاد ہے:

﴿تراه قریباً أمله،قلیلاً زَلَلُه،خاشعاً قلبه،قانعة نفسه،منزوراً أکله،سهلاً أمره، حریزاً دینه،میتة شهوته،مکظوماً غیظه﴾(۲) ''متقین کی پہچان یہ ہے کہ ان کی آرزوئیں بہت مختصر،لغزشیں کم،دل خاشع،نفس قانع، غذا معمولی،معاملات آسان،دین محفوظ ،خواہشات مردہ اور غیظ وغضب اور غصہ ٹھنڈا رہتا ہے''

بیشک تقویٰ شہوات اور خواہشات کو مختصر اور سادہ بنا دیتا ہے جسکے نتیجہ میں حریص اور لالچی نفوس بھی متقی اور قانع ہوجاتے ہیں اور انکی خواہشات گھٹ کر گویا مردہ ہوجاتی ہیں۔

البتہ اس طرح کی روایات نقل کرنے سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ تقویٰ،خواہشات کو لگام

---

(۱)بحار الانوار ج۱ص ۱۱۷۔

(۲)نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۵(ہمام)

لگا کر ایک دم روک دیتا ہے (اگر چہ یہ بات اپنی جگہ پر کسی حد تک درست ہے)۔ بلکہ نفس کے اوپر تقویٰ کا دوسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ خواہشات کو بہت ہی ہلکا اور سادہ بنا دیتا ہے اور اسی مقصد کے تحت ہم نے مذکورہ روایات بیان کی ہیں اب حضرت علیؑ سے مروی مندرجہ ذیل روایات ملاحظہ فرمائیں جنہیں ہم بغیر کسی تبصرہ کے پیش کر رہے ہیں:

﴿کلما قویت الحکمة،ضعفت الشهوة﴾(۱)

''جس قدر حکمت قوی ہوگی خواہش اتنی ہی کمزور ہو جائے گی''

﴿اذا کثرت المقدرة قلت الشهوة﴾(۲)

''جب قدرت زیادہ ہوگی تو شہوت کم ہو جائے گی''

﴿العفة تضعف الشهوة﴾(۳)

''عفت اور پاکدامنی شہوت کو کمزور بنا دیتی ہے''

﴿من اشتاق الیٰ الجنة سلا من الشهوات﴾(۴)

''جو جنت کا مشتاق ہو وہ خواہشات سے بری ہو گیا''

﴿واذکر مع کل لذة زوالها،ومع کل نعمة انتقالها،ومع کل بلیة کشفها فإن ذلك أبقیٰ للنعمة،وأنفیٰ للشهوة،وأذهب للبطر،وأقرب للفرج، وأجدر بکشف الغمةودرك المأمول﴾(۵)

---

(۱) غرر الحکم ج۲ ص۱۱۱۔

(۲) بحار الانوار ج۷۲ ص۶۸ و نہج البلاغہ حکمت ۲۴۴۔

(۳) غرر الحکم ج۱ ص۱۱۸۔

(۴) نہج البلاغہ حکمت ۳۱۔

(۵) غرر الحکم۔

"ہرلذت کے ساتھ اسکے زوال پر، ہر نعمت کے ساتھ اسکے منتقل ہونے اور ہر بلا کے ساتھ اسکے رفع ہونے پر بھی نظر رکھو کیونکہ یہ نعمت کو تا دیر باقی رہنے، شہوت کو صاف و پاکیزہ بنانے، نعمت پر اترانے اور اسکی ناشکری کو ختم کرنے، آسانی اور کشادگی کو قریب کرنے، مشکلات اور پیچیدگیوں کو دور کرنے نیز آرزووں کی تکمیل کے لئے سب سے زیادہ مناسب ہے۔"

تقویٰ اور ضبط نفس کا تسلط انسانی خواہشات اور آرزووں پر اس حد تک ہوتا ہے کہ وہ انسانی خواہشات کو حدود الٰہیہ کے سانچہ میں ڈھال دیتے ہیں جسکے بعد انسان صرف وہی چاہتا اور پسند کرتا ہے جو خداوند عالم پسند کرتا ہے اور صرف اسی سے نفرت اور کراہت محسوس کرتا ہے جس سے خداوند عالم نفرت کرتا ہے اور یہ انسانی نفس اور حدود الٰہیہ کے آپسی رابطہ کی آخری حد ہے اسی عجیب و غریب انقلاب کی طرف اس آیۂ کریمہ نے اشارہ کیا ہے:

﴿و کرّہ إلیکم الکفر و الفسوق و العصیان﴾(۱)

"اور کفر، فسق اور معصیت کو تمہارے لئے ناپسندیدہ قرار دیدیا ہے"

اس مرحلہ میں تقویٰ کا انسان پر صرف یہی اثر نہیں ہوتا ہے کہ وہ کفر، فسق و فجور اور گناہ سے دور رہتا ہے بلکہ تقویٰ انسان کو ان باتوں سے متنفر بھی کر دیتا ہے۔

انسانی زندگی میں خواہشات کا مثبت کردار

انسانی زندگی میں انکی خواہشوں کی تباہ کاریوں کو دیکھنے کے بعد ہر انسان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ ان کی اتنی تباہ کاریوں کے باوجود بھی خداوند عالم نے انسان کے اندر ان خواہشات کو کیوں پیدا کیا ہے؟ اوران کا کیا فائدہ ہے ان میں ایسا کونسا مثبت پہلو پایا جاتا ہے جسکی بنا پر انہیں خلق کیا گیا ہے؟ اگر چہ آئندہ ہم خواہشات کی تباہ کاریوں اور اسکے منفی اثرات کا جائزہ لیں گے

---

(۱) سورۂ حجرات آیت ۷۔

لیکن فی الحال اسکے مثبت اثرات اور فوائد کا تذکرہ کررہے ہیں۔

ا۔ انسانی زندگی کا سب سے طاقتور محرک

انسانی خواہشات اس کی زندگی میں سب سے بڑا محرک ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حیات انسانی کے اہم ترین پہلوؤں کو انہیں خواہشات سے جوڑ دیا ہے اور یہی خواہشات اسکی بنیادی ضرورتوں کی فراہمی کی ضامن ہیں۔

جیسے تولید نسل، انسانی زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے جس کے بغیر انسان صفحۂ ہستی سے نابود ہوکر رہ جائے گا۔ لہٰذا افزائش نسل اور اسکی بقا کے لئے کوئی ایسا ذریعہ یا جذبہ درکار تھا جسکی بنا پر نسل انسانی باقی رہے۔ چنانچہ اس اہم مسئلہ کو خداوند عالم نے جنسی خواہشات سے جوڑ کر بقائے انسانیت کا سامان فراہم کردیا۔

اسی طرح جسمانی نشوونما کو کھانے پینے سے جوڑ دیا اگر آب ودانہ کی یہ خواہش نہ ہوتو انسانی جسم نمو نہیں پاسکتا اور مسلسل جدوجہد کی وجہ سے اسکے بدن میں جو کمزوری پیدا ہوجاتی ہے اس کی کمی پوری نہیں ہوسکتی تھی اور اسکے بدن میں جو خلیے مردہ ہوجاتے ہیں ان کی جگہ زندہ خلیے حاصل نہ ہوپاتے۔

اسی طرح خداوند عالم نے اجتماعی زندگی کے لئے نفس میں سماج کی جانب رغبت اور رجحان کا جذبہ رکھا ہے اگر یہ جذبہ نہ ہوتا تو سماجی زندگی انتشار کا شکار ہوجاتی اور انسانی تہذیب وتمدن تارتار ہوجاتا۔

انسانی زندگی کے اقتصادی اور معاشی حصہ میں ملکیت اور مالکیت کا جذبہ کارفرما رکھا ہے۔ اگر یہ جذبہ نہ ہوتا تو پھر اقتصادی نظام بالکل برباد ہوجاتا۔

جان، مال، ناموس اور عزت وآبرو کے تحفظ کیلئے قوت غضب رکھی گئی ہے اگر انسان کے اندر یہ قوت نہ رہے تو پھر ہر سمت دشمنی کا رواج ہوگا اور کہیں بھی امن وامان کا نام ونشان باقی نہ رہے گا

اسی طرح انسان کے وہ دوسرے تمام ضروریات جن کے بغیر اسکے لئے روئے زمین پر زندگی گذارنا ممکن نہیں ہے ان کے لئے بھی خداوند عالم نے کوئی نہ کوئی جذبہ اور خواہش ضرور رکھی ہے اور اسی خواہش کے ذریعہ ان ضروریات کی فراہمی کا انتظام کیا ہے۔

۲۔خواہشات ترقی کا زینہ

خواہشات انسانی زندگی میں ترقی کا زینہ ہیں اسی کے ساتھ یہ وہ پھسلن بھرا راستہ بھی ہے جس پر چل کرانسان پستیوں میں بھی پہنچ سکتا ہے۔اوراسی زینہ کے ذریعہ خدا تک بھی پہونچ سکتا ہے یہی زینہ انسان کی ترقی اور تکامل میں نہایت اہم کردارادا کرتا ہے۔جسکی تفصیل کچھ یوں ہے۔

قرب خدا کی جانب انسان کا سفراور اسی طرح انسان کی نشو ونما کا دارو مداراس کے ''ارادہ'' پر ہے جبکہ جمادات،حیوانات اورنباتات کی نشو ونمااوران کا تکاملی سفرایک فطری اورقہری انداز میں انجام پاتا ہے۔اوراس میں ان کے کسی ارادہ کا دخل نہیں ہوتا ہےلیکن انسان کوخداوند عالم نے''ارادہ'' کے ذریعہ یہ خاص شرف بخشا ہے کہ اس کی ہر حرکت،ہر کام اسکے اپنے ارادہ واختیار کے تحت انجام پاتا ہے۔انسان اور کائنات کی دوسری تمام اشیاء مشیت وارادۂ الٰہی کے تابع ہیں اس اعتبار سے ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے فرق صرف اتنا سا ہے کہ انسان اپنے ارادہ واختیار کے ساتھ مشیت الٰہی کا تابع ہوتا ہےاور بقیہ کائنات فطری اورقہری طور پر یعنی اپنے ارادہ واختیار کے بغیر مشیت الٰہی کے مطابق چلتی رہتی ہے۔

احکام الٰہی دراصل خدا کی مشیت اوراس کے ارادہ کا مظہر ہیں جن پر بندہ اپنے اختیار سے چلتا ہےاسی طرح سنن الٰہی بھی مشیت وارادہ الٰہی کا مظہر ہیں جن پر جمادات نباتات اورحیوانات اپنے ارادہ واختیار کے بغیر رواں دواں ہیں۔

اسی لئے انسان کوقرآن مجید میں:﴿خلیفة الله﴾ قرار دیا گیا ہے(۱)اوراسکے علاوہ پوری کائنات کو﴿مسخرات بأمره﴾''اسکے حکم کی تابع'' کہا گیا ہے۔(۲)

---

(۱)سورۂ بقرہ آیت ۳۰۔

(۲)سورۂ اعراف آیت ۵۴ وسورۂ نحل آیت ۱۲ و۷۹۔

خلافت اور تسخیر کے درمیان ایک چیز مشترک ہے اور ایک لحاظ سے ان کے درمیان اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ان کا مشترک پہلو یہ ہے کہ دونوں ہی مشیت وارادۂ الٰہی کے تابع اور مطیع ہیں البتہ اس لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں کہ خلیفہ خدا (انسان) اپنے ارادہ واختیار سے حکم الٰہی کی پابندی کرتا ہے اور ﴿والمسخرات بامرہ﴾ تقریباً مشینی انداز میں اپنے کسی ارادہ واختیار کے بغیر حکم خدا پر چلتے رہتے ہیں۔

اور یہی نکتہ انسان کی عظمت وبلندی کا راز ہے کیونکہ اگر وہ بھی اپنے قصد وارادہ سے خداوند عالم کی اطاعت نہ کرتا اور مجبور ہوتا تو پھر اسکے اور بقیہ پوری کائنات کے عمل میں کوئی فرق نہ ہوتا اور اس کے عمل کو کسی قسم کا امتیاز یا برتری حاصل نہ ہوتی۔

اسی ارادی اور اختیاری اطاعت نے دیگر مخلوقات کے مقابل انسان کو خلافت الٰہیہ کا اہل بنایا ہے اور اسی بناء پر اسکے ہر عمل کی قدر وقیمت بھی اسکی محنت ومشقت کے متناسب ہوتی ہے۔

چونکہ ارادی عمل میں جسمانی زحمت کے ساتھ نفسیاتی اور روحانی زحمت ومشقت بھی برداشت کرنا پڑتی ہے لہٰذا خدا کے نزدیک اس عمل کی قدر وقیمت زیادہ ہونی ہی چاہئے۔ارادی عمل سے پیدا ہونے والی حرکت میں سرعت واستحکام بھی زیادہ ہونا چاہئے لہٰذا یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ ایک انسان تو کسی عمل کیلئے باقاعدہ زحمتیں اٹھائے اور دوسرا شخص بغیر کسی مشقت کے کوئی عمل انجام دے اور قدر وقیمت کے اعتبار سے دونوں برابر قرار دیدئے جائیں۔

جیسے ''کھانے پینے'' اور ''روزہ رکھنے'' کے درمیان زمین آسمان کا فرق پایا جاتا ہے جبکہ چاہے کھانا پینا ہو اور یا روزہ ہو یہ سب اعمال قصد وارادہ اور حکم الٰہی کی اطاعت کے جذبہ سے انجام پاتے ہیں لیکن کھانے پینے میں چونکہ انسان کے ارادہ پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا اور اس میں اسے کسی قسم کی زحمت ومشقت نہیں ہوتی ہے اور چونکہ ہر عمل کی قیمت کا اندازہ اس عمل کی راہ میں ہونے والی اس محنت ومشقت کو دیکھکر لگایا جاتا ہے جو اس عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کیلئے درکار ہوتی ہے اور

کیونکہ کھانے پینے میں ایسی کوئی خاص زحمت نہیں ہے لہٰذا روزہ کے برخلاف اس عمل کی کوئی خاص اہمیت بھی نہیں ہے۔

جس عمل میں زحمت ومشقت کی مقدار جتنی زیادہ ہوگی اس عمل کی قدر وقیمت بھی اسی اعتبار سے بڑھتی رہے گی۔اور ایسا عمل انسانی ترقی اور قرب الٰہی کے سفر میں زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ لہٰذا اصل حیثیت عمل پر صرف ہونے والی محنت ومشقت کی ہے اور اگر یہ محنت ومشقت نہ ہو تو پھر عمل بالکل بے قیمت ہوکر رہ جاتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ زحمت ومشقت کیا ہے؟ یہ کیسے حاصل ہوتی ہے؟ اور اسکے درجات مختلف کیوں ہوتے ہیں؟

اس زحمت ومشقت کو دینی اصطلاح میں ''ابتلا'' یعنی امتحان اور آزمائش کہا جاتا ہے اور یہ زحمت ومشقت خواہشات اور آرزوؤں کے وقت ظاہر ہوتی ہے کیونکہ اگر ہمارے وجود میں خداوند عالم کی ودیعت کردہ یہ خواہشات نہ ہوتیں یا اسی طرح ان خواہشات کی مخالفت کے بغیر اطاعت ممکن ہوتی تو پھر ہمارے کسی عمل کی کوئی قیمت باقی نہ رہ جاتی اور کوئی عمل بھی قرب الٰہی کا ذریعہ نہیں بن سکتا تھا۔

اس ابتلاء اور مشقت کے درجات میں تفاوت دراصل خواہشات اور آرزوؤں کی شدت وضعف یا کمی وزیادتی کا نتیجہ ہوتا ہے۔کیونکہ خواہشات جتنی زیادہ طاقتور ہونگی ان پر قابو پانے کیلئے انسان کو اتنی ہی مشقت اٹھانا پڑے گی(۱) اور عمل کو انجام دینے کیلئے خواہشات نفس کی جتنی زیادہ مخالفت درکار ہوتی ہے وہ عمل قرب خدا کیلئے اتنا ہی بیش قیمت ہوتا ہے اور اسی کے مطابق خداوند عالم اسے جنت میں ثواب عنایت فرماتا ہے۔

---

(۱) خواہشات کے بارے میں اسلام کا نظریہ اعتدال واضح ہے اور اسے تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔مختصر یہ کہ:

اسلام نہ تو مکمل طور پر خواہشات کا گلا گھونٹنے کی اجازت دیتا ہے اور نہ وہ انھیں مطلق العنان چھوڑنے کا قائل ہے بلکہ اسلام کا ہر انسان سے صرف اتنا مطالبہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات کو شرعی احکام کے دائرہ میں پورا کرتا رہے۔

اس وضاحت کے بعد بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اپنے پروردگار کی جانب انسان کے ارتقائی سفر میں خواہشات کی کیا قدر و قیمت ہے کیونکہ قرب الٰہی کے ہر راہرو کو خواہشات اور آرزوؤں کے اس دلدل سے گذرنا پڑے گا جسے خداوند عالم نے ہر انسان کے وجود کا حصہ قرار دیا ہے۔

اس وضاحت سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ جسطرح خواہشات پستی اور ہلاکت کا باعث ہیں اسی طرح خداوند عالم تک پہونچنے کا زینہ بھی ہیں یہ نظریہ اسلامی فکر کی امتیازی جدت کا ایک نمونہ ہے۔

جس کی طرف متعدد روایات میں اشارہ پایا جاتا ہے مگر ہم اس مقام پر بطور نمونہ صرف دو روایات ذکر کر رہے ہیں:

۱۔﴿عن أبی البجیر، وکان من أصحاب النبی(ص) قال: اصاب النبی (ص) یوماً جوع شدید، فوضع حجراً علیٰ بطنه ثم قال: "ألاربَّ طاعمة، ناعمة، فی الدنیا جائعة، عاریة یوم القیامة، ألاربَّ مکرم لنفسه، وهو لها مهین، ألاربَّ مهین لنفسه، وهو لها مکرم، ألا یارب متخوض، متنعم، فیما أفاء الله علیٰ رسوله، ماله عندالله من خلاق، ألاوان "عمل الجنة" حَزْنة بربوة، ألاوان" عمل النار "سهلة بشهوة، ألا یارب شهوة ساعةٍأورثت حزناً طویلا﴾(۱)

"پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابی ابی بجیر کا بیان ہے کہ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بے حد بھوک لگی تھی تو آپ نے اپنے شکم مبارک پر پتھر رکھ لیا اور فرمایا:

نعمتوں کے خواہشمند کتنے ایسے افراد ہیں جنھیں دنیا میں نعمتیں مل جاتی ہیں لیکن وہ قیامت کے دن بھوکے اور برہنہ ہونگے یاد رکھو! بظاہر اپنے نفس کی عزت کرنے والے نہ جانے کتنے لوگ خود نفس کی توہین کرتے ہیں۔ اور نفس کو رسوا کرنے والے کتنے افراد ہیں جو در اصل نفس کی عزت

---

(۱) ذم الہویٰ لابن الجوزی ص ۳۸۔

افزائی کرتے ہیں۔یادرکھو! کتنے لوگ ان نعمتوں سے سرشار ہیں جو خداوندعالم نے اپنے رسول کو عنایت فرمائی ہیں مگر خدا کے نزدیک ان کا کوئی مرتبہ نہیں ہے یادرکھو! کہ جنت والا عمل "حزنة بربوة" (ناہموار پہاڑی پر چڑھنے کے مثل) ہے اور جہنمی اعمال خواہشات کے عین مطابق اور آسان ہیں یادرکھو! بسااوقات ایک ساعت کی شہوت، طویل حزن وملال کا سبب ہوتی ہے۔"

اس روایت میں متعدد قابل توجہ فکرانگیز نکات پائے جاتے ہیں جن سے بیحد مفید نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں جیسے کتنے نفس ایسے ہیں کہ جب انہیں کسی چیز کی خواہش ہوتی ہے تو انہیں وہ نعمت مل جاتی ہے مگر وہ اپنی خواہشات کی بناء پر حرام وحلال کی کوئی فکر نہیں کرتے ۔۔۔ایسے لوگ روز قیامت بھوکے اور برہنہ لائے جائیں گے۔

اوراسی طرح بعض اپنی خواہشات اور آرزوؤں کو پورا کرنے کے بعد یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس طرح اپنے نفس کی عزت واحترام میں اضافہ کررہے ہیں جب کہ در حقیقت وہ نفس کی توہین کرکے اسے تکلیف پہنچارہے ہیں۔

کچھ لوگ اپنے نفس کے ساتھ شدت اور سختی سے پیش آتے ہیں اور جب وہ کسی شہوت اور خواہش کی طرف آگے بڑھنا چاہتا ہے تو صرف اسے روکتے ہی نہیں بلکہ اسکے ساتھ ساتھ اسکی توہین و تذلیل بھی کرتے ہیں یہ عمل درحقیقت اپنے نفس کی عزت افزائی اور احترام ہے۔

اور کچھ ایسے ہیں جو بالکل اندھا دھند اپنی خواہشات میں ڈوبے رہتے ہیں انھیں صرف دنیاوی لذت سے مطلب ہے ایسے لوگوں کو آخرت میں کچھ ہاتھ آنے والا نہیں ہے۔یہ لوگ آخرت کی نعمتوں سے محروم رہیں گے۔

حدیث کے ان الفاظ پر مزید توجہ فرمائیں:

﴿الا وان عمل الجنة حَزنة بربوة﴾

"حزنة ربوة" والا عمل جنت میں لے جاتا ہے۔"

''حزنہ''ناہموار پتھریلی زمین اور ''دبوۃ'' اس پر چلنے کو کہا جاتا ہے۔ جو شخص ناہموار اور پتھریلی پہاڑیوں پر چڑھتا ہے اسکا سانس پھول جاتا ہے اور ہمت جواب دینے لگتی ہے اور آخری منزل تک پہنچنے تک اسکو بیحد مشقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسے دریا کے بہاؤ کے خلاف تیرنے میں انسان کی ہمت جواب دینے لگتی ہے لیکن ہموار راستہ پر چلنا یا دریا کے رخ کے مطابق تیرنا نہایت ہی آسان کام ہے یہی حال جنت اور جہنم کے اعمال یعنی اطاعت و معصیت کا بھی ہے کہ گناہ کرتے وقت تو انسان آسانی کے ساتھ خواہشات کے بہاؤ میں بہتا رہتا ہے لیکن اطاعت خدا کرتے وقت اسے اپنے نفس کی جانب سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۲۔ نہج البلاغہ میں منقول ہے کہ مولائے کائناتؑ نے پیغمبر اکرمؐ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہؐ برابر یہ فرمایا کرتے تھے:

﴿إن الجنة حفت بالمكاره، وإن النار حفت بالشهوات، واعلموا: إنه مامن طاعة الله شيء إلا يأتي في كره، وما من معصية الله شيء إلا ياتي في شهوة، فرحم الله امرأ نزع نفسه عن شهوته، وقمع هوىٰ نفسه، فإن هذه النفس أبعد شي منزعا، وإنها لاتزال تنزع إلى معصية في هوىٰ﴾(۱)

''جنت کے چاروں طرف مشکلات اور زحمتوں کا حصار ہے اور جہنم کے چاروں طرف شہوتوں (خواہشات) کا گھراؤ ہے اور یہ یاد رکھو کہ خدا کی کوئی اطاعت ایسی نہیں ہے جس میں کچھ نہ کچھ زحمت اور ناگواری کا پہلو نہ ہو اور اسکی کوئی معصیت ایسی نہیں ہے جس میں شہوت اور ہوی و ہوس شامل نہ ہو۔ اللہ اس بندے پر رحمت نازل کرے جو اپنے نفس کو ہوئی و ہوس سے دور کر لے اور اپنی ہوس کو بالکل اکھاڑ پھینکے کہ یہ نفس خواہشات میں بہت دور تک کھینچ لے جانے والا ہے اور ہمیشہ

---

(۱) نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۶

گناہوں کی خواہش کی طرف ہی کھنچتا رہتا ہے"

یہ حدیث ہمارے اس نتیجہ کی بہترین دلیل ہے جسے ہم نے روایات سے اخذ کر کے یہاں پیش کیا ہے کیونکہ جنت وجہنم ہی ہر انسان کی آخری منزل ہے جو انسان خداوند عالم کی طرف محو حرکت ہے وہ جنت میں جائے گا اور جو اسکی نافرمانی کرے گا وہ انتہائی پستیوں میں پہنچ کر جہنم کا نوالہ بن جائے گا۔

جنت کے چاروں طرف مشکلات اور ناگواریوں کے حصار کا مطلب یہ ہے کہ اس تک پہونچنے کے لئے انسان کو ہر طرح کی مشکلات سے گذرنا پڑتا ہے یعنی خواہشات اور ہوی وہوس پر قابو پانے، تسلط حاصل کرنے اور اسے کچلنے کے لئے سخت زحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے

جبکہ جہنم کے ہر طرف خواہشات اور ہوی وہوس کا بسیرا ہے انسان خواہشات اور ہوی وہوس کے درمیان پھسل کر ہی تنزلی اور پستیوں میں مبتلا ہوتا ہے۔

پیغمبر اکرم ﷺ کی اس حدیث کی روشنی میں امیر المومنینؑ نے ایک عام اصول ہمارے حوالے کردیا ہے:

﴿مـامن طاعة الله شيء إلا ياتي في كره ،ومـامن معصية الله شيء إلا ياتي في شهوة﴾

"ہر اطاعت خدا کے وقت کچھ نہ کچھ ناگواری ضرور محسوس ہوتی ہے اور ہر گناہ میں ہوس کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور پایا جاتا ہے"

اطاعت الٰہی کرتے وقت نفس کو اسکی خواہشات ولذات اور ہوی وہوس سے دور رکھنے کے لئے انسان کو ناگواری کا احساس ہوتا ہے جبکہ وہ گناہوں میں لذت محسوس کرتا ہے کیونکہ اس سے نفس کی ہوس اور خواہشات پوری ہوتی ہیں اور اسے کسی قسم کے اندرونی ٹکراؤ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

ان تمام تفصیلات کے بعد یہ حقیقت بآسانی قبول کی جاسکتی ہے کہ انسان کے لئے

خداوند عالم تک پہونچنے کی راہیں خواہشات اور لذتوں کی دشوار گذار وادیوں سے ہو کر ہی گذرتی ہیں اور انسان خواہشات کے زینہ سے ہی ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا خداوند عالم تک پہونچتا ہے۔ اگر انسانی وجود میں یہ خواہشات نہ ہوتیں تو انسان کے لئے اس منزل معراج وکمال تک پہونچنا ہرگز آسان نہ ہوتا جس کا اسے اہل قرار دیا گیا ہے۔

عمل اور ردعمل کا سلسلہ

خداوند عالم نے انسانی وجود میں خواہشات کو ودیعت فرما کر اسکے لئے درحقیقت ایک ایسا ذخیرہ فراہم کردیا جس سے انسان اپنی ہر ضرورت پوری کرسکتا ہے۔جیسے پروردگار نے انسان کے لئے زمین کے اندر کھانے پینے اور لباس کی جملہ ضرویات،سمندروں میں پینے اور سینچائی کے لئے پانی فضا میں ہوا اور سانس کے لئے مختلف اقسام کے ذخائر فراہم کردیئے کہ انسان ان تینوں عناصر سے حسب ضرورت آب وغذا یا دوسرے خام مواد حاصل کرتا ہے۔اسی طرح خداوند عالم نے ان خواہشات کے ضمن میں نفس انسانی کے اندر علم ومعرفت،یقین اور بندگی کے خزانے بھی ودیعت فرمائے ہیں۔

نفسانی خواہشات درحقیقت حیوانی وجود کا مقدمہ ہیں اوران خواہشات کا اکثر حصہ حیوانات کے اندر پایا جاتا ہے صرف انسان ایک ایسی مخلوق ہے جسکو خداوند عالم نے ''ارادہ'' کے ذریعہ ان خواہشات پر غلبہ حاصل کرنے ،انہیں روکنے یا محدود رکھنے کی صلاحیت بھی عنایت فرمائی ہے اور اسی ارادہ کے ماتحت ہوجانے کے بعد یہ ارذیل اور خودسر حیوانی خصلتیں بھی بہترین روحانی اور اخلاقی فضائل واقدار،بصیرت ویقین،عزم واستقلال اور تقوی وپرہیز گاری جیسی حسین شکل اختیار کرلیتی ہیں۔

وہ خواہشات جن سے انسان کے اندر حیوانی اور جسمانی پہلو کی تشکیل ہوتی ہے یہ جب کنٹرول اور قابو میں رکھنے والے اسباب کے ماتحت آتی ہیں تو اخلاقی اقدار میں تبدیل ہوجاتی ہیں اور وہی خواہشات اس کے ''انسانی'' پہلو کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ خودسر حیوانی خواہشات تقویٰ اور پرہیزگاری کے ذریعہ کس طرح

ان بلند و بالا انسانی اقدار میں تبدیل ہوتی ہیں اور تقوی و پرہیز گاری کی بنا پر نفس کے اندر کس قسم کے تغیرات اور تبدیلیاں رونما ہوتے ہیں جو اس حیوانی خصلت کو علم و یقین اور صبر و بصیرت میں تبدیل کر دیتے ہیں؟ اسکا جواب ہمیں نہیں معلوم ہے۔

بلکہ نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایک تو یہ کہ ہمیں یہ بات معلوم نہیں ہے۔ اور مزید افسوس یہ کہ علم و معرفت کا یہ وسیع باب انسان کیلئے آج تک نہ کھل سکا اور قدیم وجدید ماہرین نفسیات یہاں تک کہ اسلامیات کے ماہرین میں سے کوئی بھی آج تک اس گتھی کو سلجھانے میں کامیاب نہیں ہوسکا ہے۔

لیکن جب ہم خود اپنے نفس کے اوپر ایک نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں اسکے اندر بڑے پیمانہ پر رونما ہونے والے عمل اور ردعمل کے سلسلہ کا صاف اشارہ ملتا ہے جیسے حیاء، جنسی خواہشات پر غلبہ حاصل کرنے کا ''ذریعہ'' ہی نہیں ہے بلکہ حیاء ان خواہشات کو کچلنے کا ''نتیجہ'' بھی ہے۔ چنانچہ انسان ادب، فن اور ذوق کے غیر اخلاقی مواقع پر جس حد تک جنسی خواہشات کو کچلتا رہتا ہے اس کی حیا میں اتنا ہی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

ادب سے ہماری مراد، ہرگز بدکاری نہیں ہے البتہ وہ بلند پایہ ادب، فن اور ذوق جس کی بناء انسان حیوانیت سے ممتاز ہوتا ہے وہ اسی قوت برداشت اور تقوی کی بناء پر حاصل ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں جب ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اسکے اندر بھی ہمیں واضح طور پر اشارے ملتے ہیں جو ہمیں اپنے نفس کے بارے میں غور کرنے سے حاصل ہورہے تھے۔

خداوند عالم کا ارشاد ہے:

﴿...واتقوا اللہ ویعلمکم اللہ...﴾(۱)

---

(۱) سورۂ بقرہ آیت ۲۸۲۔

''یعنی تم پرہیز گار اور متقی بن جاؤ اور خداوند عالم تم کو دولت علم عطا فرمائے گا''

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس آیت کا دوسرا جملہ ﴿ویعلمکم اللہ﴾ پہلے جملہ پر بغیر کسی رابطہ کے عطف کیا گیا ہے اور ان دونوں کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہے؟ یا ایسا نہیں ہے بلکہ علم وتقویٰ میں گہرا رابطہ ہے اور یہ دونوں جملے درحقیقت ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں۔ اور ایک ترازو کے دو پلڑوں کی طرح ہیں؟

جو شخص بھی قرآن مجید کے اسلوب سے باخبر ہے وہ اسمیں کوئی شک وشبہ نہیں کرسکتا اور وہ یقینی طور پر جانتا ہے کہ یہ دونوں جملے ایک ہی ترازو کے دو پلڑوں کی مانند ہیں۔ خداوند عالم نے اپنے بندوں کے لئے یہاں جس علم کا تذکرہ فرمایا ہے وہ علم تقویٰ کا ہی نتیجہ اور اثر ہے اور یہ علم اس علم سے بالکل مختلف ہے جسے ہم تعلیم کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں۔ یہ علم، نور ہے جو خداوند عالم اپنے جس بندے کو چاہتا ہے عطا فرمادیتا ہے۔

اس نور کی طرف سورۂ حدید کی یہ آیۂ کریمہ بھی اشارہ کررہی ہے:

﴿یاأیھاالذین آمنوا اتقوا اللہ وآمنوابرسولہ یؤتکم کفلین من رحمتہ ویجعل لکم نوراً تمشون بہ﴾(۱)

''ایمان والو اللہ سے ڈرو اور رسول پر واقعی ایمان لے آؤ تا کہ خدا تمہیں اپنی رحمت کے دوہرے حصے عطا کردے اور تمہارے لئے ایسا نور قرار دیدے جسکی روشنی میں چل سکو''

اس نور سے مراد علم ہے لہٰذا سورۂ بقرہ اور سورۂ حدید دونوں مقامات پر علم اور تقویٰ کے درمیان ایک جیسا رابطہ پایا جاتا ہے۔

تقویٰ خواہشات کے طوفان کے سامنے بند باندھنے کا نام ہے اور خواہشات کے سامنے

---

(۱) سورۂ حدید آیت ۲۸۔

لگائی جانے والی یہی بندش ایک دن نور علم وبصیرت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

جناب یوسفؑ کے واقعہ کے ذیل میں ارشاد الٰہی ہے:

﴿ولمابلغ أشده آتیناه حکماً وعلماً وکذلك نجزی المحسنین﴾(۱)

''اور جب یوسفؑ اپنی جوانی کی عمر کو پہونچے تو ہم نے انہیں حکم اور علم عطا کردیا کہ ہم اسی طرح نیکی کرنے والوں کو جزا دیا کرتے ہیں''

جناب موسیٰ کے قصہ میں بھی بعینہ یہی تذکرہ موجود ہے:

﴿ولمابلغ أشده واستویٰ آتیناه حکماً وعلماً وکذلک نجزی المحسنین﴾(۲)

''اور جب موسیٰ جوانی کی توانائیوں کو پہونچے اور تندرست ہوگئے تو ہم نے انہیں علم اور حکمت عطا کردی اور ہم اسی طرح نیک عمل کرنے والوں کو جزا دیا کرتے ہیں''

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے جناب موسیٰؑ اور جناب یوسفؑ کو اس خاص انعام سے کیوں نوازا دوسرے لوگوں کو یہ نعمت کیوں نہیں ملی؟ کیا خدا یوں ہی بلا سبب اپنے بعض بندوں کو ایسے اعزاز سے نواز دیتا ہے اور دوسروں کو محروم رکھتا ہے؟ یا ایسا نہیں ہے بلکہ یہ سب تبدیلیاں ثابت واستوار الٰہی سنتوں کے تحت انجام پاتی ہیں۔

جولوگ قرآنی لہجہ سے واقف ہیں انھیں اس بات میں ذرہ برابر بھی شک وشبہ نہیں ہوسکتا کہ ان دونوں آیتوں میں علم وحکمت کا تعلق ''احسان'' سے قرار دیا گیا ہے۔ ''وکذلک نجزی المحسنین'' ''اور ہم احسان کرنے والوں کو اسی طرح جزا دیا کرتے ہیں'' تو جب وہ علم وحکمت جو جناب موسیٰؑ اور جناب یوسفؑ کو خدا کی طرف سے عطا کی گئی ہے وہ سنت الٰہی کی بناء پر احسان سے

---

(۱) سورۂ یوسف آیت ۲۲

(۲) سورۂ قصص آیت ۱۴

مربوط ہے تو اسکے معنی یہ ہوئے کہ محسنین اپنے احسان اور حسن عمل کی وجہ سے ہی رحمت الٰہی کے مستحق ہوتے ہیں اور اسی بناء پر ان کو اسکی بارگاہ سے علم وحکمت کی دولت سے نوازا جاتا ہے۔لہٰذا اس استدلال کی درمیانی کڑیوں کو چھوڑتے ہوئے ہم مختصر طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ" درحقیقت وہ احسان،علم وحکمت میں تبدیل ہوگیا ہے۔"

اور اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ تقوی اور خواہشات نفس کی مخالفت،احسان کا واضح ترین مصداق ہیں۔

فی الحال ہم اس موضوع کو مزید طول نہیں دے سکتے کیونکہ اس اہم موضوع کے لئے ہمارے پاس مناسب مقدار میں علمی مواد موجود نہیں ہے۔خداوند عالم سے یہی دعا ہے کہ کوئی ایسا صاحب علم وکمال پیدا ہوجائے جو بہترین انداز سے اس مسئلہ کی گتھیاں سلجھا دے۔کیونکہ یہ بات تو طے شدہ ہے کہ نفس کے اندر عمل اور ردعمل کا سلسلہ بالکل اسی طرح رونما ہوتا رہتا ہے جس طرح فزکس،کیمسٹری اور زولوجی وغیرہ کے میدانوں میں دکھائی دیتا ہے مثلاً حرارت حرکت میں تبدیل ہوجاتی ہے اور حرکت حرارت میں بدل جاتی ہے یا بجلی کی طاقت حرکت پیدا کردیتی ہے اور اسی حرکت سے بجلی بنائی جاتی ہے بالکل اسی طرح نفس کے اندر بھی عمل اور ردعمل کا سلسلہ پایا جاتا ہے جسکی طرف قرآن مجید کی بعض آیتوں میں سرسری اشارہ موجود ہے،لہٰذا اسلام سے تعلق رکھنے والے علم النفس کے ماہرین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ نفس کے اسرار سے پردہ ہٹا کر ان کے اصول وقوانین کو تلاش کرنے کی کوشش کریں۔

خواہشات کا تخریبی کردار

خواہشات اور طاغوت

انسانی زندگی میں بربادی کا ایک مرکز انسانی ہوئی وہوس اور خواہشات ہیں اور دوسرا مرکز

طاغوت ہے انکے درمیان صرف اتنا فرق ہے کہ ہویٰ وہوس نفس کے اندر رہ کر تخریبی کارروائی کرتی ہے اور طاغوت یہی کام نفس کے باہر سے انجام دیتا ہے اس طرح یہ دونوں انسان کو فتنہ وفساد اور تباہی کی آگ میں جھونک دیتے ہیں۔بس ان کا انداز جدا ہوتا ہے۔

شیطان ان خواہشات کے ذریعہ انسان کے اندر داخل ہوکر اس پر اپنا قبضہ جما لیتا ہے جبکہ سماج یا معاشرہ اور قوموں کے اوپر طاغوت کے ذریعہ اپنی گرفت مضبوط رکھتا ہے۔

اسی لئے خداوند عالم نے قرآن مجید میں نفس کی پیروی کرنے سے بار بار منع کیا ہے اور اسکی مخالفت کی تاکید فرمائی ہے۔نمونہ کے طور پر مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمائیں:

﴿فلا تتبعوا الهوی﴾(۱)

''لہٰذا ہوی وہوس کی پیروی نہ کرنا''

﴿ولاتتبع الهوی فیضلّك عن سبیل الله﴾(۲)

''اور خواہشات کا اتباع نہ کرو کہ وہ راہ خدا سے منحرف کردیں''

﴿ولاتتبع اهوائهم عماجائك من الحق﴾(۳)

''اور جو کچھ حق تمہارے پاس آیا ہے اسکے مقابلہ میں ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو''

ہویٰ وہوس کی پیروی سے بچنے کی مانند خداوند عالم نے ہمیں ''طاغوت'' کا انکار کرنے اور اس سے دور رہنے کا بھی حکم دیا ہے:

﴿یریدون ان یتحاکموا إلی الطاغوت وقد أمروا أن یکفروا به﴾(۴)

---

(۱)سورۂ نساء آیت ۱۳۵۔

(۲)سورۂ ص آیت ۲۶۔

(۳)سورۂ مائدہ آیت ۴۸۔

(۴)سورۂ نساء آیت ۶۰۔

''وہ یہ چاہتے ہیں کے سرکش لوگوں (طاغوت) کے پاس فیصلہ کرائیں جبکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ طاغوت کا انکار کریں''

﴿و الذین اجتنبوا الطاغوت ان یعبدوھا وأنابوا الی اللہ لھم البشری﴾(۱)

''اور جن لوگوں نے طاغوت کی عبادت سے علیحدگی اختیار کی اور خدا کی طرف متوجہ ہوگئے ان کے لئے ہماری طرف سے بشارت ہے''

﴿ولقد بعثنا فی کل أمۃ رسولا أن اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت﴾(۲)

''اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا ہے کہ تم لوگ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو''

عقل اور دین

ہویٰ وہوس اور طاغوت کے مقابلہ میں انسان کو راہ راست پر ثبات قدم عطا کرنے کیلئے خداوند عالم نے دو راستے کھول دیے ہیں ایک عقل اور دوسرے دین۔ عقل انسان کے اندر رہ کر اسکی اصلاح کرتی ہے اور دین باہر سے اسکی ہدایت کا کام انجام دیتا ہے۔

اسی لئے حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا ہے:

﴿العقل شرع من داخل، والشرع عقل من خارج﴾(۳)

''عقل اندرونی شریعت ہے اور شریعت بیرونی عقل کا نام ہے''

امام کاظمؑ کا ارشاد ہے:

---

(۱) سورۂ زمر آیت ۱۷۔

(۲) سورۂ نحل آیت ۳۶۔

(۳) مجمع البحرین للطریحی مادہ عقل۔

﴿ان للّٰہ علی الناس حجتین حجة ظاهرة وحجة باطنة فأما الحجة الظاهرة فالرسل والانبیاء والائمة وأما الباطنة فالعقول﴾(۱)

''لوگوں کے اوپر خداوند عالم کی دو حجتیں اور دلیلیں ہیں جن میں ایک ظاہری اور دوسری پوشیدہ اور باطنی حجت ہے۔ظاہری حجت انبیاء،مرسلین اور ائمہ ہیں اور پوشیدہ اور باطنی حجت ''عقل'' ہے۔''

عقل اور دین کے سہارے انسان داخلی وخارجی سطح پر بخوبی ہوئی وہوس اور طاغوت کا مقابلہ کرسکتا ہے۔جیسا کہ مولائے کائنات ؑ نے فرمایا ہے:

﴿قاتل هواك بعقلك﴾(۲)

''اپنی عقل کے ذریعہ اپنی خواہشات سے جنگ کرو''

خواہشات کی تباہ کاریاں

یہ بے لگام قوت جسکے مطالبات کی بھی کوئی حد نہیں ہے یہ انسان کے اندر تخریب کاری اور فساد وانحراف کی اتنی زیادہ قوت وطاقت رکھتی ہے کہ اس کی طاقت کے برابر شیطان اور طاغوت جیسی طاقتوں کے اندر بھی قوت وطاقت نہیں پائی جاتی ہے۔

اور سب سے زیادہ خطرناک بات تو یہ ہے کے انسان کو نیست ونابود کرنے والی یہ طاقت انسان کے وجود میں ہی سمائی ہوئی ہے اور انسان کے پاس اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا کوئی راستہ بھی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اکرم ؐ کو اپنی امت کے بارے میں سب سے زیادہ جن دو چیزوں کا خوف لاحق تھا ان میں سے ایک ''خواہشات نفس'' ہے جیسا کہ آپ ؐ کا ارشاد گرامی ہے:

---

(۱) بحار ج۱ص ۱۳۷۔اصول کافی ج۱ص ۱۶۔

(۲) نہج البلاغہ حکمت ۴۲۴

﴿إن أخوف ما أخاف علیٰ أمتي: الھویٰ وطول الأمل، أما الھویٰ فإنه یصد عن الحق، وأما طول الأمل فینسي الآخرة﴾(۱)

''مجھے اپنی امت کے بارے میں دو چیزوں کا سب سے زیادہ خوف لاحق رہتا ہے ہویٰ وہوس، لمبی لمبی آرزوئیں، کیونکہ خواہشات، حق تک پہنچنے کے راستے بند کردیتی ہیں اور لمبی لمبی آرزوئیں آخرت کا خیال ذہن سے نکال دیتی ہیں''

اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ہویٰ وہوس انسان کے اندر رہ کر اسے گمراہ کرتی ہے اسی لئے مولائے کائناتؑ نے فرمایا ہے:

﴿اللذات مفسدات﴾(۲)

''لذتیں تباہ کن ہیں''

تباہ کاری کے مراحل

حیات انسانی میں خواہشات کے منفی اور تخریبی کردار پر بھی ہمیں غور کرنا چاہئے کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ انسانی وجود میں کچھ ایسے بنیادی محرکات پائے جاتے ہیں جن کی بنا پر علم ومعرفت پیدا ہوتی ہے اور انہیں کے ذریعہ انسان کی مادی اور معنوی زندگی پروان چڑھتی ہے اسی طرح اسکے انسانی اور حیوانی دونوں پہلوؤں کی انہیں محرکات کے ذریعہ تکمیل ہوتی ہے۔

مگر ان تمام محرکات کے درمیان خواہشات اور ہویٰ وہوس ایسا محرک ہے کہ اگر خواہشات اپنی رو میں ہوں اور ان میں طغیانی آجائے تو پھر یہ انسان کے اندر موجود دوسرے محرکات کو بالکل معطل اور ناکارہ بنادیتے ہیں اور عقل، دل، ضمیر، فطرت اور ارادہ کی حیثیت بالکل ختم ہوجاتی ہے۔ وسیع پیمانہ پر

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۰ ص ۸۸ حدیث ۱۹ ج ۷۰ ص ۷۵ حدیث ۳ و ج ۷۰ ص ۷۷ ح ۹ و ۷۔

(۲) غرر الحکم ج ۱ ص ۱۳۔

ان محرکات کی معطلی کے بعد انسانی پہلو بالکل نیست و نابود ہوجاتا ہے اور انسانی نفس میں محرک کی حیثیت سے خواہشات کے علاوہ کچھ اور باقی نہیں رہتا ہے جبکہ تمام حیوانی پہلوؤں کی تشکیل انہیں خواہشات سے ہوتی ہے۔

اس طرح انسانی زندگی کے اندر یہ مفید اور کارآمد عنصر ہلاکت اور بربادی کا موجب ہوجاتا ہے جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ولاتطع من أغفلناقلبه عن ذكرنا واتبع هواه وكان أمره فرطا﴾(۱)

''اور ہرگز اس کی اطاعت نہ کرنا جسکے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے محروم کردیا ہے اور وہ اپنے خواہشات کا پیروکار ہے اور اس کا کام سراسر زیادتی کرنا ہے''

فرط تفریط سے بنا ہے جسکے معنی ضائع و برباد کرنا ہیں۔

انسانی زندگی میں ہویٰ و ہوس کے تخریبی کردار کی طرف قرآن وحدیث میں خصوصی توجہ دلائی گئی ہے تاکہ لوگ خواہشات کے خطرات سے بخوبی آگاہ رہیں اور انکی تباہ کاریوں کا شکار نہ ہونے پائیں۔

ذیل میں ہم اسلامی نکتہ نظر سے خواہشات اور ہویٰ وہوس کی تباہیوں اور بربادیوں کا جائزہ پیش کررہے ہیں۔

ہمیں آیات اور روایات کے مطابق خواہشات کی تخریبی کارروائی کے دو مرحلے دکھائی دیتے ہیں پہلے مرحلہ میں تو خواہشات، انسان کے اندر علم ومعرفت اور خداوند عالم کی طرف لے جانے والے تمام ذرائع کو معطل اور نیست و نابود کر کے رکھ دیتی ہیں۔

دوسرے مرحلہ میں ان تمام ذرائع کو معطل کرنے کے بعد خواہشات انسان کو مکمل طور پر

---

(۱) سورۂ کہف آیت/۲۸۔

اپنے قبضہ میں لے لیتے ہیں اور اس پر خواہشات کی حکمرانی ہوتی ہے انسان ہر اعتبار سے ان کی حکومت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے اور خواہشات کا اسیر بن کر رہ جاتا ہے جسکے نتیجہ میں خداوند عالم نے انسان کو جو کچھ طاقتیں، صلاحیتیں اور فہم وفراست عطا فرمائی تھی وہ سب ہوئی وہوس کا آلۂ کار بن جاتی ہیں۔

اب آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں خواہشات کے ان دونوں مرحلوں کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

خواہشات کی تخریبی کارروائیوں کا پہلا مرحلہ

ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ پہلے مرحلہ میں ہوئی وہوس علم وعمل کی تمام خداداد صلاحیتوں کو معطل کردیتی ہے۔ اسکے علاوہ بھی یہ انسان کے اندر بہت خرابیاں پیدا کرتی ہے آیات وروایات میں مختلف عناوین کے تحت ان خرابیوں کا تذکرہ موجود ہے ہم موضوع کی مناسبت سے صرف چند نمونے پیش کررہے ہیں۔

۱۔ خواہشات، قلب پر ہدایت کے دروازے بند کردیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿أفرأیت من اتخذ إلٰهه هواه و أضله الله علیٰ علم و ختم علیٰ سمعه وقلبه وجعل علیٰ بصره غشاوۃ فمن یهدیه من بعد الله أفلا تذکرون﴾(۱)

''کیا آپ نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش ہی کو خدا بنالیا ہے اور خدا نے اسی حالت کو دیکھ کر اسے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے اور اسکے کان اور دل پر مہر لگادی ہے اور اسکی آنکھ پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور خدا کے بعد کون ہدایت کرسکتا ہے کیا تم اتنا بھی غور نہیں کرتے ہو''

دوسرے مقام پر خداوند عالم کا ارشاد ہے:

---

(۱) سورۂ جاثیہ آیت ۲۳۔

﴿فإن لم يستجيبوا لك فاعلم أنما يتبعون أهوائهم ومن أضل ممن إتبع هواه﴾(۱)

''پھر اگر یہ آپ کی بات کو قبول نہ کریں تو سمجھ لیجئے کہ یہ صرف اپنی خواہشات کا اتباع کرنے والے ہیں اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جو خدا کی ہدایت کے بغیر اپنی خواہشات کا اتباع کرے''

ان آیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواہشات انسان کے دل کے اوپر خدا، رسول، خدائی آیات ودلائل اور ہدایت کے تمام راستے مکمل طور پر بند کر دیتے ہیں اور قلب سے خدا و رسول کی دعوت پر لبیک کہنے کی صلاحیت کو سلب کر لیتے ہیں۔

مزید تائید کے لئے مولائے کائناتؑ کے یہ ارشادات ملاحظہ فرمایئے:

﴿من اتبع هواه أعماه، وأصمّه، وأذلّه﴾(۲)

''جو اپنی خواہشات کی پیروی کرے گا خواہشات اس کو اندھا بہرا بنا دیں گی اور اس کو ذلیل ورسوا کردیں گی۔''

☆﴿الهوی شريك العمیٰ﴾(۳)

''خواہشیں نابینائی کے شریک کار ہوتی ہیں۔''

☆﴿إنك إنْ أطعت هواك أصمّك وأعماك﴾(۴)

''اگر تم اپنے خواہشات کی پیروی کروگے تو وہ تم کو بہرا اور اندھا بنادینگے''

---

(۱) سورۂ قصص آیت ۵۰۔

(۲) غرر الحکم ج۲ص ۲۴۲۔

(۳) نہج البلاغہ مکتوب ۳۱۔

(۴) غرر الحکم ج ا ص ۲۶۰۔

﴿اوصیکم بمجانبة الھویٰ،فإن الھویٰ یدعوإلی العمی وھو الضلال فی الآخرۃ والدنیا﴾(۱)

میں تم کو خواہشات سے دور رہنے کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ خواہشات اندھے پن کی طرف لیجاتی ہیں اور وہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ کی گمراہی ہے۔''

۲۔خواہشات گمراہی کا ذریعہ

خداوندعالم کا ارشاد ہے:

﴿فخلف من بعدھم خلف أضاعوا الصلاۃ واتبعوا الشھوات فسوف یلقون غیّا﴾(۲)

''پھران کے بعدان کی جگہ پر وہ لوگ آگئے جنھوں نے نماز کو برباد کردیا اور خواہشات کا اتباع کرلیا پس عنقریب یہ اپنی گمراہی سے جاملیں گے''

اوراللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے:

﴿ولا تتبع الھویٰ فیضلک عن سبیل اللہ ان الذین یضلون عن سبیل اللہ لھم عذاب شدید﴾(۳)

''اور(اے داؤد)!خواہشات کی پیروی نہ کرو کہ وہ راہ خدا سے منصرف کردیں بیشک جو لوگ راہ خدا سے بھٹک جاتے ہیں ان کیلئے شدید عذاب ہے''

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

﴿إنّ أخوف ماأخاف علیٰ اُمتی،الھویٰ،وطول الأمل،أماالھویٰ فإنّه

---

(۱)مستدرک وسائل الشیعہ ۲/۳۴۵طبع قدیم۔

(۲)سورۂ مریم آیت ۵۹۔

(۳)سورۂ ص آیت ۲۶۔

یصدُ عن الحق،و أما طول الأمل فینسی الآخرة﴾(۱)

''مجھے اپنی امت کے بارے میں سب سے زیادہ دو چیزوں کا خوف ہے۔خواہشات نفس اور لمبی لمبی آرزوئیں کیونکہ خواہشات اور ہویٰ وہوس حق تک پہونچنے کے راستے بند کردیتی ہیں اور لمبی لمبی آرزوئیں آخرت کا خیال ذہن سے نکال دیتی ہیں''

۳۔خواہشات ایک مہلک زہر

امیرالمومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

﴿الشھوات سموما ت قاتلات﴾(۲)

''خواہشات مہلک زہر ہیں''

۴۔خواہشات آفت اور بیماری

اس سلسلہ میں حضرت علیؑ کے یہ اقوال ملاحظہ فرمائیں:

﴿من تسرّع الیٰ الشھوات تسرّعت الیہ الآفات﴾(۳)

''جو خواہشات کی طرف جتنی تیزی سے بڑھے گا اسکے اوپر اتنی ہی تیزی سے آفتیں آن پڑیں گی''

﴿احفظ نفسک من الشھوات،تسلم من الآفات﴾(۴)

''اپنے نفس کو خواہشات سے بچا کر رکھو تو آفتوں سے محفوظ رہوگے''

---

(۱)خصال صدوق جلد ا صفحہ ۲۷،بحارالانوارج ۷۰ص ۷۵حدیث ۳وج ۷۰ص ۷۷حدیث ۷وج ۷۰ص ۸۸ حدیث ۱۹۔

(۲)غررالحکم ج ۱ص ۳۳۔

(۳)غررالحکم ج ۲ص ۲۰۱۔

(۴)گذشتہ حوالہ۔

﴿رأس الآفات الوله باللذات﴾(۱)

''آفتوں کی اصل وجہ لذات وخواہشات کا دلدادہ ہونا ہے۔''

﴿قرين الشهوة مريض النفس معلول العقل﴾(۲)

''شہوتوں اور خواہشوں کے دلدادہ کا نفس مریض اور عقل بیمار ہوتی ہے''

﴿الشهوات أعلال قاتلات، وأفضل دوائها اقتناء الصبر عنها﴾(۳)

''خواہشات مہلک بیماریاں ہیں اور ان سے پرہیز کرنا ہی ان کی بہترین دوا ہے''

﴿أول الشهوة طرب وآخرها عطب﴾(۴)

''خواہشات کا آغاز لطف انگیز اور انجام زحمت خیز ہوتا ہے۔''

۵۔خواہشات آزمائشوں کی بنیاد

حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

﴿الهوىٰ أسّ المحن﴾(۵)

''ہوس آزمائشوں کی بنیاد ہے''

۶۔خواہشات فتنوں کی چراگاہ

حضرت علیؑ کا ارشاد ہے: ﴿الهوىٰ مطيّة الفتن﴾(۶)

---

(۱)غررالحکم ج۱ص۳۷۲۔

(۲)غررالحکم ج۲ص۷۷و۷۸۔

(۳)غررالحکم ج۱ص۹۰۔

(۴)غررالحکم ج۱ص۱۹۵۔

(۵)غررالحکم ج۱ص۵۰۔

(۶)غررالحکم ج۱ص۵۱۔

"خواہشات فتنوں کی چراگاہ ہیں۔"

آپ ہی کا ارشاد ہے:

﴿انمابدء وقوع الفتن أهواء تُتبع﴾(۱)

"فتنوں کے واقع ہونے کی ابتدا ان خواہشات سے ہوتی ہے جنکی پیروی کی جائے۔"

﴿ایاکم وتمکّن الهویٰ منکم، فان أوّله فتنة، وآخره محنة﴾

"ذرا سنبھل کر، کہیں تمہاری خواہشات تم پر حاوی نہ ہو جائیں کیونکہ انکی ابتداء فتنہ اور انتہا آزمائش طلب ہوتی ہے۔"

۷۔ خواہشات ایک پستی

حضرت علیؑ:

﴿الهویٰ یُردی﴾(۲)

"ہویٰ وہوس پستی میں گرا دیتی ہے۔"

آپؑ ہی کا یہ ارشاد بھی ہے:

﴿الهویٰ هوی الیٰ اسفل السافلین﴾(۳)

"انسانی ہوس، پستیوں کی آخری تہوں میں گرا دیتی ہے"

امام جعفر صادقؑ کا قول ہے:

﴿لاتدع النفس وهواها، فان هواها رداها﴾(۴)

---

(۱) نہج البلاغہ خطبہ ۵۰۔

(۲) غرر الحکم ج۱ ص ۱۲۔

(۳) غرر الحکم ج۱ ص ۶۵۔

(۴) بحار الانوار ج ۷۰ ص ۸۹ حدیث ۲۰۔

''نفس کو اس کی خواہشات کے اوپر نہ چھوڑ دو کیونکہ اس کی خواہشات ہی اس کی پستی ہیں''

۸۔ خواہشات موجب ہلاکت

حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

﴿أهلك شي الهوىٰ﴾(۱)

''سب سے زیادہ مہلک چیز خواہشات ہیں''

﴿الهوىٰ قرين مهلك﴾(۲)

''خواہشات مہلک ساتھی ہیں''

۹۔ خواہشات انسان کی دشمن

حضرت امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے:

﴿أحذروا اهوائكم كماتحذرون أعدائكم،فليس شي ء أعدىٰ للرجال من اتباع أهوائهم﴾(۳)

''اپنی خواہشات سے اسی طرح ڈرو جس طرح تم اپنے دشمنوں سے ڈرتے ہو کیونکہ لوگوں کے لئے ان کی خواہشات سے بڑا کوئی دشمن نہیں ہے''

۱۰۔ عقل کی بربادی

حضرت علیؑ کا ارشاد ہے: ﴿آفة العقل الهوىٰ﴾(۴)

---

(۱) غرر الحکم ج۱ ص۱۸۰۔

(۲) غرر الحکم ج۱ ص۴۷۔

(۳) بحار الانوار ج۷۰ ص۸۲ حدیث ۱۲۔

(۴) غرر الحکم ج۱ ص۲۷۲۔

"خواہشات عقل کو برباد کرنے والی آفت ہیں۔"

﴿من لم یملك شھوته لم یملك عقله﴾(۱)

"جس کا اپنی خواہشوں کے اوپر اختیار نہیں رہتا وہ اپنی عقل کا اختیار بھی کھو بیٹھتا ہے"

﴿زوال العقل بین دواعی الشھوۃ والغضب﴾

"عقل دو چیزوں میں زائل ہوتی ہے: شہوت اور غضب"

ہوئی وہوس اور خواہشات کا عالم یہ ہے کہ جب ان میں طغیانی پیدا ہوتی ہے تو یہ مفید اور کار آمد عنصر، تعمیر کے بجائے تخریب اور دوسرے اہم بنیادی منابع ومحرکات کی بربادی کا سبب بن جاتا ہے

یہ تھا خواہشات کی کارروائی کا پہلا مرحلہ، جس میں انسانی زندگی پر خواہشات کا منفی اور تخریبی کردار بخوبی واضح ہو گیا۔

خواہشات کی تباہ کاری کا دوسرا مرحلہ

خواہشات کی جن تباہ کاریوں کی طرف ہم نے ابھی اشارہ کیا ہے بات اسی مرحلہ پر تمام نہیں ہوتی بلکہ خواہشات فتنہ وفساد برپا کرنے میں دو چار قدم اور آگے نظر آتے ہیں چنانچہ پہلے مرحلہ میں یہ خواہشات انسان کے ارادہ، عقل، ضمیر، دل اور فطرت کو ناکارہ اور معطل کر دیتی ہیں اس مرحلہ کو قرآن مجید نے 'اغفال قلب' (دل کو غافل بنا دینے) کا نام دیا ہے۔

لیکن جب خواہشات ان تمام اہم محرکات کو نیست ونابود کر دیتے ہیں اور انسان کو ہر لحاظ سے اپنی گرفت میں لے کر اس پر غلبہ اور تسلط حاصل کر لیتے ہیں تو پھر انسان خواہشات کا تابع اور فرماں بردار ہو کر رہ جاتا ہے اس مرحلہ کو قرآن مجید نے "اتباع ہویٰ" کا نام دیا ہے۔ مندرجہ ذیل آیۂ کریمہ میں آپ دونوں مراحل بخوبی ملاحظہ کر سکتے ہیں:

---

(۱)مستدرک وسائل الشیعہ ج۲ص ۲۸۷ طبع قدیم۔

﴿ولاتطع من أغفلناقلبه عن ذکرنا واتبع هواه وکان أمره فرطا﴾(۱)

"اور ہرگز اسکی اطاعت نہ کرنا جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے محروم کردیا ہے۔وہ اپنے خواہشات کا پیروکار ہے۔اور اسکا کام سراسر زیادتی کرنا ہے"

پہلے مرحلہ میں خواہشات نے انسانوں کے دل کو بالکل غافل بنادیا اور اسمیں علم ومعرفت اور ہدایت وبصیرت کا کوئی امکان باقی نہیں رہ گیا اور دوسرے مرحلہ میں ہویٰ وہوس نے اسے مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیا نتیجتاً انسان خواہشات کا تابع محض بن کر رہ گیا اور جب یہ سب کچھ ہوجائے کہ ایک طرف اسکا دل غافل رہے اور دوسری جانب وہ ہوس کا غلام بن جائے تو اسکا آخری انجام واقعاً وہی تلخ حقیقت ہے جسکی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے۔"وکان أمره فرطا"

خواہشات کا قیدی

دوسرے مرحلہ میں انسان ہر اعتبار سے خواہشات کے قبضہ میں چلا جاتا ہے اور واقعاً "خواہشات" کا اسیر بن کر رہ جاتا ہے بلکہ اپنے اسیر پر خواہشات کا اختیار وتسلط جنگی قیدی کے بالمقابل کہیں زیادہ ہوتا ہے کیونکہ قیدی پر فاتح کا اختیار وتسلط محدود حد تک ہوتا ہے۔مثلاً وہ اسے فرار نہیں ہونے دیتا یا مقابلہ سے معذور کردیتا ہے،اسے کسی خاص راہ وروش کا پابند بنادیا جاتا ہے، اور اسے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے اسے اپنی مرضی کے مطابق بولنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی مگر ان تمام باتوں کے باوجود یہ قیدی تین اعتبار سے بالکل آزاد رہتا ہے۔

۱۔اپنے احساسات اور سماعت و بصارت میں آزاد ہوتا ہے اور دوسروں کے احساسات سے قطع نظر وہ اپنے طور پر مستقل سنتا ہے دیکھتا ہے اور کسی بھی چیز کا احساس کرسکتا ہے اور قید کرنے والا چاہے جتنی بڑی حکومت اور اقتدار کا مالک ہو پھر بھی وہ اسکے احساسات پر پابندی نہیں لگاسکتا جیسے

---

(۱)سورۂ کہف آیت ۲۸۔

اسکے اوپر یہ پابندی نہیں لگا سکتا کہ وہ اچھی چیز کو برا دیکھنے لگے۔ یا بری چیز کو اچھا محسوس کرے۔

۲۔ اسکی عقل بھی بالکل آزاد رہتی ہے اور وہ جس طرح چاہے سوچ سکتا ہے اور اپنی عقل کے مطابق فیصلہ کرتا ہے نہ کہ قید کرنے والوں کی عقل کے مطابق اسے اسیر کرنے والے اسکی عقل کو قیدی بنا کر اپنی مرضی کے مطابق اسکے لئے کوئی خاص طرز تفکر معین نہیں کر سکتے ہیں۔

۳۔ اسی طرح اسکا دل بھی بالکل آزاد ہوتا ہے یعنی اس کا دل جس سے چاہے محبت یا نفرت کر سکتا ہے یہ اسے اختیار ہے اور اسے قیدی بنانے والے اسمیں کوئی مداخلت نہیں کر سکتے بلکہ وہ جن کی قید میں ہوتا ہے انھیں سے نفرت کرتا ہے اور انکے دشمنوں سے محبت کرتا ہے کیونکہ اسکے دل پر ان کا کوئی اختیار نہیں ہوتا ہے۔

بقول شاعر

"مجھے اسیر کر دیا مری زبان کاٹو مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے"

لیکن خواہشات کے قیدیوں میں معاملہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہے کیونکہ خواہشات اپنے اسیر کے احساسات اسکی عقل اور دل سب کو مکمل طور پر اپنے قابو میں کر لیتی ہیں اور ان کے اندر اپنے مطابق مداخلت کرتی ہیں اور اسیر پر ان کی مکمل حکمرانی ہوتی ہے۔

اب وہ خواہشات ہی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے برائی کو اچھائی اور اچھائی کو برائی، نیک و طیب کو خبیث اور خبیث کو طیب سمجھتا ہے۔

اور ہر چیز کے بارے میں اسکا انداز فکر وہی ہو جاتا ہے جو اس کے خواہشات چاہتے ہیں گویا اسکی عقل و منطق اور فہم و ادراک سب تبدیل ہو جاتے ہیں۔

پھر یہ خواہشات انسان کے قلب پر حملہ آور ہوتے ہیں اور اسے بھی اپنے قبضہ میں لے لیتے ہیں اور پھر اسکا انداز محبت و نفرت خواہشات کے اشاروں پر تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ خداوند عالم کے جن دشمنوں سے نفرت ضروری ہے وہ ان سے محبت کرنے لگتا ہے اور خدا کے جن محبوب بندوں

سے محبت ضروری ہے ان سے اسے نفرت ہوجاتی ہے۔

ان خواہشات کا آخری حملہ انسان کے ضمیر کے اوپر ہوتا ہے کیونکہ انسانی وجود میں ضمیر ہی ان کے مقابلہ میں سب سے زیادہ ثبات قدم کا مظاہرہ کرتا ہے اور آخرکار اس جنگ میں انسان کا ضمیر بھی پیچھے ہٹنے لگتا ہے اور جب یہ خواہشات انسان سے اسکا ضمیر بھی چھین لیتے ہیں تو پھر انسان اپنی خواہشات، شیاطین اور طاغوت کے مقابلہ میں بالکل بے یارومددگار ہوکر ہتھیار ڈال دیتا ہے۔

اس سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ خواہشات کی زنجیریں بدن کو قید کرنے والی زنجیروں اور سلاخوں سے کتنی زیادہ مؤثر اور کاری ہوتی ہیں، ایک انسان کی قید اور خواہشات کی اسیری کے اس فرق کی جانب مولائے کائناتؑ کی اس حدیث میں بھی اشارہ موجود ہے:

﴿عبدالشهوة أذل من عبدالرق﴾(۱)

''خواہشات کا اسیر ہونا کسی انسان کے ہاتھوں اسیر ہونے سے کہیں زیادہ ذلت ورسوائی کا باعث ہے''

اگر چہ بظاہر ان دونوں کو ہی اسیری کہا جاتا ہے اور دونوں طرح کی اسیری میں انسان ذلیل ہوتا ہے اور دونوں صورتوں میں قیدی دوسرے کا محکوم ہوتا ہے لیکن پھر بھی کسی انسان کی قید میں رہنا اتنا دشوار نہیں ہے جتنی دشوار اور باعث ذلت خواہشات کی اسیری ہوتی ہے۔

خواہشات کی قید قرآن وحدیث کی روشنی میں

مندرجہ ذیل آیۂ کریمہ کے بارے میں غوروفکر کرنے کے بعد انسانی وجود پر قابض اس اسیری کی گہرائیوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔خداوندعالم کا ارشاد ہے:

﴿أفرأيت من اتخذالٰهه هواه وأضله الله علىٰ علم وختم علىٰ سمعه وقلبه

---

(۱)غررالحکم ج۲ص۴۰۔

وجعل علیٰ بصرہ غشا وۃفمن یھدیہ من بعد اللہ أفلا تذکّرون﴾(۱)

''کیا آپ نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش ہی کو خدا بنالیا ہے اور خدا نے اسی حالت کو دیکھ کر اسے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے اور اسکے کان اور دل پر مہر لگادی ہے اور اسکی آنکھ پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور خدا کے بعد کون ہدایت کرسکتا ہے کیا تم اتنا بھی غور نہیں کرتے ہو؟''

اس طرح خداوند عالم ایسے انسان سے سماعت، بصارت اور دل سب کچھ چھین لیتا ہے اور وہ دوسروں کے اشاروں پر اس طرح حرکت کرتا ہے کہ اس کو اپنے اوپر ذرہ برابر اختیار نہیں رہ جاتا اور وہ ہر معاملہ میں خواہشات کا ہی تابع رہتا ہے یہاں تک کہ اسکے خواہشات ہی اسکا خدا بن جاتے ہیں جوکہ خواہشات کی غلامی کی آخری منزل ہے۔

مزید وضاحت کے لئے مولائے کائنات کے مندرجہ ذیل اقوال ملاحظہ فرمایئے:

﴿من ملك نفسه علا امره،ومن ملكته نفسه ذل قدره﴾(۲)

''جو اپنے نفس کا مالک ومختار ہو وہ باوقار اور بلند مرتبہ ہے اور جس کا مالک ومختار اسکا نفس ہے وہ ذلیل اور رسوا ہوتا ہے''

﴿أزری بنفسه من ملكته الشهوة واستعبدته المطامع﴾(۳)

''اس نے اپنے نفس کو معیوب بنالیا جو شہوت کا محکوم ہوگیا اور لالچوں نے اسے غلام بنالیا''

﴿عبدالشهوة أسير لا ينفك أسره﴾(۴)

''خواہشات کا غلام ایک ایسا قیدی ہے جو کبھی آزاد نہیں ہوسکتا ہے''

---

(۱)سورۂ جاثیہ آیت ۲۳۔

(۲)مستدرک الوسائل ج۲ص ۲۸۲۔

(۳)غرر الحکم ج۱ص ۱۹۵۔

(۴)غرر الحکم ج۲ص ۴۰۔

﴿کم من عقل أسیر تحت ھویٰ أمیر﴾(۱)

''کتنی عقلیں، خواہشات کی فرمانروائی میں اسیر ہیں''

﴿الشھوات تسترق الجھول﴾(۲)

''خواہشات جاہلوں کو غلام بنا کر رکھتی ہیں''

یہ بہترین تعبیر ہے کہ جاہل جب خواہشات کے پیچھے چلتا ہے تو وہ اسے نفس کے اختیار سے نکال کر اپنی سلطنت کے ماتحت لے لیتی ہیں اور انسان اپنی عقل، ارادہ اور ضمیر کے دائرۂ اختیار سے باہر نکل کر خواہشات کی حکومت اور اختیار میں چلا جاتا ہے جس طرح چور تاریکی میں بڑی خاموشی کے ساتھ گھر کے سامان کا صفایا کر دیتا ہے اسی طرح جہالت کی تاریکی میں خاموشی سے انسان پر اسکے خواہشات کی حکمرانی ہو جاتی ہے اور اسے خبر بھی نہیں ہو پاتی ہے۔

انسان اور خواہشات کی غلامی

جب اس حد تک انسان کے اوپر خواہشات کی حکمرانی ہو جاتی ہے تو انسان خواہشات کا غلام بن جاتا ہے کیونکہ خواہشات کا ایسا غلبہ ایک قسم کی بندگی ہے۔

قرآن مجید کی یہ دونوں آیتیں ہمیں بیحد غور وفکر کی دعوت دیتی ہیں:

﴿أفرأیت من اتخذ الٰھہ ھواہ وأضلہ اللہ علیٰ علم وختم علیٰ سمعہ وقلبہ وجعل علیٰ بصرہ غشاوۃ فمن یھدیہ من بعد اللہ أفلا تذکرون﴾(۳)

''کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش ہی کو خدا بنا لیا ہے اور خدا نے اسی حالت کو دیکھ کر اسے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے اور اسکے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اسکی آنکھ پر

---

(۱) نہج البلاغہ حکمت ۲۱۱۔

(۲) غرر الحکم ج۱ص ۳۵۔

(۳) سورۂ جاثیہ آیت ۲۳۔

پردے پڑے ہوئے ہیں اور خدا کے بعد کون ہدایت کر سکتا ہے کیا تم اتنا بھی غور نہیں کرتے ہو"

﴿أرأيت من اتخذ إلهه هواه أفأنت تكون عليه وكيلا﴾(۱)

"کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے کہ جس نے اپنی خواہش ہی کو خدا بنا لیا ہے کیا آپ اسکی بھی ذمہ داری لینے کے لئے تیار ہیں"

بات اگر چہ بہت عجیب وغریب محسوس ہوتی ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ ایک منزل وہ آتی ہے کہ جب انسان پروردگار عالم کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کو خدا بنا لیتا ہے اور انھیں کی عبادت کرتا ہے۔"

رسول اکرمؐ سے منقول ہے:

﴿ماتحت ظل السماء من اله يعبد من دون الله أعظم عندالله من هوىً متبع﴾(۲)

"اس آسمان کے نیچے خداوند عالم کے بعد سب سے زیادہ جس معبود کی عبادت کی گئی ہے وہ خواہشات کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے"۔

حضرت علیؑ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿الجاهل عبد شهوته﴾(۳)

"جاہل اپنی خواہش کا غلام ہوتا ہے"

اللہ نے بھی اسے نظر انداز کر دیا

جب انسان خداوند عالم کی بندگی اور عبودیت سے نکل کر خواہشات نفس سے رشتہ جوڑ دیتا ہے اور اطاعت الٰہی کے بجائے اپنے نفس کا تابع ہو جاتا ہے تو پھر وہ عملی اعتبار سے اس حد تک پستی

---

(۱) سورۂ فرقان آیت ۴۳۔

(۲) درمنثور ج۵ ص۷۲۔

(۳) غرر الحکم ج۱ ص۲۸۔

میں چلا جاتا ہے کہ رب العالمین کی اطاعت و بندگی چھوڑ کر اپنے خواہشات نفس کی پرستش شروع کر دیتا ہے۔

لہٰذا ایسے افراد کے بارے میں یہ کہنا بالکل بجا ہے ﴿نسوا اللہ فنسیھم﴾ کہ ''انھوں نے خداوند عالم کو بھلا دیا تو اس نے انھیں فراموش کر دیا۔'' اسکی وجہ بھی صاف ظاہر ہے کیونکہ جب وہ خود خدا کی عبودیت و بندگی اور اسکی اطاعت کے حدود سے باہر نکل گئے اور انھوں نے خدا سے اپنا رابطہ توڑ کر اسے بھلا دیا تو پروردگار عالم نے بھی ان کو بھلا دیا۔۔۔ان کے بھلا دینے کا جواب انہیں بھلا کر دیا اور انہیں ان کے حوالہ کر دیا اور جس لحہ بھی خداوند عالم کسی بندے سے اپنی نظر کرم موڑ کر اسے اسکے نفس کے حوالہ کر دیتا ہے اسی لحہ وہ شیطان کا شکار بن جاتا ہے۔

خواہشات کی تباہیاں قرآن مجید کی روشنی میں

بنی اسرائیل کے ایک بہت بڑے عالم ''بلعم بن باعورا'' [۱] کا قصہ قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

﴿واتل علیھم نبأالذی آتیناہ آیاتنافانسلخ منھافأتبعہ الشیطان فکان من الغاوین ولو شئنالرفعناہ بھا ولٰکنہ أخلد إلیٰ الارض واتّبع ھواہ فمثلہ کمثل الکلب إن تحمل علیہ یلھث أوتترکہ یلھث ذلک مثل القوم الذین

---

(۱) مشہور روایات کی بنیاد پر ان آیات میں بلعم باعورا کی ہی مذمت کی گئی ہے۔اگر چہ دیگر اقوال بھی موجود ہیں جن کے مطابق وہ شخص صیفی راہب تھا جس نے پیغمبر اکرمؐ کو فاسق کہا تھا۔بعض حضرات کے نزدیک اس سے مراد امیہ بن ابی الصلت ہے وغیرہ وغیرہ۔

کذّبوا بآیاتنافاقصص القصص لعلهم یتفکّرون﴾(۱)

''اورانھیں اس شخص کی خبر سنایئے جسکو ہم نے اپنی آیتیں عطا کیں پھر وہ ان سے بالکل الگ ہوگیااور شیطان نے اسکا پیچھا پکڑلیا تو وہ گمراہوں میں ہوگیااور ہم چاہتے تو اسے انھیں آیتوں کے سبب بلند کردیتے لیکن وہ خود زمین کی طرف جھک گیااور اس نے خواہشات کی پیروی اختیار کرلی تواب اسکی مثال اس کتے جیسی ہے کہ اس پر حملہ کروتو بھی زبان نکالے رہے اور چھوڑ دوتو بھی زبان نکالے رہے یہ اس قوم کی مثال ہے جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی ،تواب آپ ان قصوں کو بیان کریں کہ شاید یہ غوروفکر کرنے لگیں''

ان آیات کی تفسیر یہ ہے کہ ''بلعم بن باعورا'' بنی اسرائیل کا ایک بہت ہی بڑا اور مشہور عالم تھا اسکو خداوندعالم نے اپنی روشن آیات نیز علم ومعرفت سے اس حد تک نوازا تھا کہ اسے مستجاب الدعوات قرار دے دیا تھا اور جناب موسیٰ بعض معاملات میں اس سے مدد لیتے تھے۔۔۔مگر وہ اپنی ہویٰ وہوس کا اسیر ہوگیا۔

چنانچہ ایسے افراد جب اپنی خواہشات کا شکار ہوتے ہیں تو عام طور سے اسکے دوہی اسباب ہوتے ہیں یا تو وہ اپنے علم کو ذاتی فائدہ کیلئے استعمال کرنے لگتے ہیں مثلاً علم کے ذریعہ شہرت وعزت یا عہدہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور لوگوں کے درمیان علم کے ذریعہ اپنی شخصیت کا اظہار کرتے ہیں یا یہ کہ دولت کی لالچ میں اپنے علم سے اہل حکومت اور طاغوت کی خدمت شروع کردیتے ہیں اور علم کے بدلہ مال دنیا کماتے ہیں اس طرح دونوں صورتوں کا ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ علم ہویٰ وہوس اور خواہشات کا شکار ہوجاتا ہے۔

کیونکہ کسی بھی عالم کی اہمیت کا معیار دراصل اسکے علم کی کثرت نہیں ہے، جیسے اکثر کتب

---

(۱) سورۂ اعراف آیت ۱۷۵۔۱۷۶۔

خانوں میں اتنی زیادہ کتابیں ہوتی ہیں کہ علماء کی ایک کثیر تعداد مل کر بھی انہیں نہ اٹھا سکے مگر اسکی کوئی اہمیت نہیں ہے۔علم کی قدر و قیمت دراصل صاحب علم اور اس علم کے مصرف اور محل استعمال کو دیکھ کر لگا ئی جاتی ہے۔اگر عالم انبیاء کے دین اور اخلاق سے مزین ہو اور اس کا علم لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی نیز انکی خدمت میں کام آئے تو یہ اس عالم کی قدر و قیمت کا سبب ہے اور اگر خدانخواستہ ایسا کچھ نہیں ہے تو پھر اس عالم کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

مولائے کائنات ؑ نے خطبۂ شقشقیہ میں عالم کی منزلت اور اسکی ذمہ داریاں ان الفاظ میں بیان فرمائی ہیں:

﴿وما أخذ الله علی العلماء أن لایقارّوا علی کظة ظالم ولا سغب مظلوم﴾

''اللہ کا اہل علم سے یہ عہد ہے کہ خبردار ظالم کی شکم پری اور مظلوم کی گرسنگی پر چین سے نہ بیٹھنا۔۔۔''

لہٰذا اگر عالم خدا سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرنے کیلئے اٹھ کھڑا ہو تو اسکی قدر و منزلت اور مقام و مرتبہ میں اضافہ ہوتا ہے۔

بلعم بن باعور(اگر ان آیات کی تفسیر بیان کرنے والی روایات کے مطابق بلعم باعور ہی مراد ہو)ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے اپنے علم کی لگام خواہشات کے سپرد کردی اور انھیں کے پیچھے چل پڑے اب قرآن مجید کے الفاظ میں اس شخص کا انجام ملاحظہ فرمایئے:

اگر ان روایات کو تسلیم کرلیا جائے تو آیۂ کریمہ میں اگر چہ بلعم باعور کے قصہ کی طرف ہی اشارہ ہے لیکن یہ باتیں ہر اس شخص کیلئے ہیں جو اپنے نفس کے اوپر اپنے خواہشات کو حاکم بنادے۔

جیسا کہ امام محمد باقر ؑ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿إن الاصل فی ذلك بلعم،ثم ضرب الله مثلاًلکل مؤثرهواه علی هدیٰ

اللہ،من أهل القبلة﴾(۱)

''یعنی یہ تذکرہ تو دراصل بلعم کا ہی ہے لیکن خداوند عالم نے اسمیں ہر اس مسلمان کی مثال بیان کردی ہے جو اپنی خواہشات کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر ترجیح دیتا ہو''

ایسے لوگوں کا انجام کیا ہوتا ہے ہمیں قرآنی بیانات کی روشنی میں اس پر بھی غور کرنا چاہئے۔

ا۔زمین کی جانب رغبت

زمین کی طرف رغبت ،دنیاوی زندگی سے دلبستگی کو کہتے ہیں یعنی انسان دنیا کا ہو کر رہ جائے۔کیونکہ زمین دنیا ہی کا دوسرا نام ہے اور زمین کی طرف جھکاؤ ،رغبت اس سے بیزاری کے ذریعہ رفعت وبلندی کے مقابلہ میں ہے جیسا کہ آیۂ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ولو شئنا لرفعناه بها ولكنه اخلد الیٰ الارض﴾

''اگر ہم چاہتے تو اسے انھیں آیات کے ذریعہ بلند کردیتے لیکن وہ خود زمین کی طرف جھک گیا''

یعنی اس نے خود دنیاوی ذلت کو گلے لگالیا۔کیونکہ جس طرح سطح زمین سے بلندی کی طرف اوپر جاتے ہوئے زمین کی قوت جاذبہ اور کشش کا مقابلہ کرنے میں زحمت ومشقت ہوتی ہے مگر اس کے برعکس اوپر سے زمین کی طرف آتے وقت زمین کی کشش کا سہارا مل جاتا ہے ...بالکل یہی حال زندگانی دنیا کی پستی اور بلندی کا بھی ہوتا ہے کہ اگر کوئی بلندیوں کا خواہاں ہے تو اسے اتنی ہی مشقتیں برداشت کرنا ہونگی لیکن اگر کوئی پستیوں میں جانا چاہتا ہے تو اس میں کوئی زحمت نہیں ہے۔

۲۔آیات خدا سے محرومی

﴿فانسلخ منها﴾ آیات الٰہیہ سے ''انسلاخ'' یعنی اسکے پاس آیات کی جو معرفت اور علم

---

(۱) مجمع البیان تفسیر سورۂ اعراف آیت ۱۷۵۔۱۷۶۔

وحکمت وبصیرت کی جو دولت تھی وہ اس سے واپس لے لی گئی۔

''انسلاخ''''التصاق ''کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے التصاق اس وقت کہا جاتا ہے کہ جب دو چیزیں آپس میں ملی ہوئی یا چپکی ہوتی ہیں اور جب ان کے درمیان مکمل علاحدگی یا بالکل جدائی ہو جائے تو اہل عرب اسکو''انسلاخ'' کہتے ہیں لہٰذا جو لوگ اپنی شہوتوں اور خواہشات کے تحت، قدم اٹھاتے ہیں انکا رابطہ علم ومعرفت اور آیات الٰہیہ سے بالکل ختم ہو جاتا ہے اور جس طرح کسی مریض کا معدہ کھانے کو قبول کرنے کے بجائے اسے رد کر دیتا ہے اسی طرح انکا نفس علم وحکمت جیسی پاکیزہ اور نفیس اشیاء کو قبول نہیں کر پاتا ہے۔

کیونکہ اگر اسکا وجود ہوس اور خواہشات کا دلدادہ ہو جائے تو پھر اسمیں آیات الٰہیہ، علم و حکمت اور بصیرت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی اور نہ ہی اسکے وجود میں اخلاقی اقدار وفضائل کا گذر ہو سکتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

﴿حرام علیٰ کل قلب متولّہ بالشھوات أن یسکنہ الورع﴾(۱)

''یعنی جو دل بھی خواہشات کا دلدادہ ہو اسکے اندر ورع وپرہیزگاری کا بسیرا حرام ہے''

آپ کا ہی ارشاد ہے:

﴿حرام علیٰ کل قلب اُغری بالشھوات أن یحل فی ملکوت السمٰوات﴾(۲)

''جو دل خواہشات کا فریب خوردہ ہو اس کیلئے''ملکوت السمٰوات'' کی سکونت حرام ہے''

---

(۱) مجموعہ ورام تنبیہ الخواطر ص ۳۶۲۔

(۲) گذشتہ حوالہ۔

﴿حرام علی کل قلب مغلول بالشهوة أن ینتفع بالحکمة﴾(۱)

''جو دل خواہشات کی زنجیروں سے جکڑا ہوا ہے اسکے لئے حکمت سے استفادہ کرنا حرام ہے۔''

کیونکہ دل ایک ظرف کی مانند ہے اور ایک ظرف میں خواہشات نفس اور یاد الٰہی ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے ہیں لہٰذا اسکے اندر یاذکر الٰہی رہے گا یا خواہشات رہیں گے کیونکہ ﴿ما جعل الله لرجل من قلبین فی جوفه﴾(۲)

''خداوند عالم نے ایک انسان کے جسم میں دو قلب نہیں بنائے ہیں''

لہٰذا جب انسان اپنی خواہشات کا اتباع کرتا ہے تو پھر خود بخود اسکے دل سے یاد خدا نکل جاتی ہے اور اگر اسمیں یاد خدا آجاتی ہے تو پھر خواہشات کا امکان نہیں رہ جاتا ہے۔

لہٰذا جس دل سے یاد خدا نکل جائے وہ خواہشات کے راستے پر چل پڑتا ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ولا تطع من أغفلنا قلبه عن ذکرنا واتبع هواه وکان أمره فرطا﴾(۳)

''اور ہرگز اس کی اطاعت نہ کرنا جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے محروم کردیا ہے وہ اپنی خواہشات کا پیروکار ہے اور اسکا کام سراسر زیادتی کرنا ہے۔''

خواہشات کی پیروی کا یہ دوسرا انجام ہے۔

۳۔شیطان کا تسلط

ارشاد رب العزت ہے: ﴿فأتبعه الشیطان﴾ ''اور شیطان نے اسکا پیچھا پکڑ لیا۔'' پہلے

---

(۱)غرر الحکم ج۱ص۳۴۴۔

(۲)سورۂ احزاب آیت ۴۔

(۳)سورۂ کہف آیت ۲۸۔

شیطان اس تک پہنچنے یا اس پر قبضہ کرنے سے عاجز تھا مگر خواہشات کی پیروی انسان پر شیطان کے قبضہ کو مستحکم بنا دیتی ہے اور انسان جتنی زیادہ خواہشات کی پیروی کرے گا اس پر شیطان کا تسلط اور غلبہ بھی اتنا ہی زیادہ مستحکم ہو جائے گا اور یہ خواہشات کی پیروی کا تیسرا نتیجہ ہے۔

۴۔ ضلالت و گمراہی

﴿فکان من الغاوین﴾ ''تو وہ گمراہوں میں ہو گیا'' ایسے لوگوں کے سلسلہ میں یہ ایک فطری چیز ہے کیونکہ جب انسان ہوئی وہوس میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کے دل سے یاد الٰہی نکل جاتی ہے اس پر شیطان کا تسلط قائم ہو جاتا ہے تو پھر اسکی ہدایت کا بھی کوئی امکان باقی نہیں رہ جاتا اور اسکی زندگی میں اصلاح کا امکان نہیں ہے لہٰذا وہ جس مقدار میں ہاتھ پیر مارتا ہے اتنا ہی پستیوں میں اترتا چلا جاتا ہے۔ اور یہ خواہشات کی پیروی کا چوتھا نتیجہ ہے۔

۵۔ لالچ

ان لوگوں کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے:

﴿فمثلہ کمثل الکلب اِنْ تحملْ علیہ یَلْھَثْ او تترکہ یلھث﴾

''تو اب اسکی مثال اس کتے جیسی ہے کہ اس پر حملہ کرو تو بھی زبان نکالے رہے اور چھوڑ دو تو بھی زبان نکالے رہے''

زبان باہر نکلی رہنا یہ کتوں کی ایک مشہور بیماری ہے اور اسمیں کتے کو ہر وقت پیاس لگی رہتی ہے چنانچہ اسے چاہے جتنا پانی پلایا جائے اسکی پیاس نہیں بجھ پاتی اور اسی لئے وہ ہمیشہ اپنی زبان باہر نکالے رہتا ہے اور چاہے کوئی اس پر حملہ کرے یا اسے اسی طرح چھوڑ دیا جائے ہر وقت اسکا ایک ہی حال رہتا ہے چنانچہ بالکل اسی صورتحال سے اہل ہوس بھی دوچار رہتے ہیں کہ دنیاوی لذتوں اور رنگینیوں میں غرق ہونے کے باوجود انکی پیاس نہیں بجھتی چاہے وہ مالدار ہوں یا فقیر انہیں دنیا مل گئی ہو یا نہ ملی ہو ان

سب کا حال پیاس کے مریض اس کتے کی طرح رہتا ہے جسکی پیاس بہتے دریا بھی نہیں بجھا پاتے ہیں۔

اسی بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

﴿لو کان لابن آدم وادیان من ذھب لابتغیٰ وراء ھما ثالثا﴾(۱)

''اگر فرزند آدم کے پاس سونے سے بھری ہوئی دو وادیاں ہوں تب بھی اسے تیسری وادی کی خواہش رہتی ہے''

امام جعفر صادقؑ سے جب ایک آدمی نے اپنے اندر دنیا کی لالچ اور اسکی طرف توجہ رہنے کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا: جو چیز تمہارے لئے کافی ہے اور وہ تمھیں مستغنی بنادے تو اسکی معمولی مقدار بھی تمہیں مستغنی بنا سکتی ہے لیکن جو چیز تمہارے لئے کافی ہے اگر وہ تمہیں مستغنی نہ بنا سکے تو پھر پوری دنیا بھی تمھیں مستغنی نہیں بنا سکتی ہے اور یہ اس کا پانچواں نتیجہ ہے۔(۲)

خواہشات کا علاج

ہوس کی تخریبی طاقت

انسانی خواہشات اس کیلئے جس مقدار میں مفید ہیں اس کے مطابق انکے اندر قدرت اور طاقت بھی پائی جاتی ہے چنانچہ اگر یہ غلط راستے پر لگ جائیں تو پھر یہ اپنی طاقت کے اعتبار سے ہی انسانی زندگی کو تہہ وبالا کر کے رکھ دیتی ہیں۔۔۔انسانی نفس کے اندر اسکے یہ دونوں (مثبت اور مفید منفی اور مضر) پہلو بالکل طے شدہ ہیں اور اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ خواہشات ہی دراصل انسان کی زندگی کے پہیوں کو گردش دینے والی قوت ہیں اور اگر خداوند عالم نے انسان کے

---

(۱) مجموعہ ورام تنبیہ الخواطر ص ۱۶۳۔

(۲) اصول کافی ج ۲ ص ۱۳۹

نفس میں جنسیات، مال، خودی (حب ذات)، کھانے پینے اور اپنے دفاع کی محبت نہ رکھی ہوتی تو قافلۂ انسانی ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ لہٰذا خواہشات کے اندر جتنے فائدے ہیں انکے اندر اتنی ہی طاقت موجود ہے اور انکے اندر جتنی طاقت پائی جاتی ہے انکے بہک جانے کی صورت میں انکے نقصانات بھی اسی کے مطابق ہونگے جیسا کہ مولائے کائناتؑ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿الغضب مفسد للالباب و مبعد عن الصواب﴾(۱)

"غصہ عقلوں کو برباد اور راہ حق سے دور کر دینے والی چیز ہے"

آپؑ نے یہ بھی فرمایا ہے:

﴿أكثر مصارع العقول تحت بريق المطامع﴾(۲)

"عقلوں کی اکثر قتل گاہیں طمع کی جگہوں کی چمک دمک کے آس پاس ہیں"

خواہشات کی پیروی پر روک اور انکی آزادی کے درمیان

یہی وجہ ہے کہ خواہشات کو ایکدم کچل کر رکھ دینا بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ خواہش انسانی زندگی کیلئے ایک مفید طاقت ہے جس کے سہارے کاروان حیات انسانی رواں دواں ہے اور اس کو معطل اور ناکارہ بنا دینا یا اسکی مذمت کرنا اور اسکی اہمیت کا اعتراف نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی شخصیت کے ایک بڑے حصہ کا انکار کر دیا جائے اور اسکو نقل و حرکت میں رکھنے والی اصل طاقت کو ناکارہ قرار دیدیا جائے۔

اسی طرح خواہشات اور ہوس کی لگام کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دینا اور انکے ہر مطالبہ کی تکمیل کرنا اور ان کی ہر بات میں ہاں سے ہاں ملانا بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر ان کی رسی ڈھیلی چھوڑ دی جائے تو

---

(۱) غرر الحکم ج۱ص ۶۷۔

(۲) غرر الحکم ج۱ص ۱۹۸۔

یہ فائدہ مند ہونے کے بجائے انسان کیلئے مضر بن جاتے ہیں۔

لہٰذا ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑیگا کہ شرعی اعتبار سے خواہشات کی محدود تکمیل کی بہت اہمیت ہے اور جس طرح انکو بالکل آزاد چھوڑ دینا صحیح نہیں ہے اسی طرح ہر بات میں انکی تکمیل بھی صحیح نہیں ہے۔

اسی معیار پر اسلام نے خواہشات کے بارے میں اپنے احکام بنائے ہیں یعنی پہلے وہ خواہشات کو انسان کیلئے ضروری سمجھتا ہے اور اسے فضول چیز قرار نہیں دیتا جیسا کہ قرآن کریم میں پروردگار عالم کا ارشاد ہے:

﴿زُیِّنَ للناسِ حبُّ الشهواتِ من النساءِ والبنینَ والقناطیرِ المقنطرةِ من الذهبِ والفضةِ والخیلِ المسوّمةِ والأنعامِ والحرثِ﴾(۱)

''لوگوں کے لئے خواہشات دنیا، عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، تندرست گھوڑے یا چوپائے کھیتیاں سب مزین اور آراستہ کردی گئیں ہیں''

دوسری آیت میں ارشاد ہے:

﴿ألمالُ والبنونَ زینة الحیاةِ الدنیا﴾(۲)

''مال اور اولاد، زندگانی دنیا کی زینت ہیں''

ان آیات میں نہ صرف یہ کہ خواہشات کی مذمت نہیں ہے بلکہ اسکو زینت اور جمال زندگانی قرار دیا گیا ہے اور اسی اہم نکتہ سے خواہشات کے بارے میں اسلام کا واضح نظریہ بھی معلوم ہوجاتا ہے۔

دوسرے مرحلہ پر اس نے ہمیں اپنی خواہشات کو پورا کرنے اور دنیاوی لذتوں سے بہرہ مند ہونے کا حکم دیا ہے:

---

(۱) آل عمران آیت ۱۴۔

(۲) سورۂ کہف آیت ۴۶۔

﴿کلوا من طیبات مارزقناکم﴾(۱)

''تم ہمارے پاکیزہ رزق کو کھاؤ''

یا یہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ولا تنس نصیبك من الدنیا﴾(۲)

''اور دنیا میں اپنا حصہ بھول نہ جاؤ''

اور اسی طرح یہ بھی ارشاد ہے:

﴿قل من حرّم زینة الله التی اخرج لعبادهِ والطیبات من الرزق﴾(۳)

''پیغمبر آپ ان سے پوچھئے کہ کس نے اس زینت کو جس کو خدا نے اپنے بندوں کیلئے پیدا کیا ہے اور پاکیزہ رزق کو حرام کردیا ہے''

خواہشات کے بارے میں اسلام نے یہ دوسرا نظریہ پیش کیا ہے جس کے اندر نہ اپنی خواہشات کی تکمیل کی کھلی چھوٹ ہے کہ جس کا جس طرح دل چاہے وہ اپنی خواہشات کی پیاس بجھاتا رہے اور کسی قاعدہ وقانون کے بغیر سر جھکا کر انھیں کے پیچھے چلتا رہے۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے:

﴿لاتدع النفس وهواها فإن هواها رداها﴾(۴)

''اپنے نفس کو اسکے خواہشات کے اوپر نہ چھوڑ دو کیونکہ اسکے خواہشات میں اسکی پستی اور

---

(۱)سورۂ طٰہٰ آیت ۸۱۔

(۲)سورۂ قصص آیت ۷۷۔

(۳)سورۂ اعراف آیت ۳۲۔

(۴)اصول کافی ج۲ص ۳۳۶۔

ذلت ہے"

ان تمام پابندیوں اور سختیوں کے باوجود اسلام نے انسانی خواہشات کی تسلی کیلئے ایک نظام بنا کر خود بھی اس کے بیحد مواقع فراہم کئے ہیں جیسے اسلام نے جنسیات کو حرام قرار نہیں دیا ہے اور نہ اس سے منع کیا ہے اور نہ ہی اسے کوئی برا یا پست کام کہا ہے بلکہ خود اسکی طرف رغبت دلائی ہے اور اسکی تاکید کی ہے البتہ اسکے لئے کچھ شرعی قواعد وضوابط بھی بنائے ہیں اسی طرح مال سے محبت کرنے کو نہ اسلام منع کرتا ہے اور نہ اسے برا کہتا ہے بلکہ یہ تمام انسانوں کیلئے مباح ہے البتہ اسکے لئے بھی کچھ قواعد وقوانین مرتب کردیے گئے ہیں تاکہ مالی یا جنسی خواہشات وغیرہ کی تسلی کیلئے ہر شخص کے سامنے مواقع موجود رہیں اور کوئی شخص بھی بے راہ روی کا شکار نہ ہونے پائے یہ خواہشات کے بارے میں اسلامی نظریہ کا تیسرا نکتہ ہے۔

خواہشات کو قابو میں رکھنے کے لئے "عقل" کا کردار

خواہشات کو بغاوت اور سرکشی سے روکنے اور ہر لحاظ سے انکی تکمیل سے منع کرنے اور اسی طرح انکی تسلی کی معقول حد بندی کیلئے انسانی عقل میدان عمل میں ہمیشہ فعال رہتی ہے اور شاید اسی لئے عربی زبان میں عقل کو عقل کہا جاتا ہے کہ عقل کسی کو لگام لگانے یا پھندے کو کہتے ہیں اور خدا نے عقل کو یہی ذمہ داری سونپی ہے کہ وہ خواہشات کو لگام لگا کر اپنے قابو میں رکھے جیسا کہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿إن العقل عقال من الجهل، والنفس مثل أخبث الدواب﴾(۱)

"عقل جہالت سے بچانے والی لگام ہے اور نفس خبیث ترین چوپائے کی طرح ہے"

روایات میں اسی مضمون کی طرف کثرت سے اشارے موجود ہیں بطور نمونہ حضرت علیؑ

---

(۱) بحارالانوار ج۱ص۱۱۷۔

کے مندرجہ ذیل اقوال ملاحظہ فرمائیں:

☆ ﴿فكرك يهديك إلى الرشاد﴾(۱)

''تمہاری فکر تمہیں رشد وہدایت کی طرف رہنمائی کرتی ہے''

☆ ﴿للنفوس خواطر للهوىٰ، والعقول تزجر وتنهىٰ﴾(۲)

''نفس کے اندر مختلف قسم کی خواہشات ابھرتی رہتی ہیں اور عقل ان سے منع کرتی رہتی ہے''

☆ ﴿للقلوب خواطر سوء والعقول تزجر منها﴾(۳)

''دلوں کے اندر برے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور عقل ان سے باز رکھتی ہے''

☆ ﴿النفوس طلقة، لكن أيدى العقول تمسك اعنتها﴾(۴)

''نفس تو بالکل آزاد ہوتے ہیں لیکن عقلوں کے ہاتھ انکی لگام تھامے رہتے ہیں''

☆ ﴿ثمرة العقل مقت الدنيا وقمع الهوىٰ﴾(۵)

''عقل کا پھل دنیا کی ناراضگی اور خواہشات کی تاراجی ہے''

مختصر یہ کہ انسانی زندگی میں اسکی عقل کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ خواہشات کو اپنے محدود تقاضوں کے تحت کنٹرول کرتی ہے اور اس کی ہوس کو سرکشی اور بغاوت سے روکتی رہتی ہے اور انسان کو اس کی خواہشات کی تکمیل میں بے لگام نہیں رہنے دیتی لہٰذا جس کی عقل جتنی کامل اور پختہ ہوتی ہے وہ اپنی خواہشات پر اتنی ہی مہارت اور آسانی سے غلبہ حاصل کرلیتا ہے۔

---

(۱) غرر الحکم ج۲ ص ۵۸۔

(۲) تحف العقول ص ۹۶۔

(۳) غرر الحکم ج۲ ص ۱۲۱۔

(۴) غرر الحکم ج۱ ص ۱۰۹۔

(۵) غرر الحکم ج۲ ص ۳۲۳۔

حضرت علیؑ:

﴿العقل الکامل قاهر الطبع السوء﴾(۱)

”عقل کامل بری طبیعتوں پر غالب رہتی ہے“

اور یہی نہیں بلکہ خواہشات پر کنٹرول ہی انسان کی عقل سلیم کی پہچان ہے۔

حضرت علیؑ:

﴿حفظ العقل بمخالفة الهویٰ والعزوف عن الدنیا﴾(۲)

”خواہشات کی مخالفت اور دنیا سے بے رغبتی کے ذریعہ عقل محفوظ رہتی ہے“

امام محمد باقرؑ:

﴿لاعقل کمخالفة الهویٰ﴾(۳)

”خواہشات کی مخالفت سے بہتر کوئی عقل نہیں ہے“

حضرت علیؑ:

﴿من جانب هواه صح عقله﴾(۴)

”جس نے اپنی خواہشات سے کنارہ کشی اختیار کرلی اسکی عقل صحیح وسالم ہوجائے گی“

ان احادیث سے بھی یہ روشن ہوتا ہے کہ عقل اور خواہشات دونوں ہی انسان کی زندگی کے دواہم ستون ہیں ان میں سے خواہشات، انسانی حیات کے سفینہ کی نقل وحرکت اور اسکی تعمیر وترقی میں پتوار کا فریضہ ادا کرتے ہیں اور عقل اسکو بغاوت وسرکشی اور فتنہ وفساد کے خطرناک نشیب وفراز سے

---

(۱) بحارالانوار ج ۷۸ ص ۹۔

(۲) غرر الحکم ج ۱ ص ۳۴۵۔

(۳) بحارالانوار ج ۷۸ ص ۱۶۴۔

(۴) بحارالانوار ج ۱ ص ۱۶۰۔

نکال کر ساحل تک پہنچانے کی اہم ذمہ داری ادا کرتی ہے۔۔۔لہٰذا ہر انسان کے لئے جس طرح جسم وروح ضروری ہیں اسی طرح اس کے لئے ان دونوں کا وجود بھی ضروری ہے۔

عقل اور دین

انسانی زندگی میں دین بھی وہی کردار ادا کرتا ہے جو عقل کا کردار ہے یعنی جس طرح عقل، خواہشات کو مختلف طریقوں سے اپنے قابو میں رکھتی ہے اسی طرح دین بھی انھیں بھکنے سے بچاتا رہتا ہے یعنی عقل اور دین کے اندر ہر طرح کی فکری اور عملی یکسانیت اور مطابقت پائی جاتی ہے کیونکہ دین ایک الٰہی فطرت ہے جیسا کہ آیہ کریمہ میں ارشاد ہے:

﴿فطرة الله التی فطر الناس علیها لا تبدیل لخلق الله ذلك الدین القیم﴾(۱)

''دین وہ فطرت الٰہی ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور خلقت الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی ہے یقیناً یہی سیدھا اور مستحکم دین ہے''

وہ فطرت جو انسان کے اوپر حکمراں ہوتی ہے اور عقل بھی اسی کے ساتھ ساتھ چلتی ہے وہ ''دین'' ہے جسکے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حیات بشری کو دوام بخشا اور حیات بشری کے ذریعہ اسے قائم ودائم فرمایا لہٰذا دین بھی خواہشات کو کنڑول کرنے کے سلسلہ میں عقل کی امداد کرتا ہے اور خود بھی اسی ذمہ داری کو ادا کرتا ہے مختصر یہ کہ عقل اور دین ایک ہی سکے کے دورخ ہیں۔

حضرت علیؑ:

﴿العقل شرع من داخل، والشرع عقل من خارج﴾(۲)

''عقل بدن کی اندرونی شریعت اور شریعت بدن کے باہر موجود عقل کا نام ہے''

---

(۱) سورۂ روم آیت ۳۰۔

(۲) کتاب جوان: آقائے محمد تقی فلسفی ج۱ص۲۶۵۔

امام موسیٰ کاظمؑ:

﴿إن لله على الناس حجتين :حجة ظاهرة وحجة باطنة، فاماالظاهرة فالرسل والانبياء والائمة(ع)واماالباطنة فالعقول﴾(۱)

''لوگوں پر خداوند عالم کی دو حجتیں (دلیلیں) ہیں ایک ظاہری حجت اور دوسری پوشیدہ اور باطنی حجت و دلیل۔ظاہری دلیل انبیاء اور ائمہ ہیں جبکہ باطنی حجت عقل ہے''

امام جعفر صادق کا ارشاد ہے:

﴿حجة الله علیٰ العباد النبی،والحجة فیما بین العباد وبین الله العقل﴾(۲)

''بندوں کے اوپر خداوند عالم کی حجت اسکے انبیاء ہیں اور خداوند عالم اور اسکے بندوں کے درمیان،عقل حجت ہے''

عقل کے تین مراحل

انسانی زندگی میں عقل کے تین اہم کردار ہوتے ہیں:

۱۔معرفت الٰہی۔

۲۔خداوند عالم نے جو کچھ اپنے بندوں پر واجب کیا ہے اسکی اطاعت کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت کا نتیجہ اسکی اطاعت اور بندگی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

۳۔تقوائے الٰہی: یہ خداوند عالم کی اطاعت وبندگی کا دوسرا رخ ہے کیونکہ خداوند عالم کی اطاعت و بندگی کی بھی دو قسمیں ہیں۔

ا۔واجبات کو بجالانا اور محرمات سے پرہیز کرنا اور تقویٰ درحقیقت نفس کو محرمات سے باز

---

(۱)بحار الانوار ج۱ص۱۳۷۔

(۲)اصول کافی ج۱ص۲۵۔

رکھنے کا نام ہے۔اور شاید مندرجہ ذیل روایت میں بھی عقل کے مذکورہ تینوں مرحلوں کی وضاحت موجود ہے:

رسول اکرم ﷺ:

﴿قُسّم العقل علیٰ ثلاثة أجزاء،فمن کانت فیه کمل عقله،ومن لم تکن فیه فلا عقل له:حسن المعرفة باللّٰه عزوجل،و حسن الطاعة للّٰه،وحسن الصبر علیٰ أمره﴾(۱)

''عقل کے تین حصے کئے گئے ہیں لہٰذا جسکے اندر یہ تینوں حصے موجود ہوں اسکی عقل کامل ہے اور جسکے اندر یہ موجود نہ ہوں تو اسکے پاس عقل بھی نہیں ہے!

۱۔حسن معرفت الٰہی (خداوند عالم کی بہترین شناخت ومعرفت اور حجت آوری)۔

۲۔اللہ کی بہترین اطاعت وبندگی۔

۳۔اسکے احکامات پر اچھی طرح صبر کرنا''

خدا کے احکام پر صبر کرنے کا دوسرا نام خواہشات پر قابو پانا ہے اور اس کو تقویٰ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ خواہشات پر قابو پانا اور انھیں اپنے کنٹرول میں رکھنے کیلئے جتنا زیادہ صبر درکار ہے اتنا صبر کسی اور کام کیلئے درکار نہیں ہوتا ہے۔

اب ان تینوں مراحل کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

۱۔معرفت اور حجت آوری

عقل کی پہلی ذمہ داری معرفت اور شناخت ہے۔کیونکہ اس دنیا کے حقائق اور اسرار سے پردہ اٹھانے کا ذریعہ (آلہ) عقل ہی ہے اگرچہ اہل تصوف اسکے مخالف ہیں اور وہ عقل کی معرفت اور

---

(۱)بحارالانوار ج۱ص۱۰۶۔

شناخت کے قائل ہی نہیں ہیں انکا کہنا ہے کہ اس دنیا کے حقائق اور خداوند عالم اور اسی طرح غیب کی معرفت کے بارے میں عقل کا کوئی دخل نہیں ہوتا ہے۔ جبکہ اسلام عقل کی قوت تشخیص کا قائل ہے اور وہ اسے علم و معرفت کا ایک آلہ قرار دیتا ہے اور دنیا کے مادی یا غیر مادی تمام مقامات پر یا اس دنیا کے خالق یا واجبات اور محرمات جیسے تمام مسائل میں اس کی مزید تائید کرتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سلسلہ میں یہ ارشاد فرمایا ہے:

﴿إنمایدرك الخیر كله فی العقل﴾(۱)

''ہر خیر کو عقل میں تلاش کیا جاسکتا ہے''

آپ ہی کا یہ ارشاد بھی ہے:

﴿استرشدوا العقل ترشدوا ولا تعصوه فتندموا﴾(۲)

''عقل سے رہنمائی حاصل کرو تو راستہ مل جائے گا اور اسکی نافرمانی نہ کرنا ورنہ شرمندگی اٹھانا پڑے گی''

حضرت علیؑ :

﴿العقل أصل العلم وداعیة الفهم﴾(۳)

''عقل، علم کی بنیاد اور فہم (غور وفکر) کی طرف دعوت دینے والی ہے''

امام جعفر صادقؑ :

﴿العقل دلیل المؤمن﴾(۴)

---

(۱) تحف العقول ص ۵۴۔ بحار الانوار ج ۷۷ ص ۱۵۸۔

(۲) اصول کافی ج ۱ ص ۲۵۔

(۳) غرر الحکم ج ۱ ص ۱۰۲۔

(۴) اصول کافی ج ۱ ص ۲۵۔

"عقل مومن کی رہنما ہے"

دنیا کے حقائق اور اسرار و رموز کی معرفت کیلئے عقل کی قدر و قیمت اور اہمیت کیا ہے؟ اسکو روایات میں یوں بیان کیا گیا ہے: "خداوند عالم اپنے بندوں پر عقل کے ذریعہ ہی احتجاج (دلیل) پیش کریگا اور اسی کے مطابق ان کو جزا یا سزا دی جائیگی" اس مختصر سے جملہ کے ذریعہ انسانی زندگی میں عقل کی قدر و قیمت اور دین خدا میں اسکی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

امام موسیٰ کاظمؑ:

﴿أن لله علىٰ الناس حجتين حجة ظاهرة و حجة باطنة،فأما الظاهرة فالرسل والانبياء والائمة(ع)،و أما الباطنة فالعقول﴾(۱)

"بندوں پر خداوند عالم کی دو حجتیں (دلیلیں) ہیں ایک کھلی ہوئی اور ظاہر ہے اور دوسری پوشیدہ ہے ظاہری حجت اسکے رسول، انبیاء اور ائمہ ہیں اور پوشیدہ حجت کا نام عقل ہے"

آپ ہی کا یہ ارشاد گرامی ہے:

﴿ان الله عزوجل أكمل للناس الحجج بالعقول،و أفضىٰ إليهم بالبيان،و دلّهم علىٰ ربوبيته بالادلة﴾(۲)

"خداوند عالم نے عقلوں کے ذریعہ لوگوں پر اپنی سب حجتیں تمام کر دی ہیں اور بیان سے ان کی وضاحت فرمادی اور دلیلوں کے ذریعہ اپنی ربوبیت کی طرف ان کی رہنمائی کر دی ہے"

لہٰذا عقل، انسان کے اوپر خداوند عالم کی حجت اور دلیل ہے جسکے ذریعہ وہ اپنے بندوں کا فیصلہ کرتا ہے اور اگر فہم و ادراک کی اسی صلاحیت کی بناء پر اسلام نے عقل کو اس اہمیت اور عظمت سے

---

(۱) بحار الانوار ج ۱ ص ۱۳۷۔

(۲) بحار الانوار ج ۱ ص ۱۳۲۔

نوازا ہوتا تو وہ کبھی بھی حجت اور دلیل نہیں بن سکتی تھی اور اسکے مطابق فیصلہ ممکن نہیں تھا۔

یہی وجہ ہے کہ روایات میں آیا ہے کہ خداوند عالم عقل کے مطابق ہی جزا یا سزا دیگا۔

۲۔ اطاعت خدا

جب فہم وادراک اور نظری معرفت کے میدان میں عقل کی اس قدر اہمیت ہے۔۔۔ تو اسی نظری معرفت کے نتیجہ میں عملی معرفت پیدا ہوتی ہے جسکی بنا پر انسان کیلئے کچھ واجبات کی ادائگی اور محرمات سے پرہیز واجب ہوجاتا ہے۔

چنانچہ جس نظری معرفت کے نتیجہ میں عملی معرفت پیدا ہوتی ہے اسکا مطلب یہ ہے کہ انسان خداوند عالم کے مقام ربوبیت والوہیت کو پہچان لے اور اس طرح اسکی عبودیت اور بندگی کے مقام کی معرفت بھی پیدا کرلے اور جب انسان یہ معرفت حاصل کرلیتا ہے تو اس پر خداوند عالم کے احکام کی اطاعت وفرمانبرداری واجب ہوجاتی ہے۔

یہ معرفت، عقل کے خصوصیات میں سے ایک ہے اور یہی وہ معرفت ہے جو انسان کو خدا کے اوامر کی اطاعت اور نواہی سے پرہیز (واجبات ومحرمات) کا ذمہ دار اور انکی ادائگی یا مخالفت کی صورت میں جزاوسزا کا مستحق قرار دیتی ہے اور اگر معرفت نظری کے بعد یہ معرفت عملی نہ پائی جائے تو پھر انسان کے اوپر اوامر اور نواہی الٰہیہ نافذ (لاگو) نہیں ہوسکتے یعنی نہ اسکے اوپر کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور نہ ہی اسکو جزا اور سزا کا مستحق قرار دیا جاسکتا ہے۔

اسی بیان کی طرف مندرجہ ذیل روایات میں اشارہ موجود ہے:

امام محمد باقرؑ نے فرمایا ہے:

﴿لماخلق الله العقل استنطقه ثم قال له أقبل فأقبل،ثم قال له أدبر فأدبر،ثم قال له:وعزّتي وجلالي ماخلقت خلقاً هوأحب إليّ منك،ولااكملتك الافيمن

احب. أما إنی إیّاك آمرو إیّاك أنهیٰ و إیّاك أعاقب و إیّاك أثیب﴾(۱)

''یعنی جب پروردگار عالم نے عقل کو خلق فرمایا تو اسے گویا ہونے کا حکم دیا پھر اس سے فرمایا سامنے آ، تو وہ سامنے آ گئی اسکے بعد فرمایا پیچھے ہٹ جا تو وہ پیچھے ہٹ گئی تو پروردگار نے اس سے فرمایا کہ میری عزت وجلالت کی قسم میں نے تجھ سے زیادہ اپنی محبوب کوئی اور مخلوق پیدا نہیں کی ہے اور میں تجھے اسکے اندر کامل کرونگا جس سے مجھے محبت ہوگی۔ یاد رکھ کہ میں صرف اور صرف تیرے ہی مطابق کوئی حکم دونگا اور تیرے ہی مطابق کسی چیز سے منع کرونگا اور صرف تیرے مطابق عذاب کرونگا اور تیرے ہی اعتبار سے ثواب دونگا''

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

﴿لما خلق الله عزوجل العقل قال له ادبر فادبر، ثم قال اقبل فاقبل، فقال وعزتی وجلالی ما خلقت خلقاً احسن منك، إیّاك آمرو إیّاك انهی، إیّاك أثیب و إیّاك أعاقب﴾(۲)

''جب اللہ تعالی نے عقل کو پیدا کیا تو اس سے فرمایا واپس پلٹ جا تو وہ واپس پلٹ گئی اسکے بعد فرمایا سامنے آ، تو وہ آ گئی تو ارشاد فرمایا کہ میری عزت وجلالت کی قسم: میں نے تجھ سے زیادہ حسین وجمیل کوئی مخلوق پیدا نہیں کی ہے لہٰذا صرف اور صرف تیرے ہی مطابق امرونہی کرونگا اور صرف اور صرف تیرے ہی مطابق ثواب یا عذاب دونگا''

بعینہ یہی مضمون دوسری روایات میں بھی موجود ہے۔(۳)

ان روایات میں اس بات کی طرف کنایہ واشارہ پایا جاتا ہے کہ عقل، خداوند عالم کی مطیع

---

(۱) اصول کافی ج۱ص۱۰۔

(۲) بحار الانوار ج۱ص۹۶۔

(۳) بحار الانوار ج۱ص۹۷۔

Presented by: www.jafrilibrary.com

وفرمانبردار مخلوق ہے کہ جب اسے حکم دیا گیا کہ سامنے آ، تو سامنے آ گئی اور جب کہا گیا کہ واپس پلٹ جا تو وہ واپس پلٹ گئی۔

روایات میں اس طرح کے اشارے اور کنائے ایک عام بات ہے۔

علم وعمل کے درمیان رابطہ کے بارے میں حضرت علیؑ کا یہ ارشاد ہے:

﴿العاقل اذا علم عمل، واذا عمل اخلص﴾(۱)

''عاقل جب کوئی چیز جان لیتا ہے تو اس پر عمل کرتا ہے اور جب عمل کرتا ہے تو اسکی نیت خالص رہتی ہے''

اللہ تعالیٰ کی اطاعت وبندگی اور اسکے احکامات کی فرمانبرداری میں عقل کیا کردار ادا کرتی ہے اسکے بارے میں اسلامی کتابوں میں روایات موجود ہیں جنمیں سے ہم نمونے کے طور پر صرف چند روایات ذکر کررہے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

﴿العاقل من أطاع اللہ﴾(۲)

''عاقل وہ ہے جو خدا کا فرمانبردار ہو''

روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ عقل کیا ہے؟

قال: ﴿العمل بطاعة اللہ، ان العمال بطاعة اللہ هم العقلاء﴾

''فرمایا: حکم خدا کے مطابق عمل کرنا، بیشک اطاعت خدا کے مطابق چلنے والے ہی صاحبان عقل ہیں''(۳)

---

(۱) غرر الحکم ج۱ص ۱۰۱۔

(۲) بحار الانوار ج۱ص ۱۶۰۔

(۳) بحار الانوار ج۱ص ۱۳۱۔

امام جعفر صادقؑ سے سوال کیا گیا کہ عقل کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

''جس سے خداوند عالم (رحمٰن) کی عبادت کی جائے اور جنت حاصل کی جائے'' راوی کہتا ہے کہ میں نے عرض کیا کہ پھر معاویہ کے اندر کیا تھا؟ فرمایا: وہ چال بازی اور شیطنت تھی''(۱)

حضرت علیؑ: ﴿اعقلکم اطوعکم﴾(۲)

''سب سے بڑا عاقل وہ ہے جو سب سے زیادہ اطاعت گذار ہو''

امام جعفر صادقؑ:

﴿العاقل من کان ذلولاً عند اجابة الحق﴾(۳)

''عاقل وہ ہے جو دعوت حق کو لبیک کہتے وقت اپنے کو سب سے زیادہ ذلیل سمجھے''

۳۔ خواہشات کے مقابلہ کے لئے صبر و تحمل (خواہشات کا دفاع)

یہ وہ تیسری فضیلت ہے جس سے خداوند عالم نے انسانی عقل کو نوازا ہے۔ اور یہ عقل کی ایک بنیادی اور دشوار گذار نیز اہم ذمہ داری ہے جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ اسکی یہ ذمہ داری اطاعت الٰہی کا ہی ایک دوسرا رخ تصور کی جاتی ہے بلکہ درحقیقت (واجبات پر عمل اور محرمات سے پرہیز) ہی اطاعت خدا کے مصداق ہیں اور ان کے درمیان صرف اتنا فرق ہے کہ پہلی صورت میں واجبات پر عمل کر کے اسکی اطاعت کی جاتی ہے اور دوسری صورت میں اسکی حرام کردہ چیزوں سے پرہیز کر کے خواہشات سے اپنے نفس کو روک کر اور ان پر صبر کر کے اسکی فرمانبرداری کیجاتی ہے اس بنا پر عقل کی یہ ذمہ داری اور ڈیوٹی ہے کہ وہ خواہشات نفس کو اپنے قابو میں رکھے اور انھیں اس طرح اپنے ماتحت رکھے کہ وہ کبھی اپنا سر نہ اٹھا سکیں۔

---

(۱) بحار الانوار ج ۱ ص ۱۱۶۔

(۲) غرر الحکم ج ۱ ص ۱۷۹۔

(۳) بحار الانوار ج ۱ ص ۱۳۰۔

خواہشات نفس کو کنٹرول کرنے کے بارے میں عقل کی اس ڈیوٹی کے سلسلہ میں بیحد تاکید کی گئی ہے۔نمونہ کے طور پر حضرت علیؑ کے مندرجہ ذیل اقوال حاضر خدمت ہیں:

☆ ﴿العقل حسام قاطع﴾(۱)

"عقل (خواہشات کو) کاٹ دینے والی تیز شمشیر ہے"

☆ ﴿قاتل هواك بعقلك﴾(۲)

"اپنی عقل کے ذریعہ اپنی خواہشات سے جنگ کرو"

☆ ﴿للنفوس خواطر للهویٰ،والعقول تزجر وتنهیٰ﴾(۳)

"نفس کے اندر ہوی وہوس کی بنا پر مختلف حالات پیدا ہوتے رہتے ہیں اور عقل ان سے منع کرتی ہے"

☆ ﴿للقلوب خواطر سوء والعقول تزجر منها﴾(۴)

"دلوں پر برے خیالات کا گذر ہوتا ہے تو عقل ان سے روکتی ہے"

☆ ﴿العاقل من غلب هواه،ولم یبع آخرته بدنیاه﴾(۵)

"عاقل وہ ہے جو اپنی خواہش کا مالک ہو اور اپنی آخرت کو اپنی دنیا کے عوض فروخت نہ کرے"

☆ ﴿العاقل من هجر شهوته،وباع دنیاه بآخرته﴾(۶)

"عاقل وہ ہے جو اپنی شہوت سے بالکل دور ہو جائے اور اپنی دنیا کو اپنی آخرت کے عوض

---

(۱) نہج البلاغہ۔

(۲) گذشتہ حوالہ۔

(۳) تحف العقول ص ۹۶۔

(۴) غرر الحکم ج ۲ ص ۱۲۱۔

(۵) غرر الحکم ج ۱ ص ۱۰۴۔

(۶) غرر الحکم ج ۱ ص ۸۶۔

فروخت کرڈالے"

☆ ﴿العاقل عدو لذته و الجاهل عبد شهوته﴾(۱)

"عاقل اپنی لذتوں کا دشمن ہوتا ہے اور جاہل اپنی شہوت کا غلام ہوتا ہے"

☆ ﴿العاقل من عصیٰ هواه فی طاعة ربه﴾(۲)

"عاقل وہ ہے جو اطاعت الٰہی کے لئے اپنی خواہش نفس (ہوس) کی مخالفت کرے"

☆ ﴿العاقل من غلب نوازع أهويته﴾(۳)

"عاقل وہ ہے جو اپنے خواہشات کی لغزشوں پر غلبہ رکھے"

☆ ﴿العاقل من أمات شهوته، والقوی من قمع لذته﴾(۴)

"عاقل وہ ہے جو اپنی شہوت کو مردہ بنادے اور قوی وہ ہے جو اپنی لذتوں کا قلع قمع کردے"

لہٰذا عقل کے تین مرحلے ہیں:

۱۔معرفت خدا

۲۔واجبات میں اسکی اطاعت

۳۔جن خواہشات نفس اور محرمات سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے ان سے پرہیز کرنا۔

اس باب (بحث) میں ہماری منظور نظر عقل کا یہی تیسرا کردار ہے یعنی اس میں ہم خواہشات کے مقابلہ کا طریقہ ان پر قابو حاصل کرنے نیز انھیں کنٹرول کرنے کے طریقے بیان کرینگے۔لہٰذا اب آپ نفس کے اندر عقل اور خواہشات کے درمیان موجود خلفشار اور کشمکش کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

---

(۱)غرر الحکم ج۱ص ۲۸۔

(۲)غرر الحکم ج۲ص ۸۷۔

(۳)غرر الحکم ج۲ص ۱۲۰۔

(۴)غرر الحکم ج۲ص ۵۸۔

عقل اور خواہشات کی کشمکش اور انسان کی آخری منزل کی نشاندہی

عقل اور خواہشات کے درمیان جو جنگ بھڑکتی ہے اس سے انسان کے آخری انجام کی نشاندہی ہو جاتی ہے کہ وہ سعادت مند ہونے والا ہے یا بد بخت؟

یعنی نفس کی اندرونی جنگ دنیا کے تمام لوگوں کو دو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر دیتی ہے:

۱۔ متقی

۲۔ فاسق و فاجر

اس طرح بشری عادات و کردار کی بھی دو قسمیں ہیں:

۱۔ تقویٰ و پرہیز گاری (نیک کردار)

۲۔ فسق و فجور (بد کردار)

تقویٰ یعنی خواہشات کے اوپر عقل کی حکومت اور فسق و فجور اور بد کرداری یعنی عقل کے اوپر خواہشات کا اندھا راج، لہٰذا اسی دوراہے سے ہر انسان کی سعادت یا بد بختی کے راستے شمال و جنوب کے راستوں کی طرح ایک دوسرے سے بالکل جدا ہو جاتے ہیں اور اصحاب یمین (نیک افراد) اور اصحاب شمال (یعنی برے لوگوں) کے درمیان یہ جدائی بالکل حقیقی اور جوہری جدائی ہے جس میں کسی طرح کا اتصال ممکن نہیں ہے۔ اور یہ جدائی اسی دوراہے سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ کچھ لوگ اپنی خواہشات پر اپنی عقل کو حاکم رکھتے ہیں لہٰذا وہ متقی، صالح اور نیک کردار بن جاتے ہیں اور کچھ اپنی عقل کی باگ ڈور اپنی خواہشات کے حوالہ کر دیتے ہیں لہٰذا وہ فاسق و فاجر بن جاتے ہیں اس طرح اہل دنیا دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں کچھ کا راستہ خدا تک پہنچتا

ہے اور کچھ جہنم کی آگ کی تہوں میں پہونچ جاتے ہیں۔

امیر المومنینؑ نے اس بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿من غلب عقله هواه افلح،ومن غلب هواه عقله افتضح﴾(۱)

''جس کی عقل اسکی خواہشات پر غالب ہے وہ کامیاب وکامران ہے اور جسکی عقل کے اوپر اسکے خواہشات غلبہ پیدا کرلیں وہ رسوا وذلیل ہوگیا''

آپ نے ہی یہ ارشاد فرمایا ہے:

﴿العقل صاحب جيش الرحمٰن،والهوىٰ قائد جيش الشيطان والنفس متجاذبة بينهما،فأيهمايغلب كانت في حيّزه﴾(۲)

''عقل لشکر رحمٰن کی سپہ سالار ہے اور خواہشات شیطان کے لشکر کی سردار ہیں اور نفس ان دونوں کے درمیان کشمکش اور کھنچاؤ کا شکار رہتا ہے چنانچہ ان میں جو غالب آجاتا ہے نفس اسکے ماتحت رہتا ہے''

اس طرح نفس کے اندر یہ جنگ جاری رہتی ہے اور نفس ان دونوں کے درمیان معلق رہتا ہے جب انمیں سے کوئی ایک اس جنگ کو جیت لیتا ہے تو انسان کا نفس بھی اسکی حکومت کے ماتحت چلا جاتا ہے اب چاہے عقل کامیاب ہوجائے یا خواہشات۔

حضرت علیؑ:

﴿العقل والشهوة ضدان، مؤيد العقل العلم،مزين الشهوة الهوىٰ،والنفس متنازعة بينهما،فأيهما قهر كانت في جانبه﴾(۳)

''عقل اور شہوت ایک دوسرے کی ضد ہیں عقل کا مددگار علم ہے اور شہوت کو زینت بخشنے والی چیز

---

(۱)غرر الحکم ج۲ص ۱۸۷۔

(۲)غرر الحکم ج۱ص ۱۱۳۔

(۳)گذشتہ حوالہ۔

ہوس اور خواہشات ہیں اور نفس ان دونوں کے درمیان متذبذب رہتا ہے چنانچہ انمیں سے جو غالب آجاتا ہے نفس بھی اسی کی طرف ہوجاتا ہے"

یعنی نفس کے بارے میں عقل اور خواہشات کے درمیان ہمیشہ جھگڑا رہتا ہے۔ چنانچہ انمیں سے جو غالب آجاتا ہے انسان کا نفس بھی اسی کا ساتھ دیتا ہے۔

ضعف عقل اور قوت ہوس

شہوت (خواہشات) اور عقل کی وہ بنیادی لڑائی جسکے بعد انسان کی آخری منزل (سعادت وشقاوت) معین ہوتی ہے اس میں خواہشات کا پلڑا عقل کے مقابلہ میں کافی بھاری رہتا ہے جسکی وجہ یہ ہے کہ عقل فہم وادراک کا ایک آلہ ہے جبکہ خواہشات جسم کے اندر انسان کو متحرک بنانے والی ایک مضبوط طاقت ہے۔

اور یہ طے شدہ بات ہے کہ عقل ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھاتی ہے لیکن اس کے باوجود بھی اسکو نفس کی قوت محرکہ نہیں کہا جاتا ہے۔

جبکہ خواہشات کے اندر انسان کو کسی کام پر اکسانے بلکہ بھڑکانے کے لئے اعلیٰ درجہ کی قدرت وطاقت وافر مقدار میں پائی جاتی ہے۔

حضرت علیؑ نے فرمایا:

﴿کم من عقل اسیر عند ھویٰ امیر﴾ (۱)

"کتنی عقلیں خواہشات کے آمرانہ پنجوں میں گرفتار ہیں"

خواہشات انسان کو لالچ اور دھوکہ کے ذریعہ پستیوں کی طرف لیجاتی ہیں اور انسان بھی ان کے ساتھ پھسلتا چلا جاتا ہے۔ جبکہ عقل انسان کو ان چیزوں کی طرف دعوت دیتی ہے جن سے اسے نفرت ہے اور وہ انھیں پسند نہیں کرتا ہے۔

---

(۱) نہج البلاغہ حکمت ۲۱۱

امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں:

﴿اکرہ نفسک علی الفضائل،فان الرذائل انت مطبوع علیھا﴾(۱)

''نیک کام کرنے کے لئے اپنے نفس کے اوپر زور ڈالو، کیونکہ برائیوں کی طرف تو تم خود بخود جاتے ہو''

کیونکہ خواہشات کے مطابق چلتے وقت راستہ بالکل مزاج کے مطابق گویا ڈھلان دار ہوتا ہے لہٰذاوہ اسکے اوپر آسانی پستی کی طرف اترتا چلاجاتا ہے لیکن کمالات اور اچھائیوں میں کیونکہ انسان کارخ بلندیوں کی طرف ہوتا ہے لہٰذا اس صورت میں ہرایک کو زحمت اور مشقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ عقل اور شہوت کے درمیان جوبھی جنگ چھڑتی ہے اس میں شہوتیں اپنے تمام لاؤلشکر اور بھر پور قدرت وطاقت اور اثرات کے ساتھ میدان میں اترتی ہیں اور اسکے سامنے عقل کمزور پڑجاتی ہے۔

اور اکثر اوقات جب عقل اور خواہشات کے درمیان مقابلہ کی نوبت آتی ہے تو عقل کو ہتھیار ڈالنا پڑتے ہیں کیونکہ وہ اسکے اوپر اس طرح حاوی ہوجاتی ہیں کہ اسکو میدان چھوڑنے پر مجبور کردیتی ہیں اور اسکا پورا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لیکر اسے بالکل لاچار بنادیتی ہیں۔

عقل کے لشکر

پروردگار عالم نے انسان کے اندر ایک مجموعہ کے تحت کچھ ایسی قوتیں، اسباب اور ذرائع جمع کردئے ہیں جو مشکل مرحلوں میں عقل کی امداد اور پشت پناہی کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور نفس کے اندر یہ خیر وبرکت کا مجموعہ انسان کی فطرت، ضمیر اور نیک جذبات (عواطف) کے عین مطابق ہے اور اس مجموعہ میں خواہشات کے مقابلہ میں انسان کو تحریک کرنے کی تمام صلاحیتیں پائی جاتی ہیں

---

(۱)مستدرک وسائل الشیعہ ج۲ص ۳۱۰۔

اور یہ خواہشات اور ہوس کو روکنے اور ان پر قابو پانے اور خاص طور سے ہوی وہوس کو کچلنے کے لئے عقل کی معاون ثابت ہوتی ہیں۔

کیونکہ (جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ) عقل تو فہم وادراک اور علم ومعرفت کا ایک آلہ ہے۔ جو انسان کو چیزوں کی صحیح تشخیص اور افہام وتفہیم کی قوت عطا کرتا ہے اور تنہا اسکے اندر خواہشات کے سیلاب کو روکنے کی صلاحیت نہیں پائی جاتی ہے۔ لہٰذا ایسے مواقع پر عقل خواہشات کو کنٹرول کرنے اور ان پر قابو پانے کے لئے ان اسباب اور ذرائع کا سہارا لیتی ہے جو خداوند عالم نے انسان کے نفس کے اندر ودیعت کئے ہیں اور اس طرح عقل کیلئے خواہشات کا مقابلہ اور انکا دفاع کرنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے لہٰذا ان اسباب کے پورے مجموعہ کو اسلامی اخلاقیات اور تہذیب وتمدن کی زبان میں عقل کے لشکروں کا نام دیا گیا ہے۔ جو ہر اعتبار سے ایک اسم با مسمّٰی ہے۔

نمونہ کے طور پر اسکی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

کبھی کبھی انسان مال ودولت کی محبت کے جذبہ کے دباؤ میں آ کر غلط اور ناجائز راستوں سے دولت اکٹھا کرنے لگتا ہے۔ کیونکہ ہر انسان کے اندر کسی نہ کسی حد تک مال ودولت کی محبت پائی جاتی ہے مگر بسا اوقات وہ اس میں افراط سے کام لیتا ہے۔ ایسے مواقع پر انسانی عقل ہر نفس کے اندر موجود "عزت نفس" کے ذخیرہ سے امداد حاصل کرتی ہے چنانچہ جہاں توہین اور ذلت کا اندیشہ ہوتا ہے عزت نفس اسے وہاں سے دولت حاصل کرنے سے روک دیتی ہے اگر چہ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ جس جگہ بھی توہین اور ذلت کا خطرہ ہوتا ہے عقل اسکو اس سے اچھی طرح آگاہ کر دیتی ہے لیکن پھر بھی ایسے مواقع پر مال ودولت سمیٹنے سے روکنے کے لئے عقل کی رہنمائی تنہا کافی نہیں ہے بلکہ اسے عزت نفس کا تعاون درکار رہتا ہے جسکو حاصل کر کے وہ حب مال کی ہوس اور جذبہ کا مقابلہ کرتی ہے۔

۲۔ جنسی خواہشات انسان کے اندر سب سے زیادہ قوی خواہشات ہوتی ہیں اور ان کے

دباؤ کے بعد انسان اپنی جنسی جذبات کی تسلی کے لئے طرح طرح کے غلط اور حرام راستوں پر دوڑتا چلا جاتا ہے اور اس میں بھی کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ ایسے اکثر حالات میں عقل جنسی بے راہ روی کے غلط مقامات کا بخوبی مقابلہ نہیں کر پاتی اور اسے صحیح الفطرت انسان کے نفس کے اندر موجود ایک اور فطری طاقت یعنی عفت نفس (پاک دامنی) کی مدد حاصل کرنا پڑتی ہے۔ چنانچہ جب انسان کے سامنے اس کی عفت اور پاکدامنی کا سوال پیدا ہو جاتا ہے تو پھر وہ اس بری حرکت سے رک جاتا ہے۔

۳۔ کبھی کبھی انسان کے اندر سر بلندی، انانیت اور غرور وتکبر کا اتنا مادہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے سامنے دوسروں کو بالکل ذلیل اور پست سمجھنے لگتا ہے اور یہ ایک ایسی صفت ہے جس کو عقل ہر اعتبار سے برا سمجھتی ہے اسکے باوجود جب تک عقل، نفس کے اندر خداوند عالم کی ودیعت کردہ قوت تواضع سے امداد حاصل نہ کرے وہ اس غرور وتکبر کا مقابلہ نہیں کرسکتی ہے۔

۴۔ کبھی کبھی انسان اپنے نفس کے اندر موجود ایک طاقت یعنی غیظ وغضب اور غصہ کا شکار ہو جاتا ہے جسکے نتیجہ میں وہ دوسروں کی توہین اور بے عزتی کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ یہ کام عقل کی نگاہ بابصیرت میں کتنا ہی قبیح اور برا کیوں نہ ہو اسکے باوجود عقل صرف اور صرف اپنے بل بوتے پر انسان کے ہوش وحواس چھین لینے والی اس طاقت کا مقابلہ کرنے سے معذور ہے لہٰذا ایسے مواقع پر عقل، عام طور سے انسان کے اندر موجود، رحم وکرم کی فطری قوت وطاقت کو سہارا بناتی ہے۔ کیونکہ اس صفت (رحم وکرم) میں غصہ کے برابر یا بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی قوت اور صلاحیت پائی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ انسان غصہ کی بنا پر کوئی جرم کرنا چاہتا ہے تو رحم وکرم کی مضبوط زنجیریں اسکے ہاتھوں کو جکڑ لیتی ہیں۔

۵۔ اسی طرح انسان اپنی کسی اور خواہش کے اشارہ پر چلتا ہوا خداوند عالم کی معصیت اور گناہ کے راستوں پر چلنے لگتا ہے تب عقل اسکو ''خوف الٰہی'' کے سہارے اس گناہ سے بچالیتی ہے۔

اس قسم کی اور بے شمار مثالیں موجود ہیں جن میں سے مذکورہ مثالیں ہم نے صرف وضاحت کے لئے بطور نمونہ پیش کردی ہیں ان کے علاوہ کسی وضاحت کے بغیر کچھ اور مثالیں ملاحظہ فرمالیں۔

جیسے نمک حرامی کے مقابلہ میں شکر نعمت، بغض و حسد کے مقابلہ کے لئے پیار ومحبت اور مایوسی کے مقابلہ میں رجاء وامید کی مدد حاصل کرتی ہے۔

لشکر عقل سے متعلق روایات

معصومین کی احادیث میں نفس کے اندر موجود پچھتر صفات کو عقل کا لشکر کہا گیا ہے جن کا کام یہ ہے کہ یہ ان دوسری پچھتر صفات کا مقابلہ کرتی ہیں جنھیں خواہشات اور ہوس یا حدیث کے مطابق جہل کا لشکر کہا جاتا ہے۔

چنانچہ نفس کے اندر یہ دونوں متضاد صفتیں درحقیقت نفس کے دو اندرونی جنگی محاذوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جن میں ایک محاذ پر عقل کی فوجوں اور دوسری جانب جہل یا خواہشات کے لشکروں کے درمیان مسلسل جنگ کے شعلے بھڑکتے رہتے ہیں۔

علامہ مجلسی (رح) نے اپنی کتاب بحارالانوار کی پہلی جلد میں اس سے متعلق امام جعفر صادق اور امام موسیٰ کاظم سے بعض روایات نقل کی ہیں جن کو ہم ان کی سند کے ساتھ ذکر کر رہے ہیں تا کہ آئندہ ان کی وضاحت میں آسانی رہے۔

پہلی روایت

سعد اور حمیری دونوں نے برقی سے انھوں نے علی بن حدید سے انھوں نے سماعہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ: میں امام جعفر صادق کی خدمت موجود تھا اور اس وقت آپ کی خدمت میں کچھ آپ کے چاہنے والے بھی حاضر تھے عقل اور جہل کا تذکرہ درمیان میں آ گیا تو امام جعفر صادق نے ارشاد فرمایا کہ: عقل اور اسکے لشکر کو اور جہل اور اسکے لشکر کو پہچان لو تو ہدایت پا جاؤ گے۔ سماعہ کہتے ہیں کہ: میں نے عرض کی میں آپ پر قربان، جتنا آپ نے ہمیں سکھا دیا ہے ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں تو امام جعفر صادق نے فرمایا کہ خداوند عالم نے اپنی روحانی مخلوقات میں اپنے نور

کے عرش کے دائیں حصہ سے جس مخلوق کو سب سے پہلے پیدا کیا ہے وہ عقل ہے۔ پھر اس سے فرمایا سامنے آ: تو وہ سامنے حاضر ہوگئی پھر ارشاد فرمایا: واپس پلٹ جا تو وہ واپس پلٹ گئی، تو ارشاد الٰہی ہوا، میں نے تجھے عظیم خلقت سے نوازا ہے اور تجھے اپنی تمام مخلوقات پر شرف بخشا ہے پھر آپ نے فرمایا: کہ پھر خداوند عالم نے جہل کو ظلمتوں کے کھاری سمندر سے پیدا کیا اور اس سے فرمایا کہ پلٹ جا تو وہ پلٹ گیا پھر فرمایا: سامنے آ: تو اس نے اطاعت نہیں کی تو خداوند عالم نے اس سے فرمایا: تو نے غرور و تکبر سے کام لیا ہے؟ پھر (خدا نے) اس پر لعنت فرمائی۔ اسکے بعد عقل کے پچھتر لشکر قرار دئے جب جہل نے عقل کے لئے یہ عزت و تکریم اور عطا دیکھی تو اسکے اندر عقل کی دشمنی پیدا ہوگئی تو اس نے عرض کی اے میرے پروردگار، یہ بھی میری طرح ایک مخلوق ہے جسے تو نے پیدا کر کے عزت اور طاقت سے نوازا ہے۔ اور میں اسکی ضد ہوں جبکہ میرے پاس کوئی طاقت نہیں ہے لہٰذا جیسی فوج تو نے اسے دی ہے مجھے بھی ایسی ہی زبردست فوج عنایت فرما۔ تو ارشاد الٰہی ہوا: بالکل (عطا کرونگا) لیکن اگر اسکے بعد تو نے میری نافرمانی کی تو میں تجھے تیرے لشکر سمیت اپنی رحمت سے باہر نکال دونگا اس نے کہا مجھے منظور ہے تو خداوند عالم نے اسے بھی پچھتر لشکر عنایت فرمائے۔ چنانچہ عقل اور جہل کو جو الگ الگ پچھتر لشکر عنایت کئے گئے انکی تفصیل یہ ہے:

خیر، عقل کا وزیر ہے اور اسکی ضد شر کو قرار دیا جو جہل کا وزیر ہے۔

ایمان کی ضد کفر

تصدیق کی ضد انکار

رجاء (امید) کی ضد مایوسی

عدل کی ضد ظلم و جور

رضا (خشنودی) کی ضد ناراضگی

شکر کی ضد کفران (ناشکری)

لالچ کی ضد یاس

توکل کی ضد حرص

رافت کی ضد غلظت؟

رحمت کی ضد غضب

علم کی ضد جہل

فہم کی ضد حماقت

عفت کی ضد بے غیرتی

زہد کی ضد رغبت (دلچسپی)

قرابت کی ضد جدائی

خوف کی ضد جرائت

تواضع کی ضد تکبر

محبت کی ضد تسرع (جلد بازی)؟

علم کی ضد سفاہت

خاموشی کی ضد بکواس

سرسپردگی کی ضد استکبار

تسلیم (کسی کے سامنے تسلیم ہونا) کی ضد سرکشی

عفو کی ضد کینہ

نرمی کی ضد سختی

یقین کی ضد شک

صبر کی ضد جزع فزع (بے صبری کا اظہار کرنا)

خطا پر چشم پوشی (صفح) کی ضد انتقام

غنیٰ کی ضد فقر

تفکر کی ضد سہو

حافظہ کی ضد نسیان

عطوفت کی ضد قطع (تعلق)

قناعت کی ضد حرص

مواسات کی ضد محروم کرنا (کسی کا حق روکنا)

مودت کی ضد عداوت

وفا کی ضد غداری

اطاعت کی ضد معصیت

خضوع کی ضد اظہار سر بلندی

سلامتی کا ضد بلاء

حب کی ضد بغض

صدق کی ضد کذب

حق کی ضد باطل

امانت کی ضد خیانت

اخلاص کی ضد ملاوٹ

ذکاوت کی ضد کند ذہنی

فہم کی ضد ناسمجھی

معرفت کی ضد انکار

مدارات کی ضد رسوا کرنا

سلامت کی ضد غیب

کتمان کی ضد افشا (ظاہر کر دینا)

نماز کی ضد اسے ضائع کرنا

روزہ کی ضد افطار

جہاد کی ضد بزدلی (دشمن سے پیچھے ہٹ جانا)

حج کی ضد عہد شکنی

رازداری کی ضد فاش کرنا

والدین کے ساتھ نیکی کی ضد عاق والدین

حقیقت کی ضد ریا

معروف کی ضد منکر

ستر (پوشش) کی ضد برہنگی

تقیہ کی ضد ظاہر کرنا

انصاف کی ضد حمیت

ہوشیاری کی ضد بغاوت

صفائی کی ضد گندگی

حیاء کی ضد بے حیائی

قصد (استقامت) کی ضد عدوان

راحت کی ضد تعب (تھکن)

آسانی کی ضد مشکل

برکت کی ضد بے برکتی

عافیت کی ضد بلا

اعتدال کی ضد کثرت طلبی

حکمت کی ضد خواہش نفس

وقار کی ضد ہلکا پن

سعادت کی ضد شقاوت

توبہ کی ضد اصرار (بر گناہ)

استغفار کی ضد اغترار (دھوکہ میں مبتلا رہنا)

احساس ذمہ داری کی ضد لا پرواہی

دعا کی ضد یعنی غرور وتکبر کا اظہار

نشاط کی ضد سستی

فرح (خوشی) کی ضد حزن

الفت کی ضد فرقت (جدائی)

سخاوت کی ضد بخل

پس عقل کے لشکروں کی یہ ساری صفتیں صرف نبی یا نبی کے وصی یا اسی بندۂ مومن میں ہی جمع ہوسکتی ہیں جس کے قلب کا اللہ نے ایمان کے لئے امتحان لے لیا ہو! البتہ ہمارے بقیہ چاہنے والوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جسمیں ان لشکروں کی بعض صفتیں نہ پائی جائیں یہاں تک کہ جب وہ انہیں اپنے اندر کامل کر لے اور جہل کے لشکر سے چھٹکارا پالے تو وہ بھی انبیاء اور اوصیاء کے اعلیٰ درجہ میں پہونچ جائے گا۔ بلا شبہ کامیابی عقل اور اسکے لشکر کی معرفت اور جہل نیز اس کے لشکر سے دوری کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ خداوند عالم ہمیں اور خصوصیت سے تم

لوگوں کو اپنی اطاعت اور رضا کی توفیق عطا فرمائے۔(۱)

دوسری روایت

ہشام بن حکم نے یہ روایت امام موسیٰ کاظمؑ سے نقل کی ہے اور شیخ کلینی (رہ) نے اسے اصول کافی میں تحریر کیا ہے اور اسی سے علامہ مجلسی (رہ) نے اپنی کتاب بحار الانوار میں نقل کیا ہے۔(۲)

یہ روایت چونکہ کچھ طویل ہے لہٰذا ہم صرف بقدر ضرورت اسکا اقتباس پیش کر رہے ہیں:

امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا: اے ہشام عقل اور اسکے لشکروں کو اور جہل اور اسکے لشکروں کو پہچان لو اور ہدایت یافتہ لوگوں میں سے ہو جاؤ: ہشام نے عرض کی ہمیں تو صرف وہی معلوم ہے جو آپ نے سکھا دیا ہے تو آپ نے فرمایا: اے ہشام بیشک خداوند عالم نے عقل کو پیدا کیا ہے اور اللہ کی سب سے پہلی مخلوق ہے۔۔۔ پھر عقل کے لئے پچھتر لشکر قرار دئے چنانچہ عقل کو جو پچھتر لشکر دئے گئے وہ یہ ہیں:

خیر، عقل کا وزیر اور شر، جہل کا وزیر ہے

ایمان، کفر

تصدیق، تکذیب

اخلاص، نفاق

رجاء، ناامیدی

عدل، جور

خوشی، ناراضگی

---

(۱) بحار الانوار ج۱ص ۱۰۹۔۱۱۱ کتاب العقل والجہل۔

(۲) اصول کافی جلد۱ص ۱۳۔۲۳، بحار الانوار جلد۱ص ۱۵۹۔

شکر، کفران (ناشکری)

طمع رحمت، رحمت سے مایوسی

توکل، حرص

نرم دلی، قساوت قلب

علم، جہل

عفت، بے حیائی

زہد، دنیا پرستی

خوش اخلاقی، بداخلاقی

خوف، جرائت

تواضع، کبر

صبر، جلد بازی

ہوشیاری، بے وقوفی

خاموشی، حذر

سرسپردگی، استکبار

تسلیم، اظہار سربلندی

عفو، کینہ

رحمت، سختی

یقین، شک

صبر، بے صبری (جزع)

عفو، انتقام

استغنا (مالداری)، فقر

تفکر، سہو

حفظ، نسیان

صلہ رحم، قطع تعلق

قناعت، بے انتہا لالچ

مواسات، نہ دینا (منع)

مودت، عداوت

وفاداری، غداری

اطاعت، معصیت

خضوع، اظہار سربلندی

صحت، (سلامتی) بلاء

فہم، غبی ہونا (کم سمجھی)

معرفت، انکار

مدارات، رسوا کرنا

سلامۃ الغیب، حیلہ وفریب

کتمان (حفظ راز)، افشاء

والدین کے ساتھ حسن سلوک، عاق ہونا

حقیقت، ریا

معروف، منکر

تقیہ، ظاہر کرنا

انصاف، ظلم

خود سے دور کرنا، حسد

صفائی، گندگی

حیاء، وقاحت

میانہ روی، اسراف

راحت و آسانی، زحمت (تھکن)

سہولت، مشکل

عافیت، بلا

اعتدال، کثرت طلبی

حکمت، ہوئی

وقار، ہلکا پن

سعادت، شقاوت

توبہ، اصرار بر گناہ

اصرار، خوف

دعا، غرور وتکبر کی بنا پر (دعا سے) دور رہنا

نشاط، سستی

خوشی، حزن

الفت، جدائی

سخاوت، بخل

خشوع، عجب

سچائی، چغلخوری

استغفار، اغترار (دھوکہ میں مبتلا رہنا)

زیرکی، حماقت

اے ہشام! یہ خصلتیں صرف اور صرف کسی نبی یا وصی اور یا اس بندۂ مومن کے دل میں ہی جمع ہو سکتی ہیں جس کے قلب کو خداوند عالم نے ایمان کے لئے آزما لیا ہو لیکن دوسرے تمام مومنین میں کوئی ایسا نہیں ہے جس میں عقل کے لشکروں کے بعض صفات نہ پائے جاتے ہوں اور اگر وہ اپنی عقل کو کامل کر لے اور جہل کے لشکروں سے چھٹکارا حاصل کر لے تو پھر وہ بھی انبیاء اور اوصیائے الٰہی کے درجہ میں پہونچ جائے گا اللہ ہم اور تم کو بھی اپنی اطاعت کی توفیق عنایت فرمائے۔

روایت کی مختصر وضاحت:

عقل وجہل کی مذکورہ روایات میں متعدد غور طلب نکات پائے جاتے ہیں جن میں سے بعض نکات کی وضاحت کی جا رہی ہے۔

۱۔ ان روایات کو دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن واحادیث کی طرح ان روایات میں بھی کنایہ دار اور رمزیہ زبان استعمال ہوئی ہے خاص طور سے انسان کی خلقت کے بارے میں کنایات واشارات کا پہلو بہت ہی زیادہ روشن ہے لہٰذا روایات اور ان کے معانی ومفاہیم کو سمجھنے کے لئے حدیث فہمی کے ذوق سلیم کی ضرورت ہے۔

۲۔ دونوں روایات سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب خداوند عالم نے واپس پلٹنے (ادبار) کا حکم دیا تو عقل وجہل دونوں نے اسکی اطاعت کر لی۔ لیکن جب خداوند عالم نے سامنے آنے کا حکم دیا تو اس موقع پر صرف اور صرف عقل نے اطاعت کی اور جہل نے حکم خدا سے سرپیچی کرتے ہوئے سامنے آنے سے انکار کر دیا۔

اِن روایات میں جہل سے مراد خواہشات نفس ہیں جیسا کہ ان دونوں روایات سے بھی اندازہ ہوتا ہے کیونکہ ان دونوں میں ہی جہل کو عقل کی ضد قرار دیا گیا ہے۔

میرا خیال تو یہ ہے (اگر چہ خدا بہتر جانتا ہے) کہ یہاں (ادبار) واپس جانے کے حکم سے مراد حکم تکوینی ہے جس کی طرف اس آیۂ کریمہ میں اشارہ موجود ہے:

﴿وإذا قضىٰ أمراً فانما يقول له كن فيكون﴾(۱)

"اور جب کسی امر کا فیصلہ کرلیتا ہے تو صرف "کن" کہتا ہے اور وہ چیز ہو جاتی ہے"

اس حکم الٰہی کی پیروی اور پابندی میں عقل اور خواہشات حتی کہ پوری کائنات بھی اس اعتبار سے مشترک ہیں کہ جب خداوند عالم کوئی حکم دیتا ہے تو وہ بھی اسکی اطاعت کرتے ہیں۔

﴿إنما قولنا لشيء إذا أردناه أن نقول له كن فيكون﴾(۲)

"ہم جس چیز کا ارادہ کرلیتے ہیں اس سے فقط اتنا کہتے ہیں کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے"

﴿سبحانه إذا قضىٰ أمراً فإنّما يقول له كن فيكون﴾(۳)

"وہ پاک و بے نیاز ہے جب کسی بات کا فیصلہ کرلیتا ہے تو اس سے کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ چیز ہو جاتی ہے"

چنانچہ جس طرح عقل اور اسکے لشکر خداوند عالم کے حکم تکوینی کی اطاعت کرتے ہیں اسی طرح خواہشات نفس نے بھی اسکے حکم کے مطابق عمل کیا ہے۔ لیکن سامنے آنے کا حکم اور اسکے مقابلہ میں ادبار (واپس جانے) کا حکم اور ہوائے نفس کا اس معاملہ میں عقل کی مخالفت کرنا یہ دونوں اس بات کا قرینہ ہیں کہ اس حکم سے احکام (اوامر) تشریعی مراد ہیں اور یہی وہ احکام شرعی ہیں جن میں عقل

---

(۱) سورۂ بقرہ آیت ۱۱۷۔

(۲) سورۂ نحل آیت ۴۰۔

(۳) سورۂ مریم آیت ۳۵۔

اطاعت کرتی ہے اور ہوائے نفس انکی مخالفت کرتی ہے۔

۳۔ان دونوں روایات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عقل اور خواہشات کو دو الگ الگ مادوں سے بنایا گیا ہے۔

جیسا کہ روایات میں بھی ہے کہ عقل خدا کی روحانی مخلوق ہے جس کو خداوند عالم نے اپنے نور اور عرش کے دائیں حصہ سے خلق کیا ہے جبکہ جہل (خواہشوں) کو خداوند عالم نے تاریکیوں کے کھاری سمندر سے پیدا کیا ہے اگر چہ حتمی طور پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ عقل اور خواہشات کا پہلا مادہ (عنصر اولیہ) کیا ہے۔کیونکہ اسکا علم تو صرف انھیں ہستیوں کے پاس ہے جنھیں خداوند عالم نے تاویل احادیث کا علم ودیعت فرمایا ہے۔لیکن پھر بھی ان دونوں روایات کے مطابق اس بات میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ عقل کا اصل مواد اور عنصر (پہلا میٹیریل) فہم وادراک اور معرفت سے مشتق ہے جو کہ اللہ تعالی کا ہی ایک نور ہے خواہشات کا اصل مواد اور عنصر اس فہم وادراک اور معرفت سے خالی ہے۔بلکہ خواہشات تو حاجتوں اور مطالبات کی تاریکیوں کا ایک ایسا مجموعہ ہیں جن کے درمیان سے فہم وادراک کا گذر نہیں ہو پاتا جبکہ عقل تہ درتہ فہم اور فراستوں کے مجموعہ کا نام ہے اور یہ دونوں خداوند عالم کی طرف سے انسان کی شخصیت کے بنیادی محور قرار دیے گئے ہیں؟

۴۔روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ جب عقل نے دونوں احکام کی اطاعت کر لی تو خداوند عالم نے اسکا احترام کیا اور اسے عزت بخشی لیکن جہل نے کیونکہ خدا کے حکم کی مخالفت کی تھی لہٰذا اللہ تعالی نے اس پر لعنت فرمائی اور لعنت یعنی رحمت خدا سے دور ہو جانا اور اسکی بارگاہ سے جھڑک دیا جانا، گویا روایت یہ بتا رہی ہے کہ انسان کی شخصیت کے دو بنیادی محور اور مرکز ہیں انمیں سے ایک اسے خداوند عالم سے قریب کرتا ہے تو دوسرا محور اسکو خدا سے دور کر دیتا ہے اور یہ دونوں محور اور مرکز یعنی عقل اور خواہشات انسان کو بالکل دو متضاد زاویوں (راستوں اور مقاصد) کی طرف کھینچتے ہیں کیونکہ خدا نے انکو اسی طرح پیدا کیا ہے۔چنانچہ عقل انسان کو خدا کی طرف لیجاتی ہے۔اور خواہشات اسے خداوند

عالم سے دور کرتے رہتے ہیں۔

۵۔ دونوں روایات میں اس بات کا تذکرہ ہے کہ جب خداوند عالم نے عقل کو ۷۵ لشکر عنایت فرمائے اور جہل نے بارگاہ الٰہی میں اپنی کمزوری کی فریاد کی تو خداوند عالم نے اسے بھی اتنے ہی لشکر عنایت فرمادئے لیکن اس کے بعد اس سے یہ فرمایا:

﴿فانْ عصیت بعدذلك اخرجتك وجندك من رحمتي﴾

"اب اگر اسکے بعد تو نے میری نافرمانی کی تو میں تجھے تیرے لشکر سمیت اپنی رحمت کے دائرہ سے باہر نکال دونگا"

ہم اپنے قارئین کو ایک بار پھر یاد دلانا چاہتے ہیں کہ ان روایات میں اشارہ اور کنایہ کی زبان استعمال ہوئی ہے۔لہٰذا ضروری نہیں ہے کہ یہ گفتگو واقعاً خداوند عالم اور عقل وجہل کے درمیان ہوئی ہو بلکہ ہم تو صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ روایت اسلامی نظریہ کے مطابق خواہشات کی قدر و قیمت اور اہمیت پر عمیق روشنی ڈالتی ہے۔یعنی روایت میں جہاں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ عقل کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خداوند عالم سے قریب کرتی ہے اور خواہشات خدا سے دور کرتے ہیں ۔۔۔ وہیں روایت میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ اگر خواہشات، خدا کی معصیت نہ کریں تو وہ خدا کی رحمت کے مستحق رہتے ہیں لیکن جب یہ انسان کو خدا کی نافرمانی اور معصیت پر لگادیتے ہیں تو رحمت خدا سے محروم ہوجاتے ہیں۔

لہٰذا اسلام تمام خواہشات کو برا نہیں سمجھتا ہے۔اور نہ ان کو انسان کے اوپر عذاب الٰہی قرار دیتا ہے بلکہ جب تک انسان خداوند عالم کی نافرمانی اور گناہ نہ کرلے یہ بھی عقل کی طرح انسان کے لئے ایک رحمت الٰہی ہے۔البتہ جب یہ انسان کو خداوند عالم کی اطاعت کے حدود سے باہر نکال دیں اور اسے اسکی معصیت پر لگادیں تو پھر یہی رحمت اسکے لئے عذاب زندگی میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

چنانچہ دین کی طرف جو یہ نسبت دی جاتی ہے کہ وہ خواہشات، لذتوں اور شہوتوں کا مخالف

ہے ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کے بالکل برعکس اسلام نے ہوئی (خواہشات) اور اسکے لشکر کو اس عظمت اور شرف سے نوازا کہ انہیں رحمت الٰہی کا مستحق قرار دیدیا ہے اور جب تک انسان گناہ کا مرتکب نہ ہوا سکے لئے اپنے خواہشات کی تسلی اور ان کی تکمیل جائز ہے اور یہ کوئی قبیح چیز نہیں ہے۔ بلکہ اسلامی نظریہ تو یہ ہے کہ اگر شرافت کے دائرے کے اندر اور قاعدہ و قانون کے تحت رہ کر ان شہوتوں اور خواہشات کو پورا کیا جاتا رہے تو یہی انسانی زندگی کی ترقی اور کمال کا بہترین ذریعہ بن جاتے ہیں۔

۶۔روایات میں اس بات کی طرف بھی اشارہ موجود ہے کہ عقل کے دورخ (مرحلے) ہیں۔

پہلے مرحلے میں وہ کسی چیز کا ادراک کرتی ہے۔اور دوسرے مرحلے میں اس کو عملی جامہ پہناتی ہے لہٰذا جتنی زیادہ مقدار میں عقل کے ساتھ اسکے لشکر اور صفات جمع ہوتے رہتے ہیں اسکی عملی شکل میں اضافہ ہوتا رہتا ہے لیکن جوں جوں اسکے خصائل اور لشکروں کی تعداد گھٹتی رہتی ہے اسکے عمل کی رفتار بھی اسی طرح کم ہوجاتی ہے۔اور خواہشات پر اسکا کنٹرول بھی ڈھیلا پڑجاتا ہے۔

روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ''یہ تمام صفات ایک ساتھ صرف کسی نبی، وصیِ نبی یا اس مومن کے اندر جمع ہوسکتے ہیں جس کے دل کا امتحان خدا لے چکا ہے۔لیکن دوسرے تمام مومنین کرام کے اندر انمیں سے کچھ نہ کچھ صفات ضرور پائے جاتے ہیں مگر ان بعض صفات سے کوئی فائدہ نہیں ہے بلکہ جب تک وہ اپنے کو ان تمام صفات کا حامل نہ بنالیں اور جہل کے لشکروں سے مکمل نجات حاصل نہ کرلیں تب تک وہ مومن کامل نہیں ہوسکتے ہیں اور جس دن وہ اسمیں کامیاب ہوجائیں گے تو انھیں بھی انبیاء واولیاء کے ساتھ جنت کے اعلیٰ درجات میں سکونت نصیب ہوگی''

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ عقل کے تنفیذی رخ کی تکمیل کا اثر اسکے دوسرے رخ پر پڑتا ہے اور اسکی فہم وفراست اور بصارت وبصیرت کی تکمیل ہوجاتی ہے۔

اس طرح اس سلسلہ کی تینوں کڑیاں مکمل ہوجائینگی کہ:

جب انسان اپنے اندر عقل کے تمام لشکر اور صفات جمع کرلے تو پھر عقل عملی منزل میں قدم

رکھنے اور خواہشات کا مقابلہ کرنے کی قوت پیدا کرلیتی ہے اور اسی سے اسکی فہم وفراست اور بصارت وبصیرت بھی کامل ہوجاتی ہے۔ اور نتیجہ انسان انبیاء اور اولیاء کے درجہ میں پہونچ جاتا ہے (جسکی طرف روایت نے اشارہ کیا ہے) اور یہی راستہ اور طریقہ جسکو روایت نے محدود اور مشخص کردیا ہے یہی اسلام کی نگاہ میں تربیت کی بہترین اساس اور بنیاد نیز کردار وعمل کی تقویت کا باعث ہے۔ کیونکہ عقل، بصیرت اور تنفیذ کا نام ہے اور بصیرت کی کمزوری عقل کی تنفیذی قوت کی بنا پر پیدا ہوتی ہے اور یہ (قوت تنفیذ) عقل کی خصلتوں کی کمزوری کی وجہ سے کمزور رہتی ہے لہٰذا جب انسان اپنے نفس کے اندر ان تمام خصلتوں کو مکمل کرلیتا ہے تو بصیرت اور تنفیذ دونوں ہی لحاظ سے اسکی شخصیت مکمل ہوجاتی ہے۔

۷۔ ان روایات نے بشری کرداروں کو دو مشخص اور معین حصوں میں تقسیم کردیا ہے:

۱۔ تقوی (باعمل)

۲۔ فسق وفجور (بے عملی)

تقویٰ اسے کہتے ہیں جس میں عقل کی پیروی کی جائے اور ہر قدم اسی کی مرضی کے مطابق اٹھے، اور فسق وفجور کا مطلب یہ ہے کہ خواہشات اور جہل کے لشکروں کے اشاروں پر ہر عمل انجام پائے اور اسکے اوپر انہیں کا قبضہ ہو، لہٰذا قرب خدا کی منزل تک پہنچنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ انسان جہالت کے لشکروں سے نجات حاصل کرلے اور خواہشات کی سرحدوں کو روندکر عقل کی حکومت میں داخل ہوجائے اور اسکے ہر طرز عمل اور رفتار وکردار پر عقل کی حکمرانی ہو۔

۸۔ مذکورہ فہرست میں بشری طرز عمل اور کردار کے طور طریقہ کے پچھتر جوڑوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جن میں سے ہر جوڑا دو متضاد اعمال سے مل کر بنا ہے۔ یعنی ان میں سے ایک عقل کے طرز عمل کی فہرست میں شامل ہے اور دوسرا شہوت کے طریقہ کار کی فہرست کے دائرہ میں آتا ہے۔ لہٰذا اس فہرست میں پچھتر عقل کے طریقہ کار اور پچھتر شہوت کے کرتوت ذکر ہیں جن میں پہلے بالترتیب عقل

کے لشکر کے صفات ذکر ہوئے ہیں اور اسکی ہر صفت کے بعد اسی کی مخالف ،جہل کی صفت کا تذکرہ ہے

۹۔ بشریت کے طرز عمل اور آداب و کردار کے صفات کی ان دونوں فہرستوں کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے انسان کے نفس میں ہر آرزو کو پورا کرنے کے لئے اور اسے ہوئی وہوس سے بچانے کے لئے ایک دفاعی طاقت بھی رکھی ہے۔اور کیونکہ انسان کے تکامل اور تحرک کے لئے اسکے نفس میں خواہشات کا وجود ضروری ہے اسی لئے خداوند عالم نے ہر خواہش کو روکنے اور اسکا مقابلہ کرنے کے لئے اسمیں ایک صفت (قوت مدافعت) ودیعت فرمائی ہے تا کہ ان کا تعادل ہمیشہ برقرار رہ سکے۔

۱۰۔ایسا نہیں ہے کہ بشری طرز عمل کے جو یہ ایک سو پچاس صفات ہیں یہ ایک عام اور معمولی صفت یا سرسری خصوصیات ہوں جو کبھی کبھی اسکے نفس پر طاری ہو جاتے ہوں بلکہ انسان کے تمام اعمال کی بنیادیں بہت گہری اور انکی جڑیں بہت وسیع حد تک پھیلی ہوئی ہیں لہٰذا انسان جو اچھائی یا برائی کرتا ہے اسکا تعلق نفس کے باطن سے ضرور ہوتا ہے۔جس کی طرف قرآن مجید کی اس آیت میں اشارہ موجود ہے:

﴿فالھمھا فجورھا وتقواھا﴾(۱)

''اور پھر اسے بدی اور تقوی کی ہدایت کردی''

لہٰذا تقوی اور بدی میں سے ہر ایک کا سرچشمہ نفس ہی ہے اور یہ انسان کے طرز عمل میں کہیں باہر سے نہیں آتا ہے

۱۱۔عقل کے لشکر (صفات) کی فہرست میں غور وفکر سے کام لینے والا شخص آسانی ان کی دو قسمیں کرسکتا ہے:

---

(۱)سورۂ شمس آیت/۸۔

۱۔اکسانے اور مہمیز کرنے والی صفات۔

۲۔روکنے والے قواعد (ضوابط)

اکسانے والے صفات، نفس کو نیک اعمال پر ابھارنے اور مہمیز کرنے والے صفات کو کہا جاتا ہے۔ جیسے ایمان، معرفت، رحمت اور صداقت۔

ضوابط وہ اسباب ہیں جن کے ذریعہ نفس کے اندر رکنے اور باز رہنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ جیسے عفت، زہد، صبر، قناعت اور حیاء۔

اکسانے والے صفات ان تمام عادات وصفات کا مجموعہ ہیں جو انسان کی شخصیت میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور کسی بھی کار خیر یا رحمت و معرفت میں اسے جو ضرورت ہوتی ہے وہ اس کو پورا کرتے ہیں

لیکن ضوابط (قواعد) انسان کی شخصیت کو پستی میں گرنے سے محفوظ رکھتے ہیں اسطرح یہ مہمیز کرنے اور بچانے والے صفات ایک ساتھ مل کر ہی انسان کی شخصیت کی تعمیر اور اسکی حفاظت کا کام انجام دیتے ہیں اور اس سلسلہ میں عقل کے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

اب اسکی مزید تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

انسانی زندگی میں عقل دو قسم کے عمل انجام دیتی ہے۔

۱۔انسان کو ان مقاصد اور منزلوں کی طرف تحریک اور مہمیز کرنا جو اس کی ترقی اور تکامل کے لئے ضروری ہیں۔

۲۔پرخطر جگہوں پر انسان کو لغزشوں سے محفوظ رکھنا۔مثال کے طور پر انسان خداوند عالم کی طرف سیر وسلوک کی منزلیں طے کرتا ہوا منزل سعادت وکمال تک پہونچتا ہے ایسے مرحلہ میں عقل کا اہم کردار یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کو ذکر وعبادت الٰہی اور اسکی محبت کی دعوت دیتی ہے اور اپنی انانیت

سے خداوند عالم کی طرف یہ سفر اور حرکت انسانی زندگی کی ایک اہم بنیادی ضرورت ہے۔

اس طرح مومنین کی آپسی محبت اور اخوت و برادری کے ذریعہ انسان کی شخصیت کو چار چاند لگ جاتے ہیں جس کو اسلام نے ولاء، اخوت و برادری اور پیار و محبت کا نام دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں تمام مومنین ایک دوسرے سے میل محبت رکھیں اور ایک دوسرے کا تعاون کریں اور ہر شہر والے دوسرے شہر والوں کے کام آئیں تنہائی اور انفرادیت سے ساجیات اور معاشرہ کی طرف قدم اٹھانا بھی انسان کی ایک اہم ضرورت ہے۔

یہ دونوں مثالیں تو عقل کے مثبت کاموں کے بارے میں تھیں مگر انسان ان دونوں راستوں میں خطا و لغزش کا شکار ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ وہ انانیت (ذاتیات) سے خدا کی طرف بلند پروازی کے دوران اچانک اوپر سے نیچے کی طرف یعنی (خدا سے ذاتیات) کی طرف گرنا شروع کر دیتا ہے اور یہ سب گناہ کرنے نیز خواہشات اور شیطانی وسوسوں اور ہوس کے جال میں پھنسنے کی وجہ سے ہوتا ہے

اسی طرح کبھی کبھی انسان اپنے ذاتی مفاد جیسے خود پسندی یا دوسروں سے بغض و حسد یا کسی چیز کی لالچ کی بنا پر سماج اور معاشرے پر فدا رہنے اور اسکے لئے بے شمار قربانیاں پیش کرنے کے باوجود قوم اور معاشرے پر اپنی ذات کو فوقیت دینے لگتا ہے، ایسے مواقع پر عقل بہت موثر کردار کرتی ہے یعنی:

۱۔ ذاتیات اور انانیت سے اللہ کی طرف اور انفرادیت (تنہائی) سے سماج اور معاشرے کی طرف انسانی حرکت اور سفر میں۔

۲۔ اللہ سے انانیت کی طرف اور امت اور قوم میں غرق رہنے کے بجائے ذاتیات (شخصی فوائد) کی جانب اسی طرح ایثار سے استیثار و خود پسندی کی طرف واپسی کے تمام مراحل میں بھی عقل انسان کو خواہشات کی پیروی اور ان کے ساتھ پھسل جانے اور گمراہ ہونے سے روکتی رہتی ہے۔

جب انسان آزادانہ طور پر خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے ان کے دھارے میں بہہ کر

خدا کی طرف جانے کے بجائے انانیت کی طرف جاتا ہے، قوم کے لئے قربانی پیش کرنے کے بجائے ذاتی مفادات اور ایثار کے بجائے اپنی ذات کی طرف واپس پلٹنے لگتا ہے تبھی عقل اسکا راستہ روک لیتی ہے اگرچہ یہ دوسری بات ہے کہ تنہا عقل کے اندر اتنی صلاحیت اور طاقت نہیں ہے کہ وہ خدا اور قوم وملت کی طرف انسانی حرکت یا انانیت اور ذاتیات کی وجہ سے گمراہ ہوتے وقت اپنے بل بوتے پر تنہا ان دونوں مرحلوں کو سر کرلے لہٰذا وہ مجبوراً ان صفات اور عادات کا سہارا لیتی ہے جن کو خداوند عالم نے انسان کی عقل کی پشت پناہی اور امداد کے لئے نفس کے اندر ودیعت فرمایا ہے۔

ان صفتوں اور عادتوں کی دو قسمیں ہیں: کچھ صفات وہ ہیں جو انانیت سے خدا کی طرف اور ذاتی مفادات سے قوم وملت پر فدا ہونے تک انسانی سفر اور حرکت کے دوران اس کی شخصیت کی معاون ومددگار رہوتی ہیں اور بعض دوسرے صفات اس کو خواہشات نفس کا مقابلہ کرنے اور ان پر قابو پانے کی قوت وطاقت عطا کرتے ہیں۔ جیسے خدا سے فطری لگاؤ اسی طرح محبت خدا اور ذکر وعبادت الٰہی سے فطری لگاؤ اور یہ جذبہ انسان کو خدا کی طرف اسی طرح کھینچتا ہے جس طرح سماجیات اور قوم وملت سے دلچسپی اور ان کی محبت اور بھائی چارگی کا جذبہ انسان کو قوم وملت کی طرف لیجاتا ہے۔

عقل کی ان عادتوں کو کسی کام پر ''ابھارنے یا اکسانے اور مہمیز کرنے والی طاقت'' کہا جاتا ہے جبکہ ان کے علاوہ کچھ ایسی صفات بھی ہیں جو انسان کی عقل کو ان معاملات میں کنٹرول کرنے اور اسے باز رکھنے والی طاقتیں کہی جاتی ہیں۔ جیسے حیاء انسان کو بدکرداری سے روکتی ہے یا علم وبردباری اسے غصہ سے باز رکھتا ہے تو عفت اور پاکدامنی، جنسی بے راہ روی کا سد باب کرتی ہے۔ اور قناعت، حرص اور لالچ سے محفوظ رکھتی ہے۔ وغیرہ غیرہ ۔۔۔

انہیں صفات کے مجموعہ کو انسانی حیات کے آداب (رفتار وگفتار اور کردار) میں ضوابط کا نام دیا جاتا ہے۔

یہی ضوابط، عصم (بچانے اور محفوظ کرنے والے) صفات بھی کہے جاتے ہیں کیونکہ یہ

انسان کو گمراہی وغیرہ سے محفوظ رکھتے ہیں اور اگر یہ عصمتیں (بچانے والی قوتیں) انسان کے اندر نہ ہوتیں تو عقل کسی طرح بھی اپنے بل بوتے پر خواہشات نفس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی اور ان عصم (بچانے والی صفات) کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان کی قوتیں اور صلاحتیں مختلف ہیں جن کے متعدد اسباب ہیں اسکی تفصیل ہم انشاء اللہ آئندہ بیان کرینگے۔

۱۲۔ جن صفات اور خصوصیات کو ہم نے عقل کا لشکر قرار دیا ہے اور وہ عقل کی پشت پناہی کا کردار کرتے ہیں ان کا صحیح فائدہ اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب یہ عقل اور دین کے تابع ہوں لیکن اگر خدانخواستہ یہ عقل اور دین کی حکومت سے باہر نکل جائیں تو پھر یہ انسان کے لئے مفید ہونے کے جائے نقصان دہ ہو جاتے ہیں جیسے رحم دلی انسان کے لئے ایک اچھی اور بہترین صفت ہے لیکن جب یہی صفت عقل اور دین کے دائرہ سے باہر نکل جائے تو یہی نقصان دہ ہو جاتی ہے جیسے مجرمین کے ساتھ رحم دلی سے پیش آنے کو عقل اور دین دونوں نے منع کیا ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿و لا تأخذکم بهما رأفة﴾(۱)

''اور تمہیں ان کے اوپر ہرگز ترس نہ آئے''

اسی طرح انفاق ایک اچھی صفت ہے مگر جب یہ عقل اور دین کے راستے سے منحرف ہو جاتی ہے تو تعمیر کے بجائے تخریب کرنے لگتی ہے اسی لئے دین اور عقل دونوں نے ہی ایسے مواقع پر اس سے منع کیا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿و لا تبسطها کل البسط فتقعد ملوماً محسوراً﴾(۲)

''اور نہ اپنے ہاتھوں کو بالکل کھلا ہوا چھوڑ دو کہ آخر میں ملول اور خالی ہاتھ بیٹھے رہ جاؤ''

۱۳۔ جہل کے لشکر چاہے جتنے قوی کیوں نہ ہوں مگر اسکے باوجود وہ انسان کے ارادہ کے اوپر

---

(۱) سورہ نور آیت ۲۔

(۲) سورہ اسراء آیت ۲۹۔

غلبہ حاصل نہیں کر سکتے ہیں اور اس سے اسکی قوت ارادی نہیں چھین سکتے ہیں اور بالآخر کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے فیصلہ کا اختیار اسکے ارادہ کے ہی اختیار میں رہتا ہے البتہ کل ملا کر جہل کی فوجیں اتنا کر سکتی ہیں کہ وہ انسان کے ارادہ کے اوپر کسی طرح کا دباؤ ڈال دیں اور وہ دباؤ اتنا زیادہ ہو جو اس ارادہ کو عمل کے لئے تحریک کر دے، لیکن پھر بھی یہ انسان سے اس کی قوت ارادہ اور اسکی آزادی و اختیار کو سلب نہیں کر سکتے ہیں ۔۔۔ اگر چہ اس میں بھی کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ عقل یا جہل کے صفات سے ارادہ کسی حد تک متاثر ضرور ہوتا ہے۔

۱۴۔ یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے کہ عقل کے لشکروں کی قوت وطاقت یا کمزوری کا تعلق انسان کی اچھی یا بری تربیت سے ہوتا ہے اگر واقعاً کسی کی اچھی تربیت ہو اور وہ متقی انسان ہو جائے تو عقل کی یہ خصلتیں قوی ہو جاتی ہیں اور خواہش نفس اور شہوتیں خود بخود کمزور پڑ جاتی ہیں۔

اسی طرح اسکے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ خواہشات کی اندھی پیروی اور غلط تربیت یا سماج کی وجہ سے جب انسان بگڑ جاتا ہے تو شہوتوں میں مزید اضافہ ہوتا ہے اور عقل کے لشکر (صفات) کمزور پڑ جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے بعض حلال خواہشات کی تکمیل سے بھی اکثر منع کیا ہے تا کہ انسان ان لذتوں (اور خواہشات) کے بہاؤ کے ساتھ غلط راستوں پر نہ بہنے پائے جیسا کہ رسول اکرمؐ نے اسی بارے میں یہ ارشاد فرمایا ہے:

﴿من أكل مايشتهي لم ينظر الله اليه حتىٰ ينزع أويترك﴾(۱)

''جو شخص اپنی دل پسند چیز کھاتا رہے تو جب تک اسے ترک نہ کر دے یا اس سے دور نہ ہو جائے خداوند عالم اسکی طرف نظر بھی نہیں کرتا ہے''

اسکی وجہ یہ ہے کہ اگر انسان کھانے پینے میں اپنی ہر خواہش پوری کرتا رہے اور اپنے پیٹ

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۰، ص ۷۸۔ ح ۱۰۔

کے اوپر کنٹرول نہ رکھے تو حلال کھاتے کھاتے ایک نہ ایک دن وہ حرام کھانا شروع کر دیگا۔ (کیونکہ وہ اپنی پسند کا بندہ ہے) اور حرام خوری کرنے والے انسان پر رحمت الٰہی نازل نہیں ہوتی اور خدا اس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا ہے۔

علماء اخلاق نے خواہشات کو لطیف اور سبک بنانے کے لئے کچھ طریقے بیان کئے ہیں جیسا کہ ابراہیم خواص نے کہا ہے کہ دل کی پانچ دوائیں ہیں:

۱۔ قرآت قرآن۔ ۲۔ خالی پیٹ (رہنا) ۳۔ نماز شب۔

۴۔ سحر کے ہنگام گریہ وبکا (تضرع) ۵۔ صالحین کی ہم نشینی۔

کسی اور کا یہ قول ہے کہ خداوند عالم نے دلوں کو اپنے ذکر کا مسکن (گھر) بنایا تھا۔ مگر وہ شہوتوں کا اڈہ بن گئے اور دلوں کے اندر سے یہ خواہشات انسان کو ہلا کر رکھ دینے والے خوف یا تڑپا دینے والے شوق کے بغیر نہیں نکل سکتی ہیں۔(۱)

خواہشات کو نرم ولطیف اور کمزور کرنے اور عقل کے لشکروں کی امداد کرنے والی اس صفت کی طرف امیرالمومنین ؑ نے خطبۂ متقین میں یہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿قد احیا عقله و أمات نفسه﴾

''اس نے اپنی عقل کو زندہ کر دیا اور اپنے نفس کو مردہ بنا دیا''

اسلام میں تربیت وہی ہے جس کی طرف مولائے کائنات ؑ نے اشارہ فرمایا ہے کہ: اس کے ذریعہ خواہشات کی بڑی سے بڑی خصلتیں مختصر اور لطیف ہو جاتی ہیں جن کی تعداد روایات میں ۷۵ بیان کی گئی ہے۔ اسکے علاوہ اس کا فائدہ یہ ہے کہ وقت ضرورت یہ عقل کی ۷۵ صفتوں اور خصلتوں کی امداد اور پشت پناہی بھی کرتی رہتی ہے۔

۱۵۔ جب عقل کو اپنی خصلتوں کی جانب سے مکمل پشت پناہی حاصل ہو جاتی ہے تو پھر

---

(۱) ذم الہویٰ لابن الجوزی ص ۷۰۔

خواہشات کے اوپر عقل کا کنٹرول اور حکومت قائم ہوجاتی ہے اور وہ ان کے اوپر اچھی طرح تسلط قائم کرلیتی ہے اور انسان کو محفوظ کرکے خواہشات کی طاقت کو بالکل ناکارہ بنادیتی ہے جیسا کہ حضرت علیؑ نے فرمایا ہے:

﴿العقل الکامل قاھر للطبع السوء﴾ (۱)

"عقل کامل بری طبیعتوں پر غالب رہتی ہے"

اس طرح عام لوگوں کے خیالات کے برخلاف انسان درحقیقت صرف اپنی خواہشوں پر کنٹرول کرکے ہی قوی اور طاقتور ہوتا ہے جبکہ عام لوگ تو خواہشات اور ہویٰ وہوس کی حکومت اور غلبہ کو طاقت اور قوت سمجھتے ہیں مگر اسلام کی نگاہ میں خواہشات کو اپنے ماتحت رکھنے کا نام غلبہ اور قوت و طاقت ہے اور خواہشات کی حکومت اور اسکی ماتحتی میں چلے جانے کو طاقت اور غلبہ نہیں کہا جاتا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

﴿لیس الشدید من غلب الناس، ولکن الشدید من غلب نفسه﴾ (۲)

"طاقتور وہ نہیں ہے جو لوگوں کے اوپر غلبہ حاصل کرلے بلکہ طاقتور وہ ہے جو نفس کو اپنے قابو میں رکھے"

آپؐ ہی کا یہ ارشاد گرامی ہے:

﴿لیس الشدید بالصرعة، انما الذی یملك نفسه عند الغضب﴾ (۳)

"کشتی اور پہلوانی کے ذریعہ انسان طاقتور نہیں بنتا ہے بلکہ طاقتور وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر اختیار رکھے"

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۸ ص ۹۔

(۲) ذم الہوی ۳۹۔

(۳) مسند احمد و بیہقی۔

آپ ہی کا یہ ارشاد گرامی ہے:

﴿أشجع الناس من غلب هواه﴾(۱)

''سب سے زیادہ بہادر وہ ہے جو اپنی خواہشات پر غلبہ حاصل کر لے''

عقل کامل کے فوائد اور اثرات

جب خواہشات کے اوپر ہر اعتبار سے عقل کا تسلط قائم ہو جاتا ہے اور اسے انسان کی رہنمائی اور ہدایت کے تمام اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں تو یہی عقل بے شمار فوائد اور برکتوں کے سرچشمہ میں تبدیل ہو جاتی ہے اور یہیں سے انسانی زندگی میں بے شمار انقلابات پیدا ہوتے ہیں اب انسانی حیات میں عقل کے فوائد کیا ہیں ان کو ہم یہاں روایات کے ذیل میں اختصار کے ساتھ بیان کر رہے ہیں اور ان کی تفصیلات کو ترک کر رہے ہیں۔

۱۔حق کے اوپر استقامت

حضرت علیؑ: ﴿ثمرة العقل الاستقامة﴾(۲)

''عقل کا پھل استقامت (ثابت قدمی) ہے''

﴿ثمرة العقل لزوم الحق﴾(۳)

''عقل کا پھل حق کے ساتھ دائمی وابستگی ہے''

۲۔دنیا سے دشمنی رکھنا کامل عقل کا ثمر ہے

حضرت علیؑ:

---

(۱)بحار الانوار ج۷۰ص۷۶ح۵۔

(۲)غرر الحکم ج۱ص۳۲۰۔

(۳)گذشتہ حوالہ۔

﴿ثمرة العقل مقت الدنیا،وقمع الھویٰ﴾(۱)

''عقل کا پھل دنیا کو ناپسند رکھنا اور خواہشات کو اکھاڑ پھینکنا ہے''

۳۔خواہشات پر مکمل تسلط

حضرت علیؑ:

﴿اذا کمل العقل نقصت الشھوة﴾(۲)

''جب عقل کامل ہوجاتی ہے تو خواہشیں مختصر ہوجاتی ہیں''

﴿من کمل عقله استھان بالشھوات﴾(۳)

''جسکی عقل مکمل ہوجاتی ہے وہ خواہشوں کو حقیر بنادیتا ہے''

﴿العقل الکامل قاھر للطبع السوء﴾(۴)

''عقل کامل بری طبیعتوں پر کنٹرول رکھتی ہے''

۴۔حسن عمل اور سلامتی کردار

﴿من کمل عقله حسن عمله﴾(۵)

''جسکی عقل مکمل ہوگئی اسکا عمل حسین ہوگیا''

عصمتیں

روایات کے ذیل میں عقل کے صفات (لشکروں) کی وضاحت کے بعد اب ہم خواہشات

---

(۱)غرر الحکم ج۱ص۳۲۳۔

(۲)غرر الحکم ج۱ص۲۷۹۔

(۳)غرر الحکم ج۱ص۱۸۰۔

(۴)بحار الانوار ج۷۸ص۹۔

(۵)گذشتہ حوالہ۔

کا مقابلہ کرنے کے طریقہ کے علاوہ ان کے علاج کا طریقہ بھی بیان کرینگے۔

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ عقل کے اندر اتنی قوت اور صلاحیت نہیں پائی جاتی ہے کہ وہ تن تنہا خواہشات کا مقابلہ کر سکے۔ اور اگر کبھی ایسا موقع آ جائے تو عقل کو ان کے سامنے بہر حال گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہونا پڑیگا۔ لیکن چونکہ خداوند عالم نے خواہشات کا مقابلہ کرنے کے لئے عقل کو اسکے معاون ومددگار صفات (اور لشکروں) سے نوازا ہے لہذا عقل کو ان کا مقابلہ کرنے یا انہیں کنٹرول کرنے میں کسی قسم کی زحمت کا سامنا نہیں ہوتا ہے اور یہ لشکر خود بخود بڑھ کر خواہشات کا راستہ روک لیتے ہیں اور ان کو بے راہ روی سے بچائے رکھتے ہیں۔

جن صفات اور لشکروں کی امداد کے سہارے عقل خواہشات پر کنٹرول کر کے انہیں اپنے قابو میں رکھتی ہے انھیں اخلاقی دنیا میں عصم (محافظین عقل) کہا جاتا ہے۔ لہذا عقل کے ان صفات کی صحیح تعلیم وتربیت اور پرورش اور نفس کے اندر ان کی بقاء ودوام ہی خواہشات نفس کے مقابلہ اور علاج کا سب سے بہترین اسلامی، اخلاقی اور تربیتی طریقۂ کار ہے۔

کیونکہ ان عصمتوں (محافظوں) کا فریضہ یہ ہے کہ وہ انسان کو گناہوں میں آلودہ نہ ہونے دیں اور اسے حتی الامکان خواہشات کے چنگل سے محفوظ رکھیں۔ چنانچہ اگر نفس کے اندر خداوند عالم کے عطا کردہ یہ محافظ (عصمتیں) نہ ہوتے تو عقل تن تنہا کبھی بھی خواہشات کے حملوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی، لیکن اب چونکہ اسکے ساتھ ان محافظین کی کمک اور پشت پناہی موجود ہے لہٰذا وہ آسانی کے ساتھ انسانی خواہشات کے اوپر ہر لحاظ سے قابو پا لیتی ہے اور ان کو اپنے کنٹرول میں رکھتی ہے۔

یہ عصمتیں (محافظین عقل) مختلف حالات سے گذرتی رہتی ہیں یعنی کبھی یہ قوی ہو جاتی ہیں اور کبھی بالکل کمزور پڑ جاتی ہیں۔ چنانچہ جب یہ بالکل طاقتور ہوتی ہیں تو انسان کو ہر قسم کی برائی سے بچائے رکھتی ہیں اور اسے گناہ نہیں کرنے دیتیں لیکن اگر خدانخواستہ یہ کمزور ہو جائیں تو پھر انسان کی ہوس اور خواہشات نفسانی اس پر غالب آ جاتے ہیں اور وہ انھیں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔

یہ عصمتیں تقویٰ کے ذریعہ مضبوط ہوتی ہیں اور گناہوں اور برائیوں کی وجہ سے کمزور پڑ جاتی ہیں بلکہ گناہوں کا اثر ان کے اوپر اس حد تک ہوتا ہے کہ یہ بالکل چاک چاک اور پارہ پارہ ہوکر رہ جاتی ہیں جسکے بعد انسانی خواہشات اسکے اوپر اس طرح ٹوٹ پڑتے ہیں کہ وہ بالکل بے یارومددگار ہوجاتا ہے اور کوئی اسکا بچانے والا محافظ اور نگہبان باقی نہیں رہ جاتا۔ جیسا کہ دعائے کمیل کے اس جملہ میں اسکی طرف اشارہ موجود ہے:

﴿اللّهم اغفر لی الذنوب التی تهتك العصم﴾

''بارالہا میرے ان گناہوں کو بخش دے جو عصمتوں کو چاک چاک کردیتے ہیں''

دوسری بات یہ کہ تقویٰ اور عصمتوں کے درمیان جو آپسی رابطہ ہے وہ طرفینی (دوطرفہ رابطہ) ہے یعنی اگر تقویٰ سے ان عصمتوں کو مدد ملتی ہے تو دوسری جانب یہ عصمتیں تقویٰ کی تقویت میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

اس طرح گناہوں اور عصمتوں کے درمیان بھی دوطرفہ اثرات پائے جاتے ہیں یعنی جس طرح گناہ، عصمتوں کو کمزور یا پارہ پارہ کردیتے ہیں اسی طرح اگر عصمت باقی نہ رہ جائے تو انسان بڑی آسانی کے ساتھ خواہشات کے چنگل میں گرفتار ہوجاتا ہے۔

یہ عصمتیں نفس کے اندر ہی پیدا ہوتی ہیں اور ان کی بنیادیں اور جڑیں فطرت کی تہوں میں اتری ہوتی ہیں اور خداوند عالم نے انسان کے نفس اور اسکی فطرت کے اندر ان (عصمتوں) کے خزانے جمع کر رکھے ہیں جو خداوند عالم کی طرف سے معین کردہ فریضہ کی ادائیگی میں عقل کو سہارا دیتے ہیں۔

جبکہ کچھ ماہرین سماجیات کا یہ خیال ہے کہ یہ عصمتیں نفس کے اندر پہلے سے موجود نہیں تھیں بلکہ جس سماج اور معاشرے میں انسان زندگی بسر کرتا ہے وہ انہیں سے یہ عصمتیں بھی سیکھتا ہے اور درحقیقت یہ سماج ہی کے ذریعہ اسکے نفس کے اندر منتقل ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ مختلف قسم کے سماج اور معاشروں کے اعتبار سے انکی قوت وطاقت اور مقدار کم یا زیادہ ہوتی رہتی ہے۔

اس نظریہ میں اتنی کمزوریاں پائی جاتی ہیں جن کا کوئی بھی جواب ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ ذاتی خصلتوں (اور اعمال) کا تعلق فطرت کی گہرائیوں سے ہوتا ہے البتہ ان کے اوپر معاشرتی اور سماجی ماحول اثر انداز ضرور ہوتا ہے اور ان کو معاشرہ یا سماج سے جدا کر دینا ممکن نہیں ہے۔ مگر یہ سوچنا بالکل غلط ہے کہ ذاتی عادات واطوار سماجیات سے بالکل الگ ہوتے ہیں یعنی ہم دوسری قسم کو سماج پر اثر انداز ہونے والے کے عنوان سے قبول کرلیں اور انھیں کے لئے پہلی خصلت کو چھوڑ دیں کیونکہ ذاتی خصوصیات کو بالکل کالعدم قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی کسی بھی اچھے یا برے معاشرے سے ان کو جدا کیا جاسکتا ہے۔

ان دونوں صلاحیتوں اور صفات (اور طرز تفکر) کے درمیان یہ فرق ہے کہ ذاتی صلاحیتیں ہر دور اور ہر تمدن میں تمام انسانوں کے درمیان بالکل یکساں طور پر دکھائی دینگی جبکہ سماجی رسم ورواج ہر روز پیدا ہوتے رہتے ہیں اور مختلف اسباب کی بنا پر کچھ دن کے بعد ختم ہوجاتے ہیں حتی کہ بعض علاقوں یا ملکوں میں کچھ ایسے رسم ورواج پائے جاتے ہیں جن کو دوسرے ممالک میں کوئی جانتا بھی نہیں ہے۔

مثال کے طور پر خداوند عالم پر ایمان رکھنا ہر انسان کے اندر ایک ذاتی اور فطری چیز ہے جبکہ کفر والحاد ایک سماجی پیداوار ہے جو فطرت ایمان اور حتی خداوند عالم کے خلاف سرکشی اور بغاوت کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

اگر چہ ایمان اور کفر دونوں ہی کا وجود تقریبا تاریخ انسانیت کے ساتھ ساتھ پایا جاتا ہے۔ لیکن اسکے باوجود ان کے درمیان بے حد فرق ہے کیونکہ ایمان خدا کا وجود تو انسانی تمدن، تاریخ اور زندگی میں ہر جگہ مل جائے گا اور کوئی بشری تاریخ بھی اس سے ہرگز خالی نہیں ہے۔ حتی کہ سورج، چاند، اور بتوں کی عبادت کا سرچشمہ بھی دراصل یہی ایمان ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا رخ صحیح فطرت کی طرف ہونے کے بجائے کسی دوسری طرف ہوگیا ہے۔

لیکن الحاد کا وجود کسی تہذیب یافتہ سماج کے اندر نہیں دکھائی دیتا چنانچہ نہ جانے انسان کے اوپر ایسے کتنے دور گذرے ہیں جن میں الحاد کا باقاعدہ کہیں کوئی وجود اور سراغ نہیں پایا جاتا جس کو کسی

تہذیب وتمدن اور عقل ومنطق کی پشت پناہی بھی حاصل رہی ہو۔

لیکن ایمان کا وجود آپ کو پوری کائنات میں ہر جگہ نظر آئے گا مگر الحاد کبھی کبھی کچھ عرصہ تک ادھر ادھر اپنا سر ابھارتا ہے اور ایک دن خود بخود نابود ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ سیاست اور تہذیب وتمدن نیز فکر انسانی کی تاریخ میں اس کا سب سے زیادہ عروج مارکسیسم کے دور میں ہوا جب باقاعدہ ایک سپر پاور حکومت کی پشت پناہی نے اس نظریہ کو عام کرنے کی کوشش کی مگر دنیا نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اچانک اس کے غبارے کی ہوا نکل گئی اور اب کوئی شخص مارکس کا نام لینے والا بھی نہیں ہے۔

لیکن خداوند عالم پر ایمان کی صورتحال ایسی نہیں ہے۔ لہٰذا جو شخص خداوند عالم پر ایمان اور الحاد (اسکے انکار) کے درمیان فرق محسوس نہ کر سکے اس نے خود اپنے نفس کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔

عصمتوں کے بارے میں مزید گفتگو

کچھ عرصہ پہلے میں نے عصمت کے بارے میں چند صفحات قلمبند کئے تھے جو ہماری اس بحث سے مربوط ہیں لہٰذا مناسب سمجھا کہ اسکے کچھ مفید اقتباسات اس مقام پر شامل کردئے جائیں تاکہ گذشتہ گفتگو تشنۂ تشریح نہ رہ جائے۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ انسان کے اوپر اسکی خواہشات کی حکومت بہت مضبوط اور مستحکم ہوتی ہے جسکی وجہ سے اسکے نقصانات بھی بیحد خطرناک ہوتے ہیں لہٰذا جب تک انسان اپنی خواہشات کو اچھی طرح اپنے قابو میں کر کے متعادل اور محدود نہ بنادے وہ زندگی میں خواہشات کے خطرات سے کبھی بھی محفوظ نہیں رہ سکتا ہے چنانچہ ہر انسان کے سر پر یہ خطرات ہمیشہ منڈلاتے رہتے ہیں لہٰذا کوئی نہ کوئی ایسا اخلاقی اور تربیتی نظام درکار ہے جو انسان کو اسکی انفرادی اور سماجی زندگی میں ہر جگہ خواہشات کے طوفان کا مقابلہ کرنے اور انہیں قابو میں رکھنے نیز اسکے نقصانات سے بچنے کی صلاحیت عطا کردے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ نظام تربیت کیا ہے؟ جسکی پابندی کے بعد انسان اپنے

خواہشات کے فریب سے محفوظ رہ سکتا ہے؟

اہل دنیا کے درمیان اس بارے میں چند نظریات پائے جاتے ہیں:

پہلا نظریہ رہبانیت کا ہے جس میں خواہشات کے مقابلہ کا یہ طریقہ بتایا گیا ہے کہ خواہشات کو نفس کے اندر اس طرح کچل دیا جائے کہ وہ اس میں گھٹ کر رہ جائیں اور اسکے ساتھ ساتھ حقیقی زندگی کے حصول کی خاطر فتنہ انگیز اور بھڑکانے والی باتوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے۔ رہبانیت میں یہ نظریہ بالکل عام ہے اور اسکی جڑیں ان کی قدیم تاریخ کے اندر دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔

اس مکتب فکر (نظریہ) کا خلاصہ یہ ہے کہ خواہشات کو ہر قسم کے فتنہ سے دور رکھا جائے اور دنیاوی لذت وآرام سے پرہیز کر کے ان سے دوری اختیار کی جائے۔ کیونکہ انسان کا خاصہ یہ ہے کہ وہ برائی پر اصرار کرتا ہے اور چونکہ خواہشات اور فتنوں کے درمیان رابطہ پایا جاتا ہے اور انسان کی سلامتی اسی میں ہے کہ اسے فتنوں سے دور کر دیا جائے۔

لہٰذا خواہشات سے دوری اور دنیا کے فریبوں اور لذتوں سے کنارہ کشی میں ہی انسانیت کی بھلائی ہے اور اس نظام کا ماحصل یہ ہے کہ خواہشات اور لذتوں کو بالکل ترک کر کے دنیا سے ایک دم کنارہ کشی اختیار کر لی جائے اور اسے ترک کئے بغیر اس مقصد تک رسائی ممکن نہیں ہے۔

تہذیب وتمدن کے افکار کے درمیان یہ ایک مشہور ومعروف نظریہ ہے جس کے اثرات موجودہ دور کی باقی ماندہ مسیحیت میں بھی پائے جاتے ہیں۔

لیکن اسلام نے اس طرز تفکر کی بہت سختی سے مخالفت کی ہے کیونکہ اسکی نگاہ میں خواہشات کو کچل دینا یا دنیا کی لذتوں سے کنارہ کشی اختیار کر لینا انسانی مشکلات کا حل نہیں ہے۔

بلکہ خداوند عالم نے اسکی خلقت کے وقت اسکی جو فطرت بنادی ہے وہ اسی کے مطابق آگے قدم بڑھاتا ہے جس کی مزید وضاحت کے لئے قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمائیں:

﴿یابنی آدمَ خذوا زینتکم عند کل مسجدٍ وکلوا واشربوا ولاتُسرفوا انّہ لا

یُحبّ المسرفین﴾(۱)

''اے اولادآدم ہر نماز کے وقت اور ہر مسجد کے پاس زینت ساتھ رکھواور کھاؤ پیو مگر اسراف نہ کرو کہ خدا اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا ہے''

دوسری آیۂ کریمہ:

﴿قل من حرّم زینةَ الله التی أخرج لعباده والطیبات من الرزق قل هی للذین آمنوا فی الحیاة الدنیا خالصةً یومَ القیامةِ کذلک نفصّل الآیات لقوم یعلمون☆قل إنما حرّم ربّیَ الفواحشَ ماظهرَ منها ومابطنَ والإثمَ والبغیَ بغیر الحقِ وأن تشرکوا باللّهِ مالم یُنزّل به سلطاناً وأن تقولوا علیٰ اللهِ مالا تعلمون﴾(۲)

''پیغمبرآپ پوچھئے کہ کس نے اس زینت کو جس کو خدا نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہےاور پاکیزہ رزق کوحرام کردیا۔اور بتائیے کہ یہ چیزیں روزقیامت صرف ان لوگوں کے لئے ہیں جو زندگانی دنیا میں ایمان لائے ہیں ہم اسی طرح صاحبان علم کے لئے مفصل آیات بیان کرتے ہیں۔کہہ دیجئے کہ ہمارے پروردگار نے صرف بدکاریوں کوحرام کیا ہے چاہے وہ ظاہری ہوں یا باطنی اور گناہ اور ناحق ظلم اور بلا دلیل کسی چیز کو خدا کا شریک بنانے اور بلا جانے بوجھے کسی بات کو خدا کی طرف منسوب کرنے کوحرام قرار دیا ہے''

مختصر یہ کہ یہ آیۂ کریمہ:

﴿یابنی آدم خذوا زینتکم عند کل مسجد وکلوا واشربوا ولا تسرفوا﴾

ہرانسان کو یہ دعوت دے رہی ہے کہ وہ دنیاوی لذتوں سے خوب فائدہ اٹھائے بس شرط یہ

---

(۱)سورۂ اعراف آیت ۳۱۔

(۲)سورۂ اعراف آیت ۳۲۔۳۳۔

ہے کہ اسراف نہ کرے۔ اسکے بعد دوسری آیت میں ان لوگوں کی مذمت ہے جنھوں نے خداوند عالم کی حلال کردہ پاک و پاکیزہ چیزوں کو حرام (ممنوع) کردیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿قل من حرّم زينة اللهِ التى أخرج لعباده والطيباتِ من الرزق﴾

آیت میں اس بات کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ دنیا اور اسکی تمام نعمتیں اور سہولتیں در اصل مومنین کے لئے ہیں لیکن غیر مومنین کو بھی ان سے استفادہ کی اجازت دیدی گئی ہے لیکن آخرت کی تمام نعمتیں صرف اور صرف مومنین کے لئے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿قل هى للذين آمنوا فى الحياة الدنيا خالصةً يوم القيامة﴾

آیت نے یہ وضاحت بھی کردی ہے کہ خداوند عالم نے صرف اس دنیا کی پوشیدہ اور آشکار تمام برائیوں اور گناہوں سے منع کیا ہے اور اسکے علاوہ ہر چیز جائز قرار دی ہے۔

لہٰذا اسلام، دنیا سے قطع تعلق کرنے والے نظریات کو ٹھکرا کر خدا کی حلال اور پاکیزہ نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا حکم دیتا ہے اور جن لوگوں نے دنیا سے اپنا ناطہ توڑ کر خدا کی حلال کردہ اور پاکیزہ روزی کو حرام کررکھا ہے ان کے اس عمل کی سخت مذمت کرتا ہے۔ اللہ کی انہیں پاک و پاکیزہ نعمتوں میں سے ایک نعمت امتحان و آزمائش بھی ہے۔ جس کے ذریعہ وہ اپنے بندوں کو آزماتا رہتا ہے۔ اسکے باوجود خداوند عالم کی طرف سے یہ اجازت ہرگز نہیں ہے کہ ہم ان چیزوں سے بالکل کنارہ کشی اختیار کرلیں اور یا ان سے بالکل دور ہوجائیں بلکہ حکم الٰہی تو یہ ہے کہ صرف برائیوں سے محفوظ رہیں اور حدود الٰہی سے آگے قدم نہ بڑھائیں۔

چنانچہ روایت میں ہے کہ ایک بار ایک آدمی یہ کہہ رہا تھا:

﴿اللهم انّى أعوذ بك من الفتنة﴾

''بارالٰہا میں فتنہ سے تیری پناہ چاہتا ہوں''

اس جگہ حضرت علیؑ بھی موجود تھے جب آپ نے اس کی زبان سے یہ کلمات سنے تو فرمایا مجھے

محسوس ہورہا ہے کہ تم اپنی اولاد اور مال سے بھی خدا کی پناہ مانگ رہے ہو کیونکہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

﴿إنما أموالکم وأولادکم فتنة﴾

"بیشک تمہارے اموال اور اولاد فتنہ ہیں"

لہٰذا یہ نہ کہو کہ میں فتنوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں بلکہ اس طرح کہا کرو۔

﴿أللهم انّي أعوذبك من مضلاّت الفتن﴾(۱)

"بارالٰہا میں گمراہ کن فتنوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں"

مولائے کائناتؑ کا یہ ارشاد گرامی ہے:

﴿لایقولنّ أحدکم:اللهم انّي أعوذبك من الفتنة،لأنه لیس احد الاّ و هو مشتمل علیٰ فتنة،ولکن من استعاذ فلیستعذ من مضلات الفتن،فان الله سبحانه یقول:﴿واعلموا أنّما أموالکم وأولادکم فتنة﴾(۲)

"تم یہ ہرگز نہ کہو! بارالٰہا میں فتنہ سے تیری پناہ چاہتا ہوں کیونکہ تمہارے درمیان کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جسکا دارومدار فتنہ پر نہ ہو لہٰذا جس کو خدا سے پناہ چاہئے وہ گمراہ کن فتنوں سے اللہ کی پناہ طلب کرے" کیونکہ خداوند عالم کا ارشاد گرامی ہے:

"یاد رکھو! بیشک تمہارے اموال اور اولاد فتنہ ہیں"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خواہشات کو قابو میں رکھنے اور کنٹرول کرنے کے بارے میں اسلام نے جو حکم دیا ہے اس کا نتیجہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام نے اس کے ذریعہ خواہشات کو کنٹرول کرنے کے لئے ایک جدید نظریہ اور نظام تربیت پیش کیا ہے اور اس نظریہ کو عصمتوں کا نظام کہا جاتا ہے۔

---

(۱) بحار الانوار ج ۹۳ ص ۲۳۵۔

(۲) سورۂ انفال آیت ۲۸۔

کیونکہ عصمتوں (بچانے والی خصلتوں) کی مثال ایسی ہی ہے جیسے بجلی یا آگ کا کام کرتے وقت ہم دستانے یا واٹر پروف کپڑے پہن لیتے ہیں اور کسی خطرے کے بغیر بڑی آسانی سے اسکا ہر کام کر لیتے ہیں اسی طرح اگر انسان چاہے تو عصمتوں کے سہارے دنیا کی رنگینیوں اور فتنوں کے درمیان بڑی آسانی سے زندگی گذار سکتا ہے اور ان کی موجودگی میں اسے کوئی نقصان بھی نہیں پہنچے گا۔لہٰذا جس طرح صرف آگ کی حرارت یا بجلی کے کرنٹ کے خطرات کی بناء پر ان کا استعمال ترک کر دینا صحیح نہیں ہے اور دوسروں کو اس سے منع کرنا بھی غلط ہے کیونکہ دستانے اور واٹر پروف لباس وغیرہ کے سہارے ان سے ہر کام لیا جا سکتا ہے۔اسی طرح لوگوں کو دنیا کی آزمائشوں سے دور رکھنا صحیح نہیں ہے کیونکہ ان کے مال واولاد بھی ایک قسم کی آزمائش اور فتنہ ہیں لہٰذا ہر شخص کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ان گمراہ کن اور آزمائش طلب مقامات پر ان عصمتوں سے اچھی طرح استفادہ کرے جو اسے ان سے محفوظ رکھیں۔کیونکہ اگر یہ عصمتیں کسی کی ذاتی یا سماجی زندگی میں تکامل کی منزل تک پہنچ جائیں تو پھر انسان اپنی خواہشات اور ہوی وہوس کا مختار کل بن جاتا ہے جس کی طرف روایت میں صریحاً اشارہ موجود ہے کہ دنیا میں دو طرح کے انسان پائے جاتے ہیں کچھ وہ ہیں جن کی خواہش اور ہوی وہوس ان پر غالب ہے اور کچھ لوگ ایسے ہیں جن کی خواہشات پر ان کا مکمل کنٹرول ہے لہٰذا کیونکہ خواہشات پر کنٹرول کرنا ممکن ہے اسی لئے اسلام میں دنیا کے راحت وآرام سے منع نہیں کیا گیا ہے البتہ اتنا ضروری ہے کہ جسے دنیا سے دل چسپی ہے وہ خواہشات اور ہوی وہوس پر مکمل کنٹرول کرلے اسکے بعد چاہے جس نعمت دنیا کو استعمال کرے،ہدایت اور ہوائے نفس کے درمیان یہی معیار اور حد فاصل ہے۔

امام جعفر صادقؑ: ﴿من ملك نفسه اذا غضب،واذا رهب،واذا اشتهىٰ،حرّم الله جسده علىٰ النار﴾(۱) ''جو شخص غصہ،خوف اور خواہشات ابھرنے کی حالت میں اپنے نفس کو

---

(۱)بحارالانوار ج ۷۸ ص ۲۴۳۔

قابو میں رکھے گا خداوند عالم اسکے جسم کو جہنم پر حرام کردیگا"

﴿من ملك نفسه اذا رغب، واذا رهب، واذا اشتهىٰ، واذا غضب، واذا رضى حرّم الله جسده علىٰ النار﴾(۱)

"جو شخص رغبت، خوف اور خواہشات ابھرنے اور غصہ یا خوشی کی حالت میں اپنے نفس کو قابو میں رکھے خداوند عالم اسکے جسم کو جہنم پر حرام کردیگا"

عصمتوں کی قسمیں

ہر انسان کے اندر تین طرح کی عصمتیں پائی جاتی ہیں:

۱۔ کچھ عصمتیں ایسی ہیں جن کو خداوند عالم نے انسانی فطرت کی تکوینی خلقت اور تربیت کی گہرائیوں میں ودیعت فرمایا ہے جیسے حیا، عفت اور رحم دلی وغیرہ۔۔۔یہی وجہ ہے کہ انسان اور حیوان دونوں کے اندر یکساں طور پر جنسی خواہشات موجود ہیں البتہ ان کے درمیان اتنا فرق ضرور ہے کہ حیوانوں میں یہ جذبہ بالکل ہی واضح اور ظاہر ہے جبکہ انسان کے اس جذبہ کے اوپر حیاء وعفت کے پردے پڑے ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ حیوانوں کو اسکی تسکین میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی لیکن انسان کو اسکی تسکین سے بہت ساری جگہوں پر پرہیز کرنا پڑتا ہے۔ظاہر ہے کہ یہ انسان کی جنسی کمزوری کی بناء پر نہیں ہے۔بلکہ حیاء وشرم وعفت جیسی عصمتیں اسکے لئے مانع ہوجاتی ہیں کیونکہ یہ جنسی خواہش کو متعادل، لطیف اور کمزور بنادیتی ہیں اور اس پر روک لگا کر اسے مختلف طریقوں سے ابھرنے نہیں دیتیں۔

اسی طرح جذبۂ رحمت (رحم دلی) سے کافی حد تک انسان کا غصہ ٹھنڈا ہوجاتا ہے یہی وجہ

---

(۱) بحار الانوار ج۷۱ص ۳۵۸

ہے کہ اگر چہ انسان اور حیوان دونوں کے اندر ہی غصہ کا مادہ پایا جاتا ہے مگر حیوان کے اندر اسکے آگے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی لیکن انسان کے یہاں اسکے اوپر رحمت (رحم دلی) کا سائبان ہے جس سے وہ بآسانی معتدل ہوجاتا ہے۔

۲۔ کچھ عصمتیں وہ ہیں جن کو انسان اپنی ذاتی صلاحیت اور محنت سے حاصل کرتا ہے اور ہر انسان کی زندگی میں اسکی تربیت ان عصمتوں کے حصول میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ جیسے ذکر الٰہی، نماز، روزہ، تقویٰ وغیرہ۔۔۔کیونکہ نماز برائی سے روکتی ہے، ذکر الٰہی سے شیطان دور ہوجاتا ہے روزہ جہنم کی سپر ہے۔ اور تقویٰ ایسا لباس ہے جو انسان کو گناہوں اور برائیوں کے مہلک ڈنک سے محفوظ رکھتا ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿ولباس التقوی ذلك خیر﴾(۱)

''لیکن تقویٰ کا لباس سب سے بہتر ہے''

۳۔ عصمتوں کی تیسری قسم وہ ہے جسے خداوند عالم نے انسان کی معاشرتی زندگی میں ودیعت کیا ہے جیسے دیندار سماج اور معاشرہ یا شادی بیاہ وغیرہ۔۔۔کیونکہ دیندار سماج اور معاشرہ بھی انسان کو برائیوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ اور شادی (شوہر اور زوجہ) دونوں کو بے شمار برائیوں سے بچالیتی ہے۔

فی الحال ہم آپ کے سامنے نفس کے اندر اللہ کی ودیعت کردہ ان عصمتوں کے دو نمونوں (خوف وحیا) کی وضاحت پیش کررہے ہیں۔

خوف الٰہی

خداوند عالم نے انسان کے اندر جو عصمتیں ودیعت فرمائی ہیں ان کے درمیان خوف الٰہی

---

(۱) سورۂ اعراف آیت ۲۶۔

(۱) سورۂ اعراف آیت ۲۶

سب سے اہم اور بڑی عصمت ہے جس کو حدیث میں عقل کا ایک لشکر قرار دیا گیا ہے اور یہ خواہشات کو کنٹرول کرنے کا سب سے بہترین ذریعہ ہے۔

جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وأمّا من خاف مقام ربّه ونهي النفس عن الهوىٰ فانّ الجنة هي المأوىٰ﴾(۱)

''اور جس نے رب کی بارگاہ میں حاضری کا خوف پیدا کیا ہے اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکا جنت اسکا ٹھکانا اور مرکز ہے''

اس آیۂ کریمہ سے بالکل صاف روشن ہے کہ خوف الٰہی اور نفس کو خواہشات سے روکنے کے درمیان ایک قریبی رابطہ پایا جاتا ہے۔

اسی آیت کے بارے میں امام صادقؑ سے روایت ہے کہ:

﴿من علم أن الله يراه ويسمع مايقول، ويعلم مايعمله من خير أو شر، فيحجزه ذلك عن القبيح، فذلك الذی خاف مقام ربّه، ونهي النفس عن الهوىٰ﴾(۲)

''یعنی جسے یہ علم ہو جائے کہ خداوند عالم اسے دیکھ رہا ہے اور اسکی ہر بات سنتا ہے اور اسکے ہر اچھے یا برے عمل پر اسکی نظر ہے تو یہی خیال اسکو برائی سے روک دیگا اور اسی انسان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے رب سے خوفزدہ ہو گیا اور اس نے اپنے نفس کو اپنی ہوس (خواہشات) سے باز رکھا''

امیر المومنینؑ:

﴿الخوف سجن النفس من الذنوب، ورادعها عن المعاصي﴾(۳)

---

(۱) سورۂ نازعات آیت ۴۰، ۴۱۔

(۲) اصول کافی ج۲ ص ۷۱۔

(۳) میزان الحکمت ج۳ ص ۱۸۳۔

"خوف الٰہی انسان کے نفس کو گناہوں اور برائیوں سے بچانے والا حصار ہے"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

﴿سبعة يظلّهم الله يو م لاظل الاظله،الامام العادل،وشاب نشأ بعبادة اللّٰه عزوجل،ورجل قلبه معلّق في المساجد ،ورجلان تحابّا في اللّه عزوجل اجتمعا عليه وتفرقاعليه،ورجل تصدّق بصدقة فأخفاها حتى لاتعلم شماله ماتنفق يمينه، ورجل ذكر الله خالياً ففاضت عيناه،ورجل دعته امرأة ذات منصب وجمال فقال انّي أخاف اللّٰه عزّ وجل﴾(۱)

"سات افراد کے اوپر اس دن رحمت الٰہی سایہ فگن ہوگی جس دن اسکے علاوہ اور کوئی سایہ موجود نہ رہے گا:۱۔امام عادل۔۲۔وہ جوان جسکی نشو ونما عبادت الٰہی میں ہوئی ہو۔۳۔جسکا دل مسجدوں سے وابستہ ہو۔۴۔خداوندعالم کے لئے ایک دوسرے سے محبت کرنے والے جو اسی کے نام پر جمع ہوں اور اسکی وجہ سے ایک دوسرے سے جدا ہوجائیں (یعنی ان کی ہر محبت اور دشمنی خدا کے لئے ہو)۔۵۔جو شخص اس طرح چھپا کر صدقہ دے کہ اگر ایک ہاتھ سے دے تو دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔۶۔جو گوشہ تنہائی میں ذکر الٰہی کرے اور اسکی آنکھ سے آنسو نکل آئیں۔۷۔وہ مرد جسے کوئی حسین وجمیل اور صاحب منصب عورت اپنی طرف دعوت دے اور وہ اس سے یہ کہدے کہ مجھے خدا سے ڈرلگتا ہے"۔

گویا خوف الٰہی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو اسکی سب سے خطرناک خواہش اور ہوس یعنی جنسی جذبہ سے بھی روک دیتی ہے اور انسان گناہوں اور برائیوں سے بچ جاتا ہے

حضرت علیؑ:

﴿العجب ممن يخاف العقاب فلم يكف،ورجى الثواب

---

(۱) صحیح بخاری بحث وجوب نماز جماعت باب ۸، بحث وجوب زکات باب ۱۸ کتاب رقاق باب ۲۳ (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

فلم یتب ویعمل﴾(۱)

''اس شخص پر حیرت ہے جسے سزا کا خوف ہو مگر پھر بھی برائی سے نہ رکے اور ثواب کی امید رکھتا ہو اور اسکے باوجود توبہ کر کے نیک عمل انجام نہ دے''

امام محمد باقرؑ:

﴿لاخوف کخوف حاجز ولا رجاء کرجاء معین﴾(۲)

''برائیوں سے روکنے والے خوف سے بہتر کوئی خوف نہیں اور نیکیوں میں معاون ثابت ہونے والی امید سے بہتر کوئی امید نہیں ہے''

مولائے کائناتؑ:

﴿نعم الحاجز من المعاصی الخوف﴾(۳)

''برائیوں سے روکنے والی سب سے بہترین چیز کا نام خوف ہے''

خوف ایک پناہ گاہ

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جو خوف اور ڈر، اضطراب سے پیدا ہوتا ہے اسی خوف سے اضطراب پیدا ہوجاتا ہے اور اگر چہ یہ امن وامان کے مقابل میں بولا جاتا ہے مگر اس کو اسلام نے انسان کے لئے امان اور ڈھال بنادیا ہے۔ کیونکہ خوف، انسان کو گناہوں اور برائیوں سے نہیں روکتا بلکہ درحقیقت یہ اسے ہلاکت اور بربادی سے بچانے والی ڈھال کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس خوف

کتاب محاربین باب ۴ صحیح مسلم در کتاب زکات باب ۳۰ اور ابوالفرج نے بھی اپنی کتاب ذم الہوی میں ص ۳۳۴ پر اس روایت کو نقل کیا ہے۔

(۱) بحارالانوار ج ۷۷ص ۲۳۷۔

(۲) بحارالانوار ج ۷۸ص ۱۶۴۔

(۳) میزان الحکمت ج ۳ ص ۱۸۳۔

کو انسان پہلی نظر میں خطرناک محسوس کرتا ہے وہی خوف انسان کی زندگی کو امن وامان عطا کرنے والی ایک نعمت ہے۔

اسی بارے میں حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

۱۔﴿الخوف امان﴾(۱)

''خوف ایک امان ہے''

۲۔﴿ثمرة الخوف الامان﴾(۲)

''خوف کا پھل امان ہے''

۳۔﴿خف ربك وارج رحمته، يؤمنك مما تخاف، و ينلك مارجوت﴾(۳)

''خدا سے ڈرتے رہو اور اسکی رحمت کی امید رکھو تو جس سے بھی تم خوفزدہ ہوگے وہ تمہیں اس سے بچائے رکھے گا اور جس کی امید ہے وہ تمہیں حاصل ہو جائے گا''

﴿لاينبغي للعاقل ان يقيم على الخوف اذا وجد الى الأمن سبيلا﴾(۴)

''کسی صاحب عقل وخرد کے لئے یہ ہرگز مناسب نہیں ہے کہ امن وامان کا راستہ مل جانے کے بعد خوف کی منزل میں پڑا رہے''

روایات میں جس خوف کا تذکرہ ہے اس سے مراد عذاب الٰہی سے امان ہے، اور امان سے مراد، عذاب خدا کا خوف ہے اور یہ اسلامی تہذیب وتمدن کے ایک متقابل اور حسین معنی ہیں۔ جس کا

---

(۱) میزان الحکمت ج ۳ ص ۱۸۶۔

(۲) گذشتہ حوالہ۔

(۳) گذشتہ حوالہ۔

(۴) گذشتہ حوالہ۔

مطلب یہ ہے کہ دنیا کا خوف آخرت کے لئے امن وامان ہے اور دنیا کا امن وامان اور بے فکری آخرت میں خوف بن جائے گا۔

امیر المومنینؑ نے یہ مفہوم پیغمبر اسلام کے کبھی خشک نہ رہنے والے چشمۂ فیاض سے اخذ فرمایا ہے جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ خداوند عالم کا ارشاد گرامی ہے:

﴿وعزتی وجلالی لاأجمع علی عبدی خوفین ولاأجمع له امنین،فاذاامننی فی الدنیااخفته یوم القیامة،واذاخافنی فی الدنیاآمنته یوم القیامة﴾(۱)

''میری عزت وجلالت کی قسم میں اپنے کسی بندے کو دو خوف یا دو امان (ایک ساتھ) نہ دونگا پس اگر وہ دنیا میں مجھ سے امان میں رہا تو قیامت میں اسے خوف میں مبتلا کردونگا اور اگر وہ دنیا میں مجھ سے خوفزدہ رہا تو آخرت میں اسے امن وامان عطا کردونگا''

چند واقعات

ہر انسان کو برائیوں اور گناہوں سے بچانے میں خوف الٰہی کیا کردار ادا کرتا ہے؟ اسکی مزید وضاحت کے لئے ہم چند واقعات پیش کر رہے ہیں جن میں سے بعض واقعات روایات میں بھی موجود ہیں۔

۱۔ابن جوزی کا بیان ہے کہ مجھ سے عثمان بن عامر تیمی نے بیان کیا ہے کہ ان سے ابو عمر تیمی بن عاص تیمی نے بیان کیا تھا کہ: ''حی'' نامی ایک جگہ کا ایک آدمی حج کے لئے گھر سے نکلا ایک رات پانی کے ایک چشمہ پر اس نے ایک عورت کو دیکھا جسکے بال اسکے کاندھوں پر بکھرے ہوئے تھے وہ کہتے ہیں کہ میں نے اس کی طرف سے اپنا منھ پھیر لیا تو اس نے کہا کہ تم نے میری طرف سے منھ کیوں پھرلیا؟ میں نے جواب دیا کہ مجھے خداوند عالم سے ڈرلگتا ہے۔چنانچہ اس نے اپنا آنچل سر پر

---

(۱) کنز العمال،متقی ھندی حدیث ۵۸۷۸۔

ڈال کر کہا: تم بہت جلدی خوف زدہ ہو گئے جبکہ تم سے زیادہ تو اسے ڈرنا چاہیئے جو تم سے گناہ کا خواہشمند ہے۔

پھر جب وہ وہاں سے واپس پلٹی تو میں اسکے پیچھے پیچھے ہولیا اور وہ عرب دیہاتیوں کے کسی خیمے میں چلی گئی چنانچہ جب صبح ہوئی تو میں اپنی قوم کے ایک بزرگ کے پاس گیا اور ان سے پورا ماجرا بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس جوان لڑکی کا حسن و جمال اور چال ڈھال ایسی تھی: تو وہیں ایک بوڑھا آدمی بیٹھا تھا وہ فوراً بول پڑا خدا کی قسم وہ میری بیٹی ہے۔ میں نے کہا کیا آپ اس سے میری شادی کر سکتے ہیں؟ اس نے جواب دیا اگر تم اسکے کفو ہوئے تو ضرور کرونگا۔ میں نے کہا: خدا کا ایک مرد ہوں اس نے کہا نجیب کفو ہے چنانچہ وہاں سے چلنے سے پہلے ہی میں نے اس سے شادی کر لی اور ان سے یہ کہدیا کہ جب میں حج سے واپس پلٹوں گا تو اسے میرے ساتھ رخصت کر دینا چنانچہ جب میں حج سے واپس پلٹا تو اسے بھی اپنے ساتھ کوفہ لے آیا اور اب وہ میرے ساتھ رہتی ہے اور اس سے میرے چند بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔ (۱)

۲۔ مکہ میں ایک حسین وجمیل عورت اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی اس نے ایک دن آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر اپنے حسن و جمال کی تعریف کرتے ہوئے اپنے شوہر سے کہا، ذرا بتائے آپ کی نظر میں کیا کوئی ایسا ہے جو اس حسن و جمال کو دیکھ کر نہ بہکنے پائے؟

شوہر نے کہا ہاں کیوں نہیں، پوچھا کون ہے؟ جواب دیا عبید بن عمیر، عورت نے کہا: اگر تم مجھے اجازت دو تو میں آج اسے بہکا کر دکھاؤں گی؟ کہا: جاؤ تمہیں اجازت ہے۔ چنانچہ وہ گھر سے نکلی اور مسئلہ پوچھنے کے بہانے اسکے پاس پہونچی اس نے اسے مسجد الحرام کے اندر تنہائی میں ملنے کا موقع دے دیا، تو اس نے اسکے سامنے چاند کی طرح چمکتے ہوئے اپنے چہرہ سے نقاب الٹ دی، تو اس

---

(۱) ذم الہوی لابن جوزی ص ۲۶۴۔ ۲۶۵۔

نے کہا: اے کنیز خدا، عورت بولی: میں آپ کے اوپر فریفتہ ہوگئی ہوں لہٰذا اس معاملہ میں آپ کی رائے کیا ہے؟ اس نے کہا میں تم سے چند سوال کرنا چاہتا ہوں اگر تم نے میری تصدیق کردی تو میں تمھیں اپنی رائے بتادوں گا، وہ بولی جو کچھ تم پوچھو گے میں سچ سچ جواب دوں گی۔ کہا: ذرا یہ بتاؤ اگر ملک الموت تمہاری روح قبض کرنے کے لئے آئیں تو اس وقت تمہیں اچھا لگے گا کہ میں تمہاری یہ تمنا پوری کردوں؟ وہ بولی بخدا ہرگز نہیں۔ کہا: تم نے سچ کہا ہے۔ پوچھا اگر تمہیں تمہاری قبر میں اتار دیا جائے اور سوال کرنے کے لئے بٹھایا جائے تو اس وقت تمہیں اچھا معلوم ہوگا کہ میں تمہاری یہ تمنا پوری کردوں؟ وہ بولی بخدا نہیں، کہا تم نے سچ جواب دیا۔ پھر پوچھا یہ بتاؤ کہ جب روز قیامت تمام لوگوں کے ہاتھ میں نامۂ اعمال دے جارہے ہوں گے اور تم کو یہ معلوم نہ رہے کہ تمہارا نامہ عمل داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا یا بائیں ہاتھ میں (یعنی نامۂ عمل خراب ہے یا اچھا) اس وقت کیا تم یہ پسند کروگی کہ میں تمہاری یہ حاجت پوری کردوں؟ بولی بخدا نہیں۔ پھر سوال کیا بتاؤ جب سب کو میزان کے اوپر کھڑا کیا جارہا ہوگا اور تمھیں یہ معلوم نہ ہو کہ تمہارا نامۂ عمل وزنی ہے یا ہلکا تو کیا تمہیں اس وقت خوشی ہوگی کہ میں تمہاری یہ تمنا پوری کردوں؟ بولی بخدا نہیں۔ کہا تم نے صحیح جواب دیا۔ پھر پوچھا اگر تمھیں سوال اور جواب کے لئے خدا کے سامنے کھڑا کیا جائے اور میں تمہاری یہ تمنا پوری کردوں تو کیا اس وقت تم کو اچھا لگے گا؟ بولی بخدا نہیں۔ کہا تم نے سچ کہا ہے، تو اس نے کہا: اے کنیز خدا، ذرا خدا سے ڈرو اس نے تم کو یہ نعمت دے کر تمہارے اوپر احسان کیا ہے یہ سن کر وہ اپنے گھر واپس آ گئی شوہر نے پوچھا کہو کیا کر کے آئی ہو؟ وہ بولی تم فضول ہو اور ہم سب کے سب فضول ہیں اور اسکے بعد وہ مستقل نماز، روزہ اور عبادت میں مشغول ہوگئی وہ کہتا ہے کہ اسکا شوہر یہ کہتا رہتا تھا کہ بتاؤ عبید بن عمیر سے میری کیا دشمنی تھی؟ جس نے میری بیوی کو برباد کردیا وہ کل تک تو ایک بیوی کی طرح تھی اور اب اس نے اسے راہبہ

بناڈالا۔(۱)

۳۔ابوسعد بن ابی امامہ نے روایت کی ہے ایک مرد ایک عورت سے محبت کرتا تھا، اور وہ بھی اسے چاہنے لگی ایک دن یہ دونوں کسی جگہ ایک دوسرے سے ملے تو عورت نے اسے اپنی طرف دعوت دی، اس نے جواب دیا: میری موت میرے قبضہ میں نہیں ہے اور تمہاری موت بھی تمہارے بس سے باہر ہے ایسا نہ ہو کہ ابھی موت آجائے اور ہم دونوں گناہکار اور مجرم کی صورت میں خداوند عالم کے دربار میں پہونچ جائیں، بولی: تم سچ کہہ رہے ہو، چنانچہ اسی وقت دونوں نے توبہ کر لی اور اسکے بعد دونوں راہ راست پر آگئے۔(۲)

۴۔خارجہ بن زید کا بیان ہے کہ بنی سلیمہ کے ایک شخص نے مجھ سے اپنا یہ ماجرا بیان کیا ہے کہ میں ایک عورت کا عاشق ہو گیا تھا اور جب بھی وہ مسجد سے نکل کر جاتی تھی میں بھی اسکے پیچھے چل دیتا تھا اور اسے بھی میری اس حرکت کا علم ہو گیا۔ چنانچہ اس نے ایک رات مجھ سے کہا تمھیں مجھ سے کچھ کام ہے؟ میں نے کہا ہاں۔ بولی: کیا کام ہے؟ میں نے جواب دیا تمہاری محبت۔ اس نے کہا کہ اسے گھاٹے والے دن (روز قیامت) پر چھوڑ دو، اسکا بیان ہے کہ: خدا کی قسم اس نے مجھے رلا دیا جسکے بعد میں نے پھر یہ حرکت نہ کی۔(۳)

۵۔بنی عبدالقیس کے ایک بزرگ کی روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے قبیلہ والوں سے سنا ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت کو اپنی طرف دعوت دی تو وہ بولی تم نے حدیث سنی ہے اور قرآن پڑھا ہے تم پڑھے لکھے ہو، پھر مرد نے عورت سے کہا کہ: محل کے دروازے بند کر دو، تو اس نے دروازے بند کر دئے مگر جب وہ مرد اسکے نزدیک ہوا تو وہ عورت بولی کہ ابھی ایک دروازہ کھلا رہ گیا

---

(۱)ذم الہوی لا بن جوزی ص ۲۶۵۔۲۶۶۔

(۲)ذم الہوی لا بن جوزی ص ۲۶۸۔

(۳)ذم الہوی لا بن جوزی ص ۲۷۲۔

ہے جو مجھ سے بند نہیں ہوسکا۔اس نے کہا کون سا دروازہ؟ جواب دیا: وہ دروازہ جو تمہارے اور تمہارے پروردگار کے درمیان کھلا ہے یہ سن کر اس نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔(۱)

۶۔ابن جوزی کا بیان ہے کہ ہمیں یہ اطلاع ملی کے بصرہ کی زاہدہ وعابدہ خاتون ایک مہلبی مرد(۲) کے چنگل میں پھنس گئی ہے، کیونکہ وہ بہت خوبصورت تھی اور جو کوئی اسے شادی کا پیغام دیتا تھا تو وہ منع کردیتی تھی چنانچہ مہلبی کو یہ خبر ملی کے وہی عورت حج کرنے جاری ہے، تو اس نے تین سو اونٹ خریدے اور یہ اعلان کردیا کہ جو حج کرنے کا ارادہ رکھتا ہے وہ مجھ سے اونٹ کرائے پر لے سکتا ہے۔چنانچہ اس عورت نے بھی اس سے کرایہ پر ایک اونٹ لے لیا۔ایک دن راستہ میں وہ رات کے وقت اسکے پاس آیا اور کہا یا تم مجھ سے شادی کرو، ورنہ! عورت نے جواب دیا: تم پر وائے ہو ذرا خدا کا خوف کرو، تو اس نے کہا: ذرا کان کھول کر سنو، خدا کی قسم میں کوئی اونٹوں کا ساربان (اونٹ والا) نہیں ہوں بلکہ میں تو اس کام کے لئے صرف اور صرف تمہاری وجہ سے نکلا ہوں، للہذا جب عورت نے اپنی آبرو خطرے میں دیکھی تو کہا کہ اچھا جاؤ یہ دیکھو کہ کوئی جاگ تو نہیں رہا ہے؟ اس نے کہا کوئی نہیں جاگ رہا ہے وہ پھر بولی ایک بار اور دیکھ آؤ چنانچہ وہ گیا اور جب واپس پلٹ کر آیا تو کہا: ہاں سب کے سب سو چکے ہیں تو عورت نے کہا: تجھ پر وائے ہو، کیا رب العالمین کو بھی نیند آگئی ہے؟(۳)

حیاء

عقل کے لشکر کی ایک اور صفت "حیاء" بھی ہے یہ بھی انسان کو تباہی اور بربادی سے بچانے میں اہم کردار کرتی ہے۔چنانچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص کو خداوند عالم یا اسکے بندوں کی حیاء نہ ہو تو وہ گناہوں میں مبتلا ہوجاتا ہے اور اسے اسکی عقل بھی نہیں روک پاتی ہے۔ایسے حالات میں

---

(۱) ذم الہوی لابن جوزی ص ۲۷۴۔

(۲،۳) مہلب: ایک ثروت مند قبیلہ کا نام، ذم الہوئی لابن جوزی ص ۲۷۷۔

صرف حیاء ہی اسکو گناہ سے بچاتی ہے۔

حیاء (چاہے جس مقدار میں ہو اس) کے اندر عصمت کے مختلف درجات پائے جاتے ہیں جیسے اعزاء و اقرباء سے شرم وحیاء میں جو عصمت پائی جاتی ہے وہی غیروں سے حیاء کے وقت ایک درجہ اور بڑھ جاتی ہے اسی طرح انسان جس کا احترام کرتا ہے اور اسکی تعظیم کا قائل ہے اسکے سامنے حیاء کی وجہ سے اسکے اندر اس سے اعلیٰ درجہ کی عصمت پیدا ہو جاتی ہے۔

آخر کار پروردگار عالم سے حیاء کرنے کی وجہ سے انسان عصمت کے سب سے بلند درجہ کا مالک ہو جاتا ہے۔لہٰذا اگر انسان اپنے نفس کے اندر خداوند عالم کی حیاء پیدا کرلے اور اس کو اچھی طرح اپنے وجود میں راسخ کرلے اور خدا اور اسکے فرشتوں کو ہمیشہ اپنے اوپر حاضر وناظر سمجھے تو اس احساس کے اندر اتنی اعلیٰ درجہ کی عصمت پائی جاتی ہے جو اس کو ہر طرح کی نافرمانی، گناہ اور لغزشوں سے بچا سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے حیاء

یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی انسان کے دل میں خداوند عالم کا خیال موجود ہو اور وہ اسے حاضر وناظر بھی سمجھ رہا ہو اور اسے یہ بھی یاد ہو کہ خداوند عالم کے علاوہ اسکے معین کردہ فرشتے بھی اس سے اتنا نزدیک ہیں کہ خداوند عالم نے ان سے اسکا جو عمل پوشیدہ رکھتا ہے اسکے علاوہ اسکا کوئی عمل ان سے پوشیدہ نہیں ہے اور پھر بھی وہ گناہ کا مرتکب ہو جائے چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب ابوذرؓ کو جو وصیت فرمائی تھی اس میں یہ بھی ہے کہ اے ابوذر خداوند عالم سے شرم وحیاء کرو اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے میرا حال تو یہ ہے کہ جب میں بیت الخلاء کے لئے جاتا ہوں تو اپنے دونوں فرشتوں سے شرم وحیاء کی بنا پر اپنے چہرے پر کپڑا ڈال لیتا ہوں۔

حیاء کا وہ ارفع واعلیٰ درجہ جو خداوند عالم نے اپنے رسول کو عنایت فرمایا ہے وہ دنیا میں بہت کم افراد کو نصیب ہوا ہے۔مختصر یہ کہ جب انسان کے نفس کے اندر اور اسکے شعور وادراک میں اچھی

طرح حیائے الٰہی جلوہ فگن ہو جاتی ہے تو پھر اسے گناہوں، برائیوں نیز ہوس کے مہلک خطرات کے سامنے سپر انداختہ نہیں ہونے دیتی ہے۔

جب اپنے جیسے دوسرے انسانوں سے شرم وحیاء کی بناء پر انسان نہ جانے کتنے ایسے کام نہیں کرتا ہے جنہیں ان کی عدم موجودگی یا تنہائی میں انجام دے لیتا ہے تو اگر اسکے اندر خداوند عالم سے حیاء کا مادہ پیدا ہو جائے تو پھر خداوند عالم کی ناپسندیدہ چیزوں سے وہ بدرجۂ اولیٰ پرہیز کریگا اور اسکے لئے ملاء عام (علی الاعلان) اور گوشہ تنہائی میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا۔ اس لئے کہ خداوند عالم ہر جگہ حاضر وناظر ہے۔ اور یہ تو ممکن ہے کہ کوئی شخص، بندوں سے کوئی بات پوشیدہ رکھ لے لیکن خداوند عالم سے اسکی کوئی بات ہرگز پوشیدہ نہیں رہ سکتی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

﴿یاأباذراستح من الله،فانی والذی نفسی بیده لأظل حین أذهب الیٰ الغائط متقنعاًبثوبی استحی من المَلکین الذین معی﴾ (۱)

''اے ابوذر، خداوند عالم سے حیاء کرو، کیونکہ اس ذات کی قسم جسکے قبضہ میں میری جان ہے میں جب بھی بیت الخلاء کے لئے جاتا ہوں تو اپنے ہمراہ دونوں فرشتوں سے شرم وحیاء کی وجہ سے اپنے چہرہ کو ڈھانپ لیتا ہوں''

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

﴿استح من الله استحیاء ك من صالح جیرانك،فان فیهازیادة الیقین﴾ (۲)

''خداوند عالم سے اس طرح شرم وحیاء کرو جس طرح تم اپنے نیک اور صالح پڑوسی سے

---

(۱) بحار الانوار ج۷۷ص۸۳وکنز العمال ح۵۷۵۱۔

(۲) بحار الانوار ج۷۸ص۲۰۰۔

شرماتے ہو کیونکہ اس سے یقین میں اضافہ ہوتا ہے''

آپ ہی سے یہ بھی مروی ہے:

﴿لیستحِ أحدکم من ملکیه الذین معه، کما یستحی من رجلین صالحین من جیرانه، وهما معه باللیل و النهار﴾ (۱)

''اپنے فرشتوں سے تم اسی طرح شرم وحیا کیا کرو جس طرح تم اپنے دو صالح اور نیک پڑوسیوں سے شرماتے ہو کیونکہ یہ فرشتے رات دن تمہارے ساتھ رہتے ہیں''

خداوند عالم سے ہر حال میں شرم وحیا کے بارے میں امام کاظمؑ سے نقل ہوا ہے:

﴿استحیوا من الله فی سرائرکم، کما تستحون من الناس فی علانیتکم﴾ (۲)

''تنہائی میں خداوند عالم سے اسی طرح شرم وحیا کیا کرو جس طرح لوگوں کے سامنے تمھیں حیا آتی ہے''

مختصر یہ کہ اگر کسی کے اندر خداوند عالم سے حیا کا عرفان پیدا ہو جائے تو وہ عصمت کے بلند ترین درجہ پر فائز ہو سکتا ہے اور اسکے لئے ملاء عام یا گوشۂ تنہائی میں کوئی فرق نہیں ہے اسکے لئے روایات میں مختلف تعبیرات ذکر ہوئی ہیں۔

حضرت علیؑ:

﴿الحیاء یصدّ عن الفعل القبیح﴾ (۳)

''حیا برائیوں سے روک دیتی ہے''

آپ ہی نے یہ بھی فرمایا ہے:

---

(۱) میزان الحکمت ج۲ ص ۵۶۸۔

(۲) بحار الانوار ج۷۸ ص ۳۰۹۔

(۳) میزان الحکمت ج۲ ص ۵۶۴۔

﴿علیٰ قدر الحیاء تکون العفة﴾(۱)

''حیا کی مقدار کے برابر ہی عفت بھی ہوتی ہے''

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

﴿استحیوا من اللہ حق الحیاء،فقیل یارسول اللہ:ومن یستحی من اللہ حق الحیاء؟فقال:من استحییٰ من اللہ حق الحیاء فلیکتب أجله بین عینیه،ولیزهد فی الدنیاوزینتها،ویحفظ الرأس وماحویٰ والبطن وماوعیٰ﴾

''خداوند عالم سے ایسی حیا کرو جو حیا کرنے کا حق ہے سوال کیا گیا خداوند عالم سے حیا کرنے کا جو حق ہے اسکا کیا طریقہ ہوگا؟ آپ نے فرمایا کہ جو خداوند عالم سے واقعاً حیا کرنا چاہتا ہے وہ اپنی موت کو اپنی دونوں آنکھوں کے سامنے مجسم کرلے (اپنی پیشانی پر لکھ لے) اور دنیا اور اس کی زینتوں سے اجتناب کرے اور اپنے سر اور جو کچھ اس میں ہے اور اپنے پیٹ اور جو اسکے اندر بھرا ہے ان سے محفوظ رہے''(۲)

امام موسیٰ کاظمؑ:

﴿رحم اللہ من استحییٰ من اللہ حق الحیاء،فحفظ الرأس وماحویٰ،والبطن وماوعیٰ﴾(۳)

''اللہ تعالی اس بندے پر رحم کرے جسکو اس سے واقعاً حیا آتی ہو اور اسی لئے وہ اپنے سر کے وسوسوں اور پیٹ کی شہوتوں سے اپنے کو محفوظ رکھے''

روایت میں سر اور معدہ کا تذکرہ اس لئے کیا گیا ہے کہ اکثر شہوتیں انہیں دونوں جگہوں سے

---

(۱) گذشتہ حوالہ۔

(۲) بحار الانوار ج ۷۰ ص ۳۰۵۔

(۳) بحار الانوار ج ۷۰ ص ۳۰۵۔

جنم لیتی ہیں مثلاً اگر آنکھیں شہوت کا ایک دروزہ اور کان دوسرا دروازہ ہے تو معدہ (پیٹ) شہوت کی پیدائش کا پہلا مرکز اور شرم گاہ دوسرا مرکز ہے۔

لہٰذا جب انسان کے اندر شرم وحیاء پیدا ہوجاتی ہے تو پھر ذہن ودماغ کے برے خیالات (سر کے وسوسے) اور پیٹ کی شہوت کے سارے راستے خود بخود بند ہوجاتے ہیں اور انسان ان کے شر سے محفوظ ہوجاتا ہے۔

آپ ہی سے مروی ہے:

﴿من أفضل الورع أن لاتبدی فی خلوا تك ما تستحی من اظهاره فی علانیتك﴾(۱)

''سب سے بڑا ورع اور پارسائی یہ ہے کہ جس کام کو تم کھلم کھلا کرنے سے شرماتے ہو اسے تنہائی میں بھی انجام نہ دو''

بارگاہ خدا میں قلت حیا کی شکایت

متعدد دعاؤں میں یہ ملتا ہے کہ انسان خداوند عالم کی بارگاہ میں اس سے حیا کی قلت کی شکایت کرتا ہے جو ایک بہت ہی لطیف اور عجیب بات ہے کہ انسان خداوند عالم کی بارگاہ میں یہ شکایت کرے کہ اسکے اندر خود ذات پروردگار سے شرم وحیاء کی قلت پائی جاتی ہے جس میں خدا قاضی ہے کیونکہ اسکا فیصلہ اسی کے اوپر چھوڑ دیا گیا ہے شکایت کرنے والا خود انسان (انا، میں) ہے اور جس کے خلاف شکایت کی گئی ہے وہ نفس ہے اور شکایت (مقدمہ) کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ نفس اس خدا کے سامنے بے حیائی پر اتر آیا ہے جو خود اس مقدمہ میں قاضی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ گویا انسان خدا کی بارگاہ میں اپنے نفس کی یہ شکایت کررہا ہے کہ وہ خود خدا سے حیاء نہیں کرتا ہے بطور نمونہ دعائے

---

(۱) غرر الحکم ج۲ ص ۲۵۲۔

ابوحمزہ ثمالی (رح) کے یہ جملات ملاحظہ فرمائیں:

﴿أنا یارب الذی لم أ ستحیك فی الخلاء،ولم ارا قبك فی الملأ،أناصاحب الدواهی العظمیٰ،أناالذی علیٰ سیده اجتریٰ...اناالذی سترت علیّ فمااستحییت،وعملت بالمعاصی فتعدّیت،واسقطتنی من عینیك فما بالیت﴾(۱)

''پروردگارا!میں وہی ہوں جس نے تنہائی میں تجھ سے حیانہیں کی اور مجمع میں تیرا خیال نہیں کیا میرے مصائب عظیم ہیں میں نے اپنے مولا کی شان میں گستاخی کی ہے۔۔۔میں وہی ہوں ۔۔۔جس کی تونے پردہ پوشی کی تو میں نے حیانہیں کی،گناہ کیے ہیں تو بڑھتا ہی چلا گیا اور تو نے نظروں سے گرادیا تو کوئی پروانہیں کی''

امام زین العابدینؑ کی مناجات شاکین (شکایت اور فریاد کرنے والوں کی مناجات) میں بھی خداوند عالم کی بارگاہ میں اپنے نفس اور گناہوں سے پرہیز نہ کرنے کی شکایت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

﴿الٰهی أشكو الیك نفساًبالسوء أمّارة،والیٰ الخطیئة مبادرة، و بمعا صیك مولعة،ولسخطك متعرّضة﴾(۲)

''خدایا میں تجھ سے اس نفس کی شکایت کررہاہوں جو برائیوں کا حکم دیتا ہے اور خطاؤں کی طرف تیزی سے دوڑتا ہے اور تیری معصیتوں پر حریص ہے اور تیری ناراضگی کی منزل میں ہے''۔

---

(۱)دعائے ابوحمزہ ثمالی۔

(۲)مفاتیح الجنان:مناجات الشاکین۔

دوسری فصل

جو شخص اپنی ہویٰ وہوس کو
خداوند عالم کی مرضی پر ترجیح دیتا ہے۔

۱۔ ہویٰ وہوس کے معنی

۲۔ اسکے خصائل اور صفات

۳۔ اسکے طریقہ علاج کو

حدیث قدسی کے پہلے جملے کی وضاحت کے ذیل میں بیان کرنے کے بعد، اب ہم آپ کے سامنے اس حدیث کے دوسرے اور تیسرے جملے ''جو شخص خداوند عالم کی مرضی پر اپنی خواہش اور ہوس کو مقدم کرتا ہے'' اور اسکے برخلاف ''جو انسان مرضی خدا کو اپنی مرضی اور اپنی خوشی پر فوقیت اور ترجیح دیتا ہے'' کی وضاحت پیش کررہے ہیں۔

جو شخص اپنی ہوس کو خداوند عالم کی مرضی پر فوقیت دیتا ہے۔ اس (دوسرے) جملہ کی وضاحت متعلقہ حدیث قدسی میں کچھ اس طرح کی گئی ہے۔

عن رسول اللہ یقول اللہ تعالیٰ :

﴿وعزّتی وجلالی، وعظمتی، وکبریائی، ونوری، وعلوّی، وارتفاع مکانی لایؤثر عبد هواه علیٰ هوای إلّا شتّت أمره، ولبّست علیه دنیاه، وشغلت قلبه بها، ولم أوته منها إلاماقدّرت له﴾(۱)

---

(۱) عدۃ الداعی ص ۷۹۔ اصول کافی ج ۲ ص ۳۳۵۔ ان دونوں سے علامہ مجلسی (رح) نے بحار الانوار ج ۷۰ ص ۷۸ حدیث ۱۲ اور ج ۷۰ ص ۸۵ نیز ص ۸۶ پر اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ اس سے پہلے بھی ہم نے کتاب کے مقدمہ میں اس حدیث کے بعض حوالے نقل کئے ہیں۔

''میری عزت وجلالت، عظمت وکبریائی، نور ورفعت اور میرے مقام ومنزلت کی بلندی کی قسم، کوئی بندہ بھی اپنی ہوئی وہوس کو میری مرضی اور خواہش پر ترجیح نہیں دیگا مگر یہ کہ میں اسکے معاملات کو درہم برہم کردونگا اسکے لئے دنیا کو بنا سنوار دونگا اور اسکے دل کو اسی کا دلدادہ بنا دونگا اور اسکو صرف اسی مقدار میں عطا کرونگا جتنا پہلے سے اسکے مقدر میں لکھ دیا ہے''

حدیث قدسی کے اس فقرہ میں تین اہم نکات پائے جاتے ہیں:

۱۔ جولوگ اپنی خواہش کو مرضی خدا پر ترجیح دینگے انہیں خداوند عالم تین قسم کی سزائیں دیگا:

الف۔ ان کے معاملات مشتبہ اور درہم برہم ہوجائیں گے۔

ب۔ دنیا ان کی نگاہ میں آراستہ ہوجائے گی۔

ج۔ ان کا دل، دنیا کا دیوانہ ہوکر رہ جائے گا۔

۲۔ مذکورہ سزاؤں کے تذکرہ سے پہلے اس حدیث شریف میں متعدد طرح کی عظیم قسمیں کھائی گئی ہیں (جیسے میری عزت، جلالت، عظمت، کبریائی، نور اور میرے مقام ومنزلت کی رفعت کی قسم) جن سے اُس بات کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے جسکا تذکرہ ان کے بعد کیا گیا ہے۔

۳۔ حدیث شریف میں جس طرز کلام کا انتخاب کیا گیا ہے اس سے دائرہ کلام بالکل محصور اور محدود ہوجاتا ہے کیونکہ پہلے جملہ یعنی ﴿لا یؤثر عبدھواہ... الاشتت أمرہ﴾ میں نفی اور دوسرے جملہ ﴿الاشتت أمرہ﴾ میں اثبات کا لہجہ موجود ہے لہٰذا اس حصر کے معنی یہ ہیں کہ جب کبھی بھی انسان اپنی ہوس کو خداوند عالم کی مرضی پر ترجیح دیگا تو وہ کسی بھی طرح خداوند عالم کی ان سزاؤں سے نہیں بچ سکتا ہے اب آپ حدیث قدسی میں مذکور، ان تینوں سزاؤں کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ اسکے امور کو درہم برہم کردوں گا

جولوگ خود اپنی مرضی کے مطابق چلتے ہیں اور خداوند عالم کی مرضی کا کوئی خیال نہیں کرتے ہیں ان کو خداوند عالم سب سے پہلی سزا یہ دیتا ہے کہ ان کے معاملات درہم برہم کردیتا ہے اور ان کے

ہر کام میں بے ثباتی، تزلزل اور بے ترتیبی آ جاتی ہے کیونکہ وہ ان سے طریقۂ کار، راہ وروش، مقصد اور وسیلہ کی یکسانیت اور یکسوئی کو سلب کر لیتا ہے۔ جسکے نتیجہ میں وہ ہوا میں کٹی پتنگ یا کسی تنکے کی طرح ہر طرف اڑتے رہتے ہیں اور ہوا کا ہر جھونکا انکو ایک نئی سمت کی طرف ڈھکیل دیتا ہے۔ کیونکہ لوگ عام طور سے دو طرح کے ہوتے ہیں:

۱۔ منظم اور ٹھوس شخصیت کے مالک۔

۲۔ بے نظم اور بے ترتیب

ٹھوس شخصیت

ٹھوس اور مستحکم شخصیت ایسی شخصیتوں کو کہا جاتا ہے جو کسی ایک حاکم کے ماتحت رہتی ہیں جب کہ متزلزل، مضطرب اور بدحواس قسم کے افراد متعدد اسباب وعوامل کے آلۂ کار بنے رہتے ہیں۔

چنانچہ پہلے طریقۂ کار کو توحیدی طریقہ اور دوسرے طریقہ کو شرک کا نتیجہ کہا جاتا ہے کیونکہ جو شخص توحید الٰہی کا نمونہ ہوتا ہے۔ وہ ہر اعتبار سے خداوند عالم کے ارادہ، حکمت اور اسکے احکام کا تابع ہوتا ہے اور ہر لحاظ سے اسی کی مشیت اور مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کئے رہتا ہے۔

اسی طرح ہر خوشی اور مصیبت میں وہ حکم الٰہی کا پابند رہتا ہے اور خداوند عالم کی خوشنودی ہی اسکا اصل مقصد ہے اور اسکے علاوہ اسے کسی دوسری چیز کی خواہش نہیں ہوتی اور وہ ہر طرح سے اس کے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کئے رہتا ہے اور اسکی نظر صرف اپنے اس پاک مقصد پر مرکوز رہتی ہے اور وہ اسکی طرف رواں دواں رہتا ہے۔ اور کیونکہ احکام الٰہی کا نظام صرف ایک ہی مرکز سے متصل ہے اور اس میں مکمل طور سے یکسانیت پائی جاتی ہے لہٰذا اس پر عمل کرنے کے بعد ہر انسان کی شخصیت مقدس ہو جاتی ہے اور اس میں یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے یعنی کبھی مختلف قسم کی سیاسی یا سماجی رد و بدل اور اتھل پتھل کی وجہ سے جنگ اور لڑائی کی نوبت آ جاتی ہے جسکی بنا پر انہیں اسلحہ اٹھانا پڑتا ہے۔ اور کبھی صورتحال یہ ہو جاتی ہے کہ اسلحہ کو زمین پر رکھنا پڑتا ہے مگر حالات کے اس پورے اتار چڑھاؤ کے

باوجود انسان کی شخصیت کے اندر کسی طرح کا اختلاف یا ردوبدل پیدا نہیں ہوتی اور اسکی شخصیت کی یکسانیت اور توحید کے سرچشمہ سے پیدا ہونے والی ترتیب ویگانگت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے اور اسی کو (توحید عملی) کہا جاتا ہے جو توحید نظری کے مقابلہ میں بولی جاتی ہے کیونکہ یہ صورت حال دراصل انسان کی زندگی میں توحید نظری کے پرتو کا ہی نتیجہ ہے۔

توحید عملی کی اس منزل پر پہنچنے کے بعد انسان اپنے نفس کے اندر اور باہر موجود تمام حاکموں جیسے ہوی وہوس اور طاغوت وغیرہ کی ماتحتی سے خارج ہوجاتا ہے اور احکام الٰہی کے دائرہ حکومت میں داخل ہوجاتا ہے اس طرح تنہا حکم الٰہی ہی اسکے ہرعمل کا حاکم ومختار ہوتا ہے اور اسکی رفتار وگفتار اور کردار وعمل میں ہر جگہ توحیدی رنگ نظر آتا ہے اور وہ پیغمبر ﷺ کی اس حدیث شریف کا مصداق بن جاتا ہے:

﴿لایؤمن احدکم حتیٰ یکون هواه تبعاً لما جئت به﴾(۱)

''تم میں سے کوئی شخص بھی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کی ہر خواہش اس دین کی تابع نہ بن جائے جو میں لیکر آیا ہوں''

جبکہ شرک کی صورتحال اس کے برخلاف ہوتی ہے کیونکہ شرک آجانے کے بعد انسان سوفیصد خداوند عالم کے احکام کا پابند نہیں رہتا بلکہ وہ خدا کے ساتھ ساتھ خواہش نفس اور طاغوت وغیرہ کی پیروی بھی شروع کردیتا ہے اور جب انسان توحید کے قلعہ کی چاردیواری سے باہر نکل جاتا ہے تو پھر ہوس اور طاغوت اس کے سر پر سوار ہوجاتے ہیں اس کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں اور گویا اسے بالکل تباہ وبرباد کرڈالتے ہیں اس بارے میں قرآنی تعبیرات ملاحظہ فرمائیے:

﴿الله ولی الذین آمنوا...والذین کفروا أولیاؤهم الطاغوت﴾(۲)

---

(۱) جامع الکبیر طبری۔

(۲) سورۂ بقرہ آیت ۲۵۷۔

''اللہ صاحبان ایمان کا سرپرست ہے۔۔۔اور جولوگ کافر ہیں ان کے سرپرست طاغوت ہیں''

جسکا مطلب یہ ہے کہ جولوگ مومن ہیں ان کا صرف ایک ولی وسرپرست ہے ایک ذریعہ اور ایک ہی سرچشمہ ہے اور صرف اسی سے ان کو نسبت ہے لیکن مشرکین مختلف لیڈروں اور حاکموں کے آلہ کار اور تابع ہوتے ہیں انہیں جو ذریعہ اور وسیلہ بھی نظر آجاتا ہے وہ اسی کے پیچھے لگ لیتے ہیں اسی لئے ان کے واسطے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے:

﴿والذین کفروا أولیاؤهم الطاغوت﴾

''اور جولوگ کافر ہیں ان کے سرپرست طاغوت ہیں''(اس میں لفظ اولیاء جمع ہے)

یہاں تک یہ بالکل واضح ہوگیا کہ جوشخص ٹھوس شخصیت کا مالک ہوتا ہے اس پر صرف شرعی قانون کی حکومت چلتی ہے اور وہ مرضی خدا کا پابند ہوتا ہے ایسے افراد کسی غور وفکر، شرم وحیا اور خوف وہراس کے بغیر اپنی شرعی ذمہ داریوں پر عمل کرتے ہیں کیونکہ یہ خوف وہراس، شرمندگی اور اضطرابی حالت انسان کی اندرونی کشمکش اور تذبذب کی دلیل ہے جو نفس کے اندرونی یا بیرونی اسباب کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے لہٰذا جب انسان کسی ایک طاقت کا پابند اور پیرو ہوتا ہے اور اسکی نظر ہمیشہ ایک ہی مرکز پر رہتی ہے تو اس پر ان چیزوں کا اثر نہیں پڑتا ہے۔

ایسے افراد کی پہچان یہ ہے کہ وہ ثقہ، قابل اطمینان، ثابت قدم، ٹھوس رائے، پاکیزہ نفس صاف وشفاف ضمیر کے مالک، شجاع اور تنہائی یا چاہنے والوں اور مددگاروں کی قلت اور دشمنوں کی کثرت کے باوجود اپنے موقف پر اٹل رہتے ہیں۔ امیر المومنین ؑ نے فرمایا ہے:

﴿لایزیدنی کثرة الناس عزّة، ولاتفرّقهم عنی وحشة﴾(۱)

---

(۱) نہج البلاغہ مکتوب ۳۶۔

''لوگوں کی کثرت سے نہ میری عزت اور استحکام میں اضافہ ہوتا ہے اور نہ ان کے متفرق ہوجانے سے مجھے کوئی وحشت ہوتی ہے''

دوسرے یہ کہ ان لوگوں کے ان خصائل اور صفات پر وقتی سکون واطمینان، زحمت ومشکلات رزم وبزم، فتح ونصرت یا ناکامی اور شکست کا کوئی اثر نہیں پڑتا ہے اور وہ پرچم توحید کے سایہ میں سدا بہار رہتے ہیں۔

عمار بن یاسر

خداوند عالم جناب عمار یاسر پر رحمتیں نازل فرمائے وہ ایک مثالی ،ٹھوس اور عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ جنگ صفین میں آپ نے حضرت علیؑ کی رکاب میں اس وقت معاویہ سے جنگ کی تھی جب آپ کی عمر ،نوے برس سے زیادہ تھی آپ نڈر، بہادر، ثابت قدم، جنگ کے شعلوں میں کودجانے والے اور امام کے ایسے جانثار ساتھی تھے جن کے دل میں حضرت علیؑ کی حقانیت اور معاویہ کے ناحق اور باطل ہونے کے بارے میں ایک لمحہ کے لئے بھی شک پیدا نہیں ہوا۔

یہی وجہ ہے کہ صفین کی جنگ کے دوران ہی حضرت علیؑ کے سامنے آپ نے پروردگار عالم سے یہ دعا کی:

﴿اللّٰھم انک تعلم انی لو أعلم أن رضاک فی أن اقذف بنفسی فی ھذا البحر لفعلت،اللّٰھم انک تعلم أنی لو أعلم انّ رضاک أن أضع ضُبّة سیفی فی بطنی ثم أنحنی علیھا حتیٰ یخرج من ظھری لفعلت،اللّٰھم وانی أعلم مماعلّمتنی أنی لاأعمل الیوم عملاًھو أرضی لک من جھاد ھؤلاء الفاسقین،ولو أعلم الیوم عملاً أرضیٰ لک منه لفعلته﴾(۱)

---

(۱)صفین :نصر بن مزاحم ۳۱۹۔۳۲۰ تحقیق ڈاکٹر عبدالسلام ہارون۔

"بارالٰہا تو جانتا ہے کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ اس سمندر میں کود جانے میں تیری خوشنودی ہے تو میں یقیناً کود جاؤں گا۔ بارالٰہا تو جانتا ہے کہ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ تیری خوشی اس میں ہے کہ میں اپنی تلوار اپنے پیٹ پر رکھکر اس کے اوپر اتنا جھک جاؤں کہ وہ میری کمر کے پار نکل جائے تو میں یہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔۔۔ بارالٰہا تو نے مجھے جو علم دیا ہے اسکی بنا پر مجھے معلوم ہے کہ آج تجھے ان فاسقین سے جہاد کرنے سے زیادہ میرا کوئی عمل پسند نہیں ہے (لہٰذا میں ان سے جہاد کر رہا ہوں) اور اگر مجھے اس سے زیادہ تیرا پسندیدہ عمل معلوم ہو جائے تو میں اسکو ضرور انجام دونگا"

اسماء بن حکم فزاری کا بیان ہے کہ ہم صفین کے میدان میں حضرت علیؑ کے لشکر میں جناب عمار یاسر کی سپہ سالاری میں دو پہر کے وقت سرخ چادر کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت ایک شخص (جو سب کے چہرے غور سے دیکھ رہا تھا) آیا اور اس نے کہا کیا تمہارے درمیان عمار یاسر ہیں؟

جناب عمار نے کہا: میں عمار ہوں۔

اس نے کہا! ابوالیقظان؟

جواب دیا: جی ہاں۔

پھر اس نے کہا: کہ مجھے آپ سے کچھ کام ہے، فرمایئے یہیں سب کے سامنے عرض کروں یا تنہائی میں، جناب عمار بولے جو تم چاہو۔ اس نے کہا ٹھیک ہے سب کے سامنے ہی عرض کئے دیتا ہوں جناب عمار نے کہا بتاؤ کیا کام ہے؟

کہا! میں جب اپنے گھر سے نکلا تھا تو مجھے اپنی حقانیت اور اس قوم (لشکر معاویہ) کی گمراہی کے بارے میں کوئی شک وشبہہ نہیں تھا اور مسلسل میری یہی کیفیت تھی مگر آج رات عجیب اتفاق ہوا کہ جب صبح ہوئی تو ہمارے مؤذن نے ﴿اشهد أن لاالٰه الاالله و أن محمداً رسول الله﴾ کی صدا بلند کی اور ان کے موذن نے بھی اسی طرح اذان دی جب نماز شروع ہوئی تو ہم سب نے ایک ہی

طرح نماز پڑھی ایک ہی طرح دعا کی، ایک ہی کتاب (قرآن مجید) کی تلاوت کی اور ہمارے رسولؐ بھی ایک ہیں، یہیں سے میرے دل میں کچھ شک پیدا ہوا۔ چنانچہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میں نے بقیہ وقت کیسے گذارا ہے، صبح ہوئی تو میں امیرالمومنینؑ کے پاس گیا اور ان کی خدمت میں پورا ماجرا بیان کر دیا تو انھوں نے فرمایا: کیا تم عمار بن یاسر سے ملے ہو؟ میں نے عرض کی نہیں، فرمایا جاؤ ان سے ملاقات کرو اور جو کچھ وہ کہیں اس پر عمل کرنا۔ لہٰذا اسی کام کے لئے میں آپ کی خدمت حاضر ہوا ہوں تو جناب عمار یاسر (رح) نے اس سے کہا: کیا تم ہمارے مقابلہ میں موجود اس سیاہ پرچم والے لشکر کے سپہ سالار کو جانتے ہو؟ وہ عمرو بن عاص ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہ کر میں نے اس سے تین بار جنگ کی ہے اور آج اس سے یہ میری چوتھی جنگ ہے۔ اور یہ جنگ ان جنگوں سے کچھ بہتر نہیں ہے بلکہ بدتر ہی ہے بلکہ اس کا شر و فساد ان سب سے زیادہ ہے، کیا تم بدر و احد اور حنین میں تھے یا تمہارے والدان میں موجود تھے کہ انھوں نے تم سے ان جنگوں کے کچھ حالات بتائے ہوں؟ اس نے کہا نہیں آپ نے کہا کے بدر و احد و حنین کے دن ہم سب رسول اللہ کے پرچم تلے جمع تھے اور وہ لوگ، مشرکین کے جھنڈے کے نیچے اکٹھا تھے۔ کیا تم اس لشکر اور اہل لشکر کو دیکھ رہے ہو؟ خدا کی قسم! معاویہ کے ساتھ یہ جتنے لوگ حضرت علیؑ کے مقابلہ میں ہم سے لڑنے آئے ہیں۔ یہ سب ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں اور میرا دل تو یہ چاہتا ہے کہ ان سب کو ایک ساتھ ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں۔

خدا کی قسم ان سب کا خون ایک چڑیا کے خون سے زیادہ حلال ہے۔ کیا تم چڑیا کا خون بہانا حرام سمجھتے ہو؟ اس نے کہا: نہیں بلکہ حلال ہے تو جناب عمار نے کہا بس سمجھ لو کہ ان کا خون بھی اسی طرح حلال ہے۔ کیا میری بات تمہارے لئے واضح ہوگئی؟ اس نے کہا: جی ہاں آپ نے درست وضاحت فرمائی جناب عمار نے کہا: لہٰذا اب جسے چاہو منتخب کر سکتے ہو پھر جب وہ شخص واپس چلنے لگا تو جناب عمار نے اسے واپس بلایا اور اس سے یہ کہا کہ ان لوگوں نے ہم پر اپنی تلوار کا وار کیا تو تم میں سے بعض افراد شک و شبہ کا شکار ہوگئے اور یہ کہنے لگے کہ اگر یہ لوگ حق پر نہ ہوتے تو ہمارے خلاف جنگ کے

لئے نہ نکلتے، خدا کی قسم ان کے پاس مکھی کے ایک آنسو کے برابر بھی حق موجود نہیں ہے۔ اللہ کی قسم اگر وہ ہم پر اپنی تلواروں سے حملہ کریں یہاں تک کہ وہ ہمیں سعفات ہجر (ایک مقام کا نام) تک پہونچادیں تب بھی مجھے یہی معلوم ہوگا کہ میں حق پر ہوں اور وہ باطل پر ہیں اور خدا کی قسم اس وقت تک امن وامان قائم نہیں ہوسکتا ہے جب تک فریقین میں سے کوئی ایک فریق اپنے حق ہونے کا منکر نہ ہواور وہ یہ گواہی نہ دے کہ اسکا مخالف فریق برحق ہے اوران کے مقتولین اور مردے جنتی ہیں اور دنیا کے دن اس وقت تک پورے نہیں ہوسکتے جب تک وہ یہ اقرار نہ کرلیں کہ ان کے مردے اور مقتولین جہنمی اور زندہ رہنے والے اہل باطل ہیں۔(۱)

کھوکھلا اور بے ہنگم انسان (شخصیت)

کھوکھلے اور بے ہنگم لوگوں کے نفس میں اندرونی کشمکش اور بیقراری کا آغاز سب سے پہلے عقل اور خواہشوں کی خانہ جنگی سے ہوتا ہے کیونکہ خواہشیں انسان کے نفس کو اسکی عقل کی ماتحتی اور کنٹرول سے باہر نکالنے کی درپے رہتی ہیں جس سے آدمی کا نفس دو متصادم دھڑوں میں تقسیم ہوجاتا ہے۔

اس داخلی جنگ کے نتیجہ میں انسان کی مشکلات اور زحمتیں بہت زیادہ ہوجاتی ہیں کیونکہ انسان کے اوپر اسکے ضمیر، فطرت اور عقل کی حکومت بہت مستحکم ہوتی ہے اور یہ اسباب اسکے اندر ہوس کے نفوذ (داخلے) کا سختی سے مقابلہ کرتے ہیں اور انکی مسلسل یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ انسان کی شخصیت کو تقویت دیکر اسے اسکی پہلی حالت اور فطرت کی طرف لوٹادیں اس مرحلہ میں انسانی نفس کے اندر ایک خلفشار اور خانہ جنگی کی صورت حال رہتی ہے جسکی بناپر اسے سخت زحمتوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب انسان کی عقل اس کی رفتار وکردار کو کنٹرول کرنے اور اسے استقامت عطا کرنے سے عاجز ہوجاتی ہے اور انسان کے لئے اسکے نفس کا اندرونی خلفشار اور خانہ جنگی بھی ناقابل برداشت

---

(۱) صفین، نصر بن مزاحم ص ۳۲۲/۳۲۱

ہو جاتے ہیں تو پھر وہ اپنی فطرت سے فرار کی کوشش کرنے لگتا ہے جوان مشکلات کا منفی اور غلط راہ حل ہے بلکہ اسکا صحیح راہ حل تو یہ ہے کہ اپنی عقل وفطرت کو پھر سے زندہ کرکے اسے استحکام بخشے اور اسکے احکامات کے مطابق عمل کرے۔

لیکن اسکے بجائے صورتحال یہ ہو جاتی ہے کہ انسان خواہشات کی سلطنت کے سامنے سپر ڈال دیتا ہے اور ان مشکلات سے نجات پانے کے لئے اپنی فطرت سے فرار کی کوشش کرتا ہے؟ اور نشہ، جوا، جرائم یا جنسیات کے دامن میں پناہ تلاش کرتا ہے۔

مزید تعجب کی بات تو یہ ہے کہ انسان اپنی ہوس سے اپنی ہوس ہی کی طرف فرار کرتا ہے اور ایک جرم سے دوسرے جرم کی طرف بھاگتا ہے ورنہ اگر وہ اپنی ہوس کے برخلاف قدم اٹھائے اور خواہش نفس اور ہوس سے خدا کی طرف آگے بڑھے تو بآسانی ان سے نجات پاکر سکون حاصل کرسکتا ہے جسکی طرف قرآن مجید نے ان الفاظ میں متوجہ کیا ہے:

﴿ففرّوا الیٰ اللہ انی لکم منہ نذیر مبین﴾(۱)

''لہٰذا اب خدا کی طرف دوڑ پڑو کہ میں کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں''

لہٰذا جب تک انسان خداوند عالم کی پناہ حاصل نہ کرلے وہ اپنی ہوس کے سامنے لاچار اور مجبور ہی رہتا ہے اسی لئے وہ مشکلات اور زحمتوں نیز اپنی زندگی کے دردسر سے نجات پانے کے لئے نشے اور جنسیات کا رخ کرتا ہے جنکے بارے میں قرآن کریم کی یہ تعبیر کتنی صحیح ہے کہ:

﴿نسوا اللہ فأنساھم أنفسھم﴾(۲)

''انھوں نے خدا کو بھلاڈالا تو خدا نے خود ان کو بھی نظرانداز کردیا''

کیونکہ جو لوگ اپنی فطرت اور ضمیر سے فرار کرکے شراب یا جوئے وغیرہ کی طرف بھاگتے

---

(۱)سورۂ ذاریات آیت ۵۰۔

(۲)سورۂ حشر آیت ۱۹۔

ہیں دراصل وہ اپنے کو بھلا دینا چاہتے ہیں اور انسان کا یہ فرار ذکر (یاد) سے نسیان (بھول) کی طرف ہے جو خود فرار سے بدتر ہے۔

بالآخر انسان کے نفس اور اسکی شخصیت کے اندر ہوی وہوس کا مقابلہ کرنے والی آخری طاقت کا نام ضمیر ہے جو حتی الامکان اپنی کوشش بھر انسان کو اسکی ہوس اور شیطان کے خونخوار پنجوں سے بچانے کی کوشش کرتا ہے چنانچہ جب ضمیر بھی خواہشات کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے تو پھر انسانی وجود کے اندر اسکے خواہشات کا مقابلہ کرنے والا آخری قلعہ بھی منہدم ہوجاتا ہے اور یہی اس جنگ کا پہلا مرحلہ ہے جسکے بعد انسان دائمی دردسر اور تشنج کا شکار ہوجاتا ہے۔

جب خواہشات ہر اعتبار سے فتح یاب ہوجاتے ہیں اور انسان کے اوپر ان کی سلطنت کا نفوذ ہوجاتا ہے اور وہ پورے طور پر ان کے دائرہ اختیار کے اندر آجاتا ہے ۔۔۔تب بھی اسے اپنے خیالات کے برخلاف اس اندرونی خلفشار اور خانہ جنگی سے نجات نہیں مل پاتی بلکہ نفس کے اندر ہی خود ان خواہشات کے درمیان ایک اور خانہ جنگی اور خلفشار شروع ہوجاتا ہے بلکہ اس بار اسکا انداز اور زیادہ خطرناک اور سخت ہوتا ہے کیونکہ انسان اس مرحلہ میں مختلف قسم کے خواہشات نفس (اور ہوس) کے درمیان تذبذب کا شکار رہتا ہے لہذا اسکا خلفشار پہلے مرحلہ کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہوجاتا ہے اور اگر اسکی دردسری اور ذہنی پریشانی گذشتہ مرحلہ سے زیادہ نہ ہوتو بہرحال اس سے کم ہرگز نہیں ہوتی ہے کیونکہ اس مرحلہ میں بھی گذشتہ مرحلہ کی طرح اسکے معاملات بالکل متفرق اور درہم برہم ہوجاتے ہیں البتہ ان دونوں کے درمیان یہ فرق ضرور ہوتا ہے کہ پہلے مرحلہ میں انسان کی مشکلات کے دوران اسکی عقل اور خواہشات کے درمیان ٹکراؤ ہوا تھا لیکن اس مرحلہ میں خود اسکی خواہشات اور ہوس کے درمیان ٹکراؤ رہتا ہے کیونکہ اسکی ہر خواہش (ہوس) دوسری خواہشات کے مقابلہ میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہے اسی لئے ان کے درمیان یہ جنگ جاری رہتی ہے۔

اس سلسلہ میں چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ جب کبھی انسان جذبۂ انتقام اور غصہ یا محبت دنیا اور عہدہ کی محبت کے درمیان تذبذب کا شکار ہوتا ہے تو حکومت، عہدہ اور پوسٹ کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ دشمنوں کے ساتھ نرم رویہ سے پیش آئے مگر جذبۂ انتقام یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے مقابلہ میں آنے والے ہر دشمن کا قلع قمع کر دے۔۔۔اور ہمیں بخوبی یہ معلوم ہے کہ یہ نرمی اور مدارات، حلم کی قسم نہیں ہے (جو عقل کے لشکروں میں سے ہے) بلکہ یہ درحقیقت ایک ہوس کو دوسری ہوس پر ترجیح دینے کا نتیجہ ہے۔

۲۔ کبھی عہدہ یا حکومت کی لالچ اور سماجی مقام یا عظمت و وقار جیسے دو جذبات اور خواہشات کے درمیان ٹکراؤ پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ انسان کی سماجی عزت و وقار اس سے کچھ خاص اقدار و آداب کی پابندی کا مطالبہ کرتے ہیں جبکہ دوسرے خواہشات ان سے کنارہ کشی کے خواہاں ہوتے ہیں جیسے جنسی خواہش، لہٰذا ان سیاسی یا سماجی عہدوں اور کرسیوں تک پہونچنے کے لئے اپنے جنسیات پر کنٹرول کرنا، یہ کسی عفت کی بنا پر نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک خواہش (ہوس) کو دوسری ہوس پر ترجیح دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جنسی ہوس دوسرے خواہشات (عہدہ کی لالچ) پر غالب آجاتی ہے جسکے نتیجہ میں ارباب حکومت کے یہاں بھی جنسی اسکینڈل رونما ہو جاتے ہیں اور انہیں بدنام کر کے رکھ دیتے ہیں۔

۳۔ کبھی انسان کسی عہدے کی محبت اور اپنی جان کے خوف کا نوالہ بن کر رہ جاتا ہے کیونکہ عہدہ کی تمنا اس سے دوسروں پر حملہ کرنے انہیں قتل و غارت کرنے اور خطرات میں کود پڑنے کا مطالبہ کرتی ہے لیکن جان کا خطرہ اس کو حفاظتی انتظامات اور احتیاطی تدابیر اور پھونک پھونک کر قدم اٹھانے پر اکساتا ہے۔

دو مختلف قسم کی خواہشات کی بناء پر انسانی نفس کے اندرونی خلفشار اور خانہ جنگی کی یہ تین مثالیں آپکے سامنے حاضر ہیں ان کے علاوہ بھی مختلف خواہشات کے درمیان نہ جانے ایسے کتنے حادثات ہر روز رونما ہوتے رہتے ہیں جو انسانی زندگی کے لئے ایک عام بات ہیں اور اس میں متعدد خواہشات اور جذبات ایک دوسرے سے ٹکرا کر اسے اپنی سمت کھینچنا چاہتے ہیں اور انسان خوف اور لالچ، حب جاہ، بخل و حسد، جنسیات اور غصہ و انتقام نیز حب مال جیسے خواہشات کے کھنچاؤ کی بنا پر، تتر

بتر ہوکر رہ جاتا ہے جسکے بعد وہ اپنے ذہنی بوجھ اور مشکلات کے دلدل میں اور زیادہ دردسری کا شکار ہو جاتا ہے جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے:

﴿انما یرید اللہ لیعذبهم بها فی الحیاۃ الدنیا و تزهق أنفسهم وهم کافرون﴾(۱)

''بس اللہ کا ارادہ یہی ہے کہ انہیں کے ذریعہ ان پر زندگانی دنیا میں عذاب کرے اور حالت کفر ہی میں ان کی جان نکل جائے''

یہی معاملات کا درہم برہم ہوتا ہے جس کی طرف حدیث قدسی میں اشارہ کیا گیا ہے۔

ہوس کے عذاب

جب انسان اپنی ہوس کا شکار ہو جاتا ہے تو اسکے خواہشات کا ٹکراؤ بھی اسکے لئے وبال جان بن جاتا ہے جبکہ اس کے پنجوں میں پھنسنے کے بعد انسان جس دوسرے دردسر اور زحمت میں مبتلا ہوتا ہے وہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ وہ عذاب خود اس ہوس سے مربوط ہوتا ہے لہٰذا انسان کی ہوس اور خواہش جیسی ہوگی اسکا ویسا ہی عذاب اور دردسر سامنے آئے گا جیسے حرص، لالچ اور حسد جیسے خواہشات اگر ہمارے نفس کے اندر جگہ بنالیں تو ان کی خواہش ہمیں ایک الگ مصیبت میں مبتلا کردے گی اور یہ طے شدہ بات ہے کہ جو شخص اپنے معاملات کو ان خواہشات کے حوالے کردیگا وہ ان مصائب سے نجات نہیں پاسکتا ہے۔

خواہشات کے چنگل میں رہ کر انسان جس عذاب اور وبال جان میں مبتلا ہوتا ہے اسکی طرف اس روایت میں اشارہ موجود ہے جسے شیخ مفید علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب الارشاد(۱) میں امیر المومنینؑ سے نقل کیا ہے:

---

(۱)سورۂ توبہ آیت ۵۵۔

(۲)ارشاد مفید ص ۱۵۹ ۔

﴿ما أعجب أمر الانسان،ان سنح له الرجاء أذلّه الطمع،وان هاج به الطمع أهلكه الحرص،وان ملكه اليأس قتله الأسف،وان سعد نسي التحفظ،وان ناله خوف حيّره الحذر،وان اتسع له الامن أسلمته الغرّة"الغفلة"وان أصابته...﴾

''اس انسان کے معاملات کتنے تعجب آور ہیں کہ اگر اسے امید کی کرن نظر آنے لگے تو طمع اسکو ذلیل کر دیتی ہے اور اگر اسکی لالچ بھڑک اٹھے تو حرص اسے ہلاک کر ڈالتی ہے اور اگر اس پر ناامیدی کا غلبہ ہو جائے تو افسوس اسے قتل کر دیتا ہے اور اگر وہ کامیاب اور خوشحال ہو جائے تو پھر (دین کی) پابندی کو بھول جاتا ہے، اگر اسے خوف لاحق ہو جائے تو دہشت متحیر و سرگردان کر دیتی ہے اور اگر ہر طرف امن وسکون رہے تو غفلت (دھوکہ) میں گرفتار ہو جاتا ہے اگر کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو بے صبری اور آہ وفریاد ذلیل کر دیتی ہے اگر کہیں سے مال مل جائے تو دولت اسے باغی بنا دیتی ہے اگر وہ فاقہ کے چنگل میں پھنس جائے تو بلائیں اسکے شامل حال ہو جاتی ہیں اور اگر بھوک لاغر بنا دے تو کمزوری نڈھال کر دیتی ہے اور اگر کھانے پینے میں افراط کر بیٹھے تو پرخوری سے اس کا سانس رک جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ اسکے لئے ہر تقصیر مضر ہے اور ہر زیادہ روی (افراط) مفسد ہے اور اس (افراط) کے بعد ہر خیر شر بن جاتا ہے اور ہر شر اسکے لئے ایک آفت ہے''

مختصر یہ کہ دنیا کے بارے میں پرامید ہونا ہر انسان کو طمع کی ذلت کے حوالہ کر دیتا ہے اور طمع (لالچ) ہلاکتوں کے سپرد کر دیتی ہے کسی چیز سے مایوسی کے بعد وہ کف افسوس ہی ملتا رہتا ہے اور کوئی خوف پیدا ہو جائے تو وہ دہشت کے منھ میں جھونک دیتا ہے اس طرح ہر خواہش اور ہوس ایک نئی خواہش اور ہوس کے حوالے کر دیتی ہے اور آخرکار وہ ہلاکت کے منھ میں پہونچ جاتا ہے۔

دنیا اپنے خواہشمند کے لئے ایک وبال جان

انسان کے دنیاوی عذاب کا پہلا رخ اور پہلا مرحلہ تو اسکے خواہشات (ہوس) ہیں مگر دوسری منزل میں خود یہ دنیا اسکے لئے عذاب بن جاتی ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ دنیا خواہشات (ہوس) کا کھلا

میدان، ان کی آخری منزل، انکے حصول کا سرچشمہ، ان کی آماجگاہ اور انکو ابھارنے اور ان کی پرورش کی جگہ ہے

لہٰذا جب خداوند عالم کسی انسان کو خواہشات نفس کی پیروی کرنے کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کرتا ہے تو اس پر یہ عذاب لامحالہ، طلب دنیا کے ذریعہ ہی ہوتا ہے کیونکہ انسانی ہوس اور دنیا طلبی کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں ہے بلکہ یہ ایک مسلم حقیقت ہے اور اسلامی افکار کے اہم مسائل کا حصہ ہے جس کی ہم یہاں وضاحت کررہے ہیں۔

اگر کوئی انسان اپنے ضروریات زندگی اور ضروریات دین اور تکامل کے لئے دنیا حاصل کرے تو اس حصول دنیا اور حتی دنیا میں کوئی چیز شر اور عذاب نہیں ہے جس کی تصدیق اسلام میں موجود ہے کیونکہ اسلام کا یہ کہنا ہے کہ اس دنیا میں کوئی چیز شر نہیں ہے بلکہ سب خیر ہی خیر ہے اسی لئے اس نے دنیا حاصل کرنے اور رزق تلاش کرنے کے لئے دوڑ دھوپ کرنے کو شریعت کا جزء قرار دیا ہے کیونکہ اسلام کی نگاہ میں دنیا اولیاء خدا کا میدان تجارت (منڈی) اور اسکے محبین کی مسجد ہے:

﴿متجر أولياء الله، ومسجد احبّاء الله﴾(۱)

''(دنیا) اللہ کے اولیاء کا میدان تجارت اور اسکے محبین کی مسجد ہے''

لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ دنیا شر اور عذاب ہو

اس دنیا میں محنت و مشقت کرنا اور رزق تلاش کرنا شریعت اسلامیہ کا جز ہے جس کی تائید کے لئے قرآن مجید کی اس آیت میں مہر تصدیق ثبت ہے:

﴿فاذاقضيت الصلوٰة فانتشروا فى الارض وابتغوا من فضل الله﴾(۲)

''جب نماز تمام ہوجائے تو روے زمین پر پھیل جاؤ اور فضل الٰہی تلاش کرو''

لہٰذا جب یہ سب خیر ہے تو شر اور عذاب کا وجود کہاں رہے گا؟

---

(۱) نہج البلاغہ حکمت ۱۳۱۔

(۲) سورۂ جمعہ آیت ۱۰۔

لہٰذا جب تک یہ دنیا خداوند عالم تک پہونچنے کا ذریعہ اور اسکی مرضی حاصل کرنے کا وسیلہ ہو اور اس سے بڑھ کر خود خدا تک جانے کا ارادہ ہو تو یہ پوری دنیا اور اس میں ہونے والی ہر کوشش خیر ہی خیر ہے۔۔۔

لیکن اگر انسان کی محنت و مشقت اور اسکی حرکت کا رخ خداوند عالم اور اسکی مرضی حاصل کرنے کے بجائے دنیا کی طرف مڑ جائے تو یہ اسلام کی نظر میں نا قابل برداشت بات ہے۔اور اسے اس نے شر قرار دیا ہے اور اسی کو خداوند عالم انسان کے لئے عذاب دنیا بنا دیتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ جب یہ دنیا انسان کی نظر میں خدا تک پہونچنے کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ہونے کے بجائے خود ایک مستقل مقصد میں تبدیل ہو جائے تو پھر انسان اپنی گمراہی کی وجہ سے خدا کی طرف جانے کے بجائے دنیا کی طرف چل دیتا ہے اور اسکی نظریں ذات خدا کے بجائے دنیا کی رنگینیوں پر ٹکی رہتی ہیں اور جب وہ دنیا میں گھر ارہ جائے تو اسکا ہر عمل باطل اور محنت بیکار نیز اسکی ترقی اور تکامل معطل ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ تنزلی، لغزش اور خسارہ کا شکار ہو جاتا ہے۔

بلکہ کبھی کبھی انسان خداوند عالم سے منحرف ہو کر اس حد تک آگے بڑھ جاتا ہے کہ وہ خداوند عالم سے جنگ کی ٹھان لیتا ہے اور کھلم کھلا خدا اور رسول کی دشمنی کا اعلان کرتا ہے۔

بہر حال چاہے جو کچھ بھی ہو اگر یہ دنیا انسان کے لئے خدا تک پہونچنے کا وسیلہ ہونے کے بجائے منزل مقصود میں تبدیل ہو جائے اور انسان کی کل دوڑ دھوپ دنیا طلبی تک محدود رہے تو پھر یہی دنیا انسان کیلئے دردسر اور عذاب جان بن جاتی ہے۔

جو دنیا، انسان کی خواہشمند ہوتی ہے اور جس دنیا کا خواہشمند انسان ہوتا ہے ان دونوں کے درمیان یہی فرق ہے کہ انسان کی خواہشمند دنیا اسے خدا تک پہونچاتی ہے لیکن جب انسان دنیا کے پیچھے بھاگتا ہے تو یہی دنیا خدا تک پہونچنے کا راستہ ہونے کے بجائے اس کے لئے سنگ راہ بن کر

عذاب اور وبال جان بن جاتی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے:

﴿لـما خلق الله الدنيا أمرها بطاعة ربّها،فقال لها خالقي مَنْ طلبكِ و وافقي من خالفك،فهي علىٰ ماعهد اليها الله و طبعها عليه﴾(۱)

''جب خداوند عالم نے دنیا کو خلق فرمایا تو اس سے ارشاد فرمایا کہ جو تجھے طلب کرے (تیرا خواہشمند ہو) اسکی مخالفت کرنا اور جو تیرا مخالف ہو اسکی موافقت کرنا لہٰذا یہ دنیا خداوند عالم سے کئے ہوئے عہد کے مطابق اپنی طبیعت پر باقی ہے''

روایت میں بطور کنایہ اس طرف اشارہ ہے کہ جو شخص فکر دنیا میں پڑ جائے اور اسی کو اپنا سب کچھ سرمایہ اور مقصد قرار دیدے تو خداوند عالم اسی دنیا کو اسکے لئے عذاب بنا دیتا ہے اور جو شخص دنیا سے دل نہ لگائے اور اسکی مخالفت کرتا رہے تو پروردگار اسکے لئے دنیا کو چین اور سکون میں بدل دیتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

﴿أوحىٰ الله الىٰ الدنيا:اخدمي من خدمني،وا تعبي من خدمك﴾(۲)

''اللہ تعالی نے دنیا کی طرف یہ وحی فرمائی جو میری خدمت کرے اسکی خدمت گذار بننا اور جو تیری خدمت کرے اسکے لئے عذاب بن جانا''

اس روایت میں بھی گذشتہ روایت کی طرح یہ کنایہ موجود ہے کہ اگر انسان کا مقصد خداوند عالم کو خوش کرنا ہو،تو یہ دنیا اسکی خدمت کے لئے خلق کی گئی ہے لیکن جب اسکا مقصد خدا کے بجائے دنیا ہو جائے تو پھر اسکے لئے دنیا کی خدمت کرنا ضروری ہے اور دنیا کی خدمت کرنا کسی عذاب

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۰ ص ۳۱۵۔

(۲) بحار الانوار ج ۷۸ ص ۲۰۲۔

اور وردوسرے کم نہیں ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہی یہ بھی روایت ہے:

﴿ان الله جل جلاله أوحیٰ (الی) الدنیا أن اتعبی من خد ملك واخدمی من رفضك﴾(۱)

''خداوند عالم نے دنیا کی طرف یہ وحی فرمائی کہ جو تیری خدمت کرے اسے عذاب میں مبتلا کر دینا اور جو تجھے چھوڑ دے اسکی خدمت کرنا''

اس روایت کا بھی انداز اور لہجہ بعینہ وہی ہے بلکہ اگر کوئی روایات کے انداز بیان سے واقف ہو تو اسے بخوبی محسوس ہوگا کہ اس روایت میں گذشتہ روایات کے بالمقابل کچھ زیادہ صراحت موجود ہے۔

حضرت علیؑ سے مروی ہے:

﴿من خدم الدنیا استخدَ متْه ومن خدم الله خدمه﴾(۲)

''جو شخص دنیا کی خدمت کریگا وہ اسے اپنا نوکر بنائے رکھے گی اور جو شخص خداوند عالم کی خدمت (اطاعت) کریگا تو خداوند عالم دنیا کو اس کا خدمت گذار بنادیگا''

اللہ تعالی نے جناب موسیٰؑ کی طرف یہ وحی فرمائی:

﴿ما من خلقی أحد عظمها (۳) فقرّت عینه ،ولم یحقرها أحد الا انتفع بها﴾(۴)

''یعنی میری مخلوقات کے درمیان کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے کہ جس نے دنیا کو بڑا سمجھا

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۳ ص ۱۲۱۔

(۲) غرر الحکم ج ۲ ص ۲۳۷۔

(۳) یعنی دنیا۔

(۴) بحار الانوار ج ۷۳ ص ۱۲۱۔

ہو اور اسکی آنکھوں کو ٹھنڈک نصیب ہوئی ہو اور کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے اسکو ذلیل سمجھا ہو اور اس نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا ہو"

کتب احادیث میں اس قسم کی روایات بہت زیادہ ہیں مگر یہ دوسری بات ہے کہ ان روایات میں کائنات کے بارے میں الٰہی سنتوں کی وضاحت جس انداز میں پیش کی گئی ہے اگر کوئی اس سے واقف نہ ہو تو یہ روایات اسکے لئے کچھ مبہم ہیں لیکن جو لوگ زبان و بیان حدیث سے واقفیت رکھتے ہیں انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ان روایات میں جس عذاب کا تذکرہ کیا گیا ہے اس سے مراد وہ عذاب ہے جو خدا سے روگردانی کرنے اور دنیا سے دل لگا لینے کی صورت میں اسکے سامنے آتا ہے یعنی یہ دنیا ہی اسکے لئے عذاب بن جاتی ہے لیکن اگر اسکا دل خداوند عالم کی طرف متوجہ رہے اور وہ دنیا کو خداوند عالم تک رسائی حاصل کرنے کے ذریعہ کے علاوہ کچھ اور خیال نہ کرے اور اسی نیت سے دنیا کا ہر کام کرتا ہے اور اپنا رزق کمائے تو دنیا اسے نقصان نہیں پہونچا سکتی بلکہ وہ اسکے لئے فائدہ مند اور خدمت گذار ہی ثابت ہوگی۔

خواہشات کی پیروی کے بعد انسان کی دوسری مصیبت

گذشتہ صفحات میں ہم نے دنیا داری اور خواہشات کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے پہلے عذاب کا تذکرہ کیا ہے جس میں انسان کے معاملاتِ زندگی بکھر کر رہ جاتے ہیں اور اسکی خواہشات کے آپسی ٹکراؤ کی بناء پر اسکا نفس عجیب و غریب اندرونی خلفشار کا شکار ہو جاتا ہے۔

مگر اس تذبذب اور خلفشار کے بعد بھی یہ خواہشات انسان کو چین سے نہیں رہنے دیتیں بلکہ جب انسان خدا سے اپنا منھ پھیر کر انہیں خواہشات کے مطابق چلتا ہے تو وہ حرص اور لالچ کے عذاب میں بھی پھنس جاتا ہے کیونکہ اگر انسان کی توجہ خدا کے بجائے دنیا کی طرف ہو تو وہ کسی چیز سے سیر نہیں ہو پاتا اور اسے چاہے جس مقدار میں دنیا مل جائے یا اسکے برعکس وہ اس سے منھ پھیرے رہے تب بھی اسکی طمع کا وہی حال رہے گا کیونکہ یہ ایک نفسیاتی بات ہے اور مال و دولت وغیرہ کی کمی یا زیادتی سے اسکا کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو جتنی زیادہ فراوانی کے ساتھ

دولت ملتی ہے اسکے اندر دنیا کی محبت اور لالچ اتنی ہی زیادہ بڑھ جاتی ہے اور انسان دنیا کے پیچھے دیوانہ بنا رہتا ہے اور اسکا پیٹ کبھی بھی نہیں بھر پاتا اور اسکے سینہ میں محبت دنیا کی آگ پہلے کی طرح ہی جلتی رہتی ہے اور وہ کبھی سرد نہیں پڑتی ہے۔

دنیا انسان کا ایک سایہ

جب انسان اس دنیا کو اپنا مقصد حیات بنالے تو پھر اس دنیا کے بارے میں وہی مثال مناسب ہے جو بعض روایات میں امیر المومنینؑ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

﴿مثل الدنیا کظلّكِ،انْ وقفتَ وقفَ،وانْ طلبته بَعُدَ﴾(۱)

''دنیا کی مثال تمہارے سایہ کی طرح ہے کہ اگر تم رک جاؤ تو وہ بھی رک جائے گا اور اگر تم اسے پکڑنا چاہو تو وہ تم سے دور بھاگے گا''

آپ کا یہ جملہ دنیا سے انسان کے رابطہ اور انسان سے دنیا کے رابطہ کے بارے میں بہت ہی بلیغ ہے کیونکہ دنیا کی لالچ اور اس پر ٹوٹ پڑنے سے اسے اپنے نصیب سے زیادہ کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے کیونکہ دنیا بالکل سایہ کی طرح ہے کہ اگر ہم اسکی طرف آگے بڑھیں گے تو وہ ہم سے اتنا ہی آگے بڑھ جائے گا۔ گویا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنا پیچھا کرنے والے سے فرار کرجاتا ہے، لہٰذا اسکے پیچھے دوڑنے سے تھکن اور دردسر کے علاوہ اور کچھ ہاتھ آنے والا نہیں ہے۔۔۔ اور بالکل یہی حال دنیا کا بھی ہے۔

لہٰذا دنیا کو حاصل کرنے کا سب سے بہتر راستہ یہی ہے کہ طلب دنیا کی آرزو کو مختصر کردیا جائے اور دنیا کے اوپر جان کی بازی نہ لگائی جائے کیونکہ اس کے اوپر مرمٹنے سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے بلکہ انسان اپنے لئے مزید مصیبت مول لے لیتا ہے۔

---

(۱) غرر الحکم ج۲ ص۲۸۴۔

روایات کی روشنی میں عذاب دنیا کے چند نمونے

رسول اکرم ﷺ: ﴿ما سکن حب الدنیاقلباً الا التاط بثلاث: شغلٌ لا ینفذ عناؤه، وفقرٌ لا یدرك غناه، وأمل لاینال مناه﴾(۱)

"دنیا کی محبت کسی دل میں نہیں آتی مگر یہ کہ وہ تین چیزوں میں مبتلا ہو جاتا ہے ایسی مصروفیت جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتی، ایسی فقیری جو مالداری میں تبدیل نہیں ہوسکتی اور ایسی آرزو جو کبھی پوری نہیں ہوسکتی ہے"

رسول اکرم ﷺ سے مروی ہے:

﴿من أصبح والدنیا أکبرهمه، فلیس من الله فی شی ء، وألزمه قلبه أربع خصال: همّاً لا ینقطع أبداً، وشغلاً لا ینفرج عنه أبداً، وفقراً لا یبلغ غناه أبداً، وأملاً لا یبلغ منتهاه ابداً﴾(۲)

"صبح ہوتے ہی جسے سب سے زیادہ دنیا کی فکر ہو اسے خدا سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے بلکہ وہ اسکے دل میں چار خصلتوں کو راسخ کردے گا۔ کبھی ختم نہ ہونے والا غم، ایسی مصروفیت جس سے کبھی چھٹکارا نہ ملے، ایسی فقیری جو استغنا تک نہ پہونچ سکے، ایسی آرزو جو کبھی اپنی آخری منزل نہ پاسکے"

حضرت علیؑ:

﴿من لهج قلبه بحب الدنیاالتاط قلبه منهابثلاث: همٌّ لا یغنیه، ومرض لا یترکه، وأمل لا یدرکه﴾(۳)

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۷ ص ۱۸۸۔

(۲) میزان الحکمت ج ۳ ص ۳۱۹۔

(۳) شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۱۹ ص ۵۲، بحار الانوار ج ۷۳ ص ۱۳۰۔

''جس شخص کا دل دنیا کی محبت کا دلدادہ ہوجائے اسکا دل تین چیزوں میں پھنس کررہ جاتا ہے۔
ایسا غم جس سے افاقہ ممکن نہیں ایسی بیماری جو اسے کبھی نہ چھوڑے گی ایسی آرزو جسے وہ کبھی نہیں پاسکتا''

حضرت علیؑ :

﴿من کانت الدنیا اکبر همّه،طال شقاؤه وغمه﴾(۱)

''جسکے لئے دنیا سب کچھ ہوگی اسکی بدبختی اور غم طولانی ہوجائینگے''

حضرت علیؑ :

﴿من کانت الدنیا همّته اشتدت حسرته عند فراقها﴾(۲)

''جسکا سب سے بڑا مقصد، دنیا ہوتو اس سے دوری کے وقت اس کی حسرت شدید ہوجاتی ہے''

حضرت علیؑ :

﴿المتمتّعون من الدنیا تبکی قلوبهم وان فرحوا،ویشتد مقتهم لانفسهم وان اغتبطوا ببعض مارزقوا﴾(۳)

''دنیا سے لطف اندوز ہونے والے اگرچہ بظاہر خوش نظر آتے ہیں مگر ان کے دل روتے ہیں اور وہ خود اپنے نفس سے بیزار رہتے ہیں چاہے لوگ ان کے رزق سے غبطہ ہی کیوں نہ کریں''

امام جعفر صادقؑ :

﴿من تعلّق قلبه بالدنیا تعلّق قلبه بثلاث خصال:همٌّ لایُغنی،وأمل لایُدرك،ورجاء لایُنال﴾(۴)

---

(۱)بحارالانوارج ۷۳ص ۸۱۔

(۲)بحارالانوارج ۷۱ص ۱۸۱۔

(۳)بحارالانوارج ۷۸ص ۲۱۔

(۴)بحارالانوارجلد ۷۳ص ۲۴۔

''جسکا دل دنیا سے وابستہ ہو جائے اسکے دل کے اندر تین خصلتیں پیدا ہو جاتی ہیں: لازوال غم، پوری نہ ہونے والی آرزو، ہاتھ نہ آنے والی امید''

یہ رنگ برنگے عذاب، دنیا کے ان عذابوں کا کچھ حصہ ہیں جو خداوند عالم نے خواہشات کی پیروی کرنے والوں کے لئے آخرت سے پہلے اسی دنیا میں معین فرمادئے ہیں مثلاً اہل ثروت کو اپنے اقرباء یا دور والوں سے اپنے مال کے بارے میں جو خوف اور پریشانی لاحق رہتی ہے یہ ان کے لئے دنیاوی عذاب کا صرف ایک حصہ ہے۔

آخرت میں انسان کی سرگردانی و پریشاں حالی

حدیث قدسی میں انسان کی جس پریشان حالی (افتراق اور درہم برہم ہوجانے) کا تذکرہ ہے اسکا تعلق صرف دنیا سے ہی نہیں ہے بلکہ دنیا کی طرح اسے آخرت میں بھی اسی صورتحال سے دوچار ہونا پڑے گا۔

آخرت میں یہ افتراق اور بیقراری سب سے پہلے اپنے خواہشات نفس اور ہوی وہوس کے پیچھے چلنے والوں کے درمیان ہی دکھائی دینگے کیونکہ وہ دنیا میں جسمانی اعتبار سے بظاہر متحد ضرور تھے مگر ان سب کی تمنائیں اور ہوس ایک دوسرے سے الگ تھیں نیز انھوں نے اپنے جو اختلافات دنیا میں چھپا رکھے تھے وہ سب آخرت میں کھل کر سامنے آجائیں گے خداوند عالم نے قرآن مجید میں اہل جہنم کے حالات کی یوں تصویر کشی کی ہے:

﴿کلما دخلت اُمةٌ لعنت اُختها﴾(۱)

''جہنم میں داخل ہونے والی ہر جماعت اپنی دوسری برادری پر لعنت کرے گی''

اس اختلاف اور انتشار یا خانہ جنگی کی دوسری صورت اس وقت سامنے آئے گی کہ جب انسان خدا سے اپنے جرائم چھپانا چاہے گا اور اسی وقت اس کے اعضاء اسکے جرائم کے بارے میں

---

(۱) سورۂ اعراف آیت ۳۸

گواہی دینے لگیں گے تو وہ ان پر غصہ ہوگا اور اسی وقت اسکے یہی ہاتھ پیر اور کھال وغیرہ اسے ذلیل و رسوا کر کے رکھ دینگے تو وہ اپنے اعضاء سے یہ کہے گا:

﴿وقالوا لجلودهم لم شهدتم علينا قالوا أنطقنا الله الذى أنطق كلّ شيء﴾(۱)

"اور وہ (اہل جہنم) اپنے اعضاء سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیسے شہادت دیدی تو وہ جواب دینگے کہ ہمیں اسی خدا نے گویا بنایا ہے جس نے ہر چیز کو گویائی عطا کی ہے"

بلکہ روایات میں تو یہاں تک ہے کہ روز قیامت اپنی خواہشات کی پیروی کرنے والے گنہگاروں کے بعض اعضاء ان سے اظہار نفرت کرینگے اور ایک دوسرے پر لعنت کرتے دکھائی دینگے اور یہ بعینہ وہی صورتحال ہے جو دنیا میں خواہشات کی پیروی کی بنا پر انسان کے اندر دکھائی دیتی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے:

﴿كُفّ أذاك عن نفسك،ولا تتابع هواها فى معصية الله،اذتخا صمك يوم القيامة،فيلغى بعضك بعضاً،الا أن يغفر الله و يستر برحمته﴾(۲)

"اپنے نفس کو اذیت نہ دو اور معصیت خدا میں اپنے نفس کے خواہشات کی پیروی نہ کرو کیونکہ وہ روز قیامت تم سے جھگڑا کریگا اور اسکا بعض حصہ دوسرے حصہ کو برا بھلا کہے گا۔مگر یہ کہ خداوند کریم تمہیں معاف فرمادے اور اپنی رحمت کے پردے ڈال دے"

۲۔اسکی دنیا کو اسکے لئے مزین کردوں گا

دنیا کا ظاہر اور باطن

---

(۱)سورۂ فصلت آیت ۲۱۔

(۲)محجۃ البیضاء فیض کاشانی ج۵ص ۱۱۱۔

خواہشات کی پیروی کرنے والے کی دوسری سزا یہ ہے کہ اسکے لئے دنیا مزین کردی جاتی ہے اور دنیا کے مزین ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ظاہری لحاظ سے دنیا اس پر فریب انداز میں اس کے سامنے آتی ہے کہ وہ اسے دیکھ کر دھوکہ میں پڑا رہتا ہے جبکہ وہ دنیا کی واقعی شکل نہیں ہوتی ہے اور انسان اسی ظاہری صورت سے فریب کھا جاتا ہے کیونکہ اس کی جن ظاہری صورتوں کو دیکھ کر وہ فریب خوردہ رہتا ہے وہ وقتی ہیں اور ان میں بہت جلد تبدیلی آجاتی ہے لیکن دنیا کی واقعی شکل وصورت جو اسکے بالکل برخلاف ہے وہ درحقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا انسان کے لئے مقام عبرت اور چشم بصیرت حاصل کرنے نیز زہد وتقوی اختیار کرنے کا سرچشمہ اور مرکز ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جن افراد کو خداوند عالم نے چشم بصیرت عنایت فرمائی ہے ان کی نگاہیں دنیا کے وقتی اور اوپری خول کے اندر گھس کر اس کی حقیقت کو بخوبی دیکھ لیتی ہیں اسی لئے وہ اس میں زہد سے کام لیتے ہیں اور اس سے عبرت اور نصیحت حاصل کرتے رہتے ہیں لیکن جو لوگ خداوند عالم کی عطا کردہ بصیرت کو ضائع کردیتے ہیں وہ زندگانی دنیا کو اسی ظاہری نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کی نگاہیں اس کے باطن اور حقیقت تک نہیں پہونچ پاتی ہیں لہٰذا ان کے دل اس کے دھوکہ میں پڑے رہتے ہیں۔

مختصر یہ کہ دنیا کے دوروپ ہیں:

۱۔ظاہری

۲۔باطنی

اسی اعتبار سے اہل دنیا کی بھی دوقسمیں ہیں:

۱۔کچھ وہ لوگ ہیں جن کی نگاہیں دنیا کے ظاہر سے آگے نہیں بڑھتی ہیں۔

۲۔کچھ ایسے افراد ہیں جن کی نظریں دنیا کے باطن کو بخوبی دیکھ لیتی ہیں۔

اس تقسیم کی طرف قرآن مجید نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے۔

﴿یعلمون ظاھراًمن الحیاۃ الدنیا وھم عن الآخرۃ ھم غافلون﴾(۱)

''یہ لوگ صرف زندگانی دنیا کے ظاہر کو جانتے ہیں اور آخرت کی طرف سے بالکل غافل ہیں''

لیکن جن لوگوں کو خداوند عالم نے فہم وبصیرت عطا فرمائی ہے ان کے سامنے دنیا کا ظاہر وباطن ایک دوسرے سے مشتبہ نہیں ہوتا ہے۔البتہ جب خداوند عالم کسی سے غضبناک ہوجاتا ہے تو اس کی بصیرت سلب کرلیتا ہے اور پھر اسکے سامنے دنیا کا ظاہر وباطن مخلوط ہوکررہ جاتا ہے اور وہ اسکے ظاہری خول اور اسکی واقعی حقیقت کے درمیان تمیز نہیں کرپاتا لہٰذا دنیا کی ظاہری رنگینیاں اسے دھوکہ دیدیتی ہیں اور وہ بھی اس دنیا کو فریب خوردہ نگاہ سے دیکھتا ہے جسکی طرف قرآن مجید نے یوں اشارہ کیا ہے:

﴿زُیّن للذین کفروا الحیاۃ الدنیا﴾(۲)

''اصل میں کافروں کے لئے زندگانی دنیا آراستہ کردی گئی ہے''

لہٰذا کیونکہ وہ اسکے پرفریب ظاہر کو دیکھتا ہے اس لئے اسکی نگاہوں میں دنیا بجی رہتی ہے لیکن اگر اسکے باطن پر نگاہ رکھی جائے تو پھر کبھی اسکی رنگینی نظر نہ آئے گی۔

مختصر یہ کہ زندگانی دنیا کے دوروپ اور دو چہرے ہوتے ہیں:

ا۔باطنی حقیقت (اصلی چہرہ)

ب۔ظاہری چہرہ

أ۔دنیا کا باطنی چہرہ (اصل حقیقت)

جیسا کہ ہم عرض کرچکے ہیں کہ دنیا کی واقعی شکل وصورت صرف اہل بصیرت کو دکھائی دیتی

---

(۱)سورۂ روم آیت ۷۔

(۲)سورۂ بقرہ آیت ۲۱۲۔

ہے اور اسکی اس شکل میں کسی قسم کا دھوکہ اور فریب نہیں ہے بلکہ وہ منزل عبرت ونصیحت ہے جیسا کہ قرآن کریم نے بھی دنیا کے اس پہلو کی نہایت دقیق تعریف وتوصیف فرمائی ہے جسکے بعض نمونے ملاحظہ فرمائیں:

ا۔ دنیا ایک پونجی ہے: ارشاد الٰہی ہے:

﴿وما الحیاۃ الدنیا فی الآخرۃ الا متاع﴾(۱)

''اور آخرت میں زندگانی دنیا کی حقیقت مختصر پونجی کے علاوہ اور کیا ہے''

متاع، وقتی لذت کو کہا جاتا ہے جبکہ اس کے بالمقابل آخرت کی لذتیں دائمی اور باقی رہنے والی ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿فما متاع الحیاۃ الدنیا فی الآخرۃ الا قلیل﴾(۲)

''پس آخرت میں اس متاع زندگانی دنیا کی حقیقت بہت قلیل ہے''

۲۔ دنیا عارضی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿تریدون عرَضَ الدنیا واللہ یرید الآخرۃ﴾(۳)

''تم لوگ صرف مال دنیا چاہتے ہو جبکہ اللہ آخرت چاہتا ہے''

یا ارشاد ہے:

﴿تبتغون عَرَضَ الحیاۃ الدنیا فعند اللہ مغانم کثیرۃ﴾(۴)

''اس طرح تم زندگانی دنیا کا چندروزہ سرمایہ چاہتے ہو اور خدا کے پاس بکثرت فوائد پائے جاتے ہیں''

---

(۱) سورۂ رعد آیت ۲۶۔

(۲) سورۂ توبہ آیت ۳۸۔

(۳) سورۂ انفال آیت ۶۷۔

(۴) سورۂ نساء آیت ۹۴۔

﴿یاخذون عَرَضَ هذا الادنیٰ و یقولون سَیُغفَرلنا﴾(۱)

''لیکن وہ دنیا کا ہر مال لیتے رہے اور یہ کہتے رہے کہ عنقریب ہمیں بخش دیا جائے گا''

عارضی چیز اسکو کہتے ہیں جو بہت جلد تبدیل ہوکر ختم ہوجائے اور کیونکہ دنیا کی لذتیں تبدیل ہوکر ختم ہوجاتی ہیں اور کسی کے لئے بھی باقی رہنے والی نہیں ہیں اسکے باوجود بھی یہ لوگوں کو بری طرح فریب میں مبتلا کردیتی ہیں۔

گویا دنیا کی دو صفتیں ہیں:

۱۔وہ صفت جس سے انسان زاہد دنیا بن جاتا ہے۔

۲۔وہ صفت جو انسان کو فریب میں مبتلا کردیتی ہے۔(جس سے انسان دھوکہ کھا جاتا ہے)

وہ صفت جس کی بنا پر انسان زاہد بن جاتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ دنیا عارضی،زوال پذیر اور بہت جلد ختم ہوجانے والی ہے۔(لہٰذا وہ اس سے دل نہیں لگاتا)

لیکن اسکا پرفریب رخ یہ ہے کہ یہ نرم لقمہ ہے نچلی سطح پر جلد ہاتھ آجاتی ہے۔

اور کیونکہ لوگ عام طور سے عجلت پسند ہوتے ہیں لہٰذا وہ جلد ہاتھ آنے والی چٹ پٹی چیزوں کو دیر سے ملنے والی دائمی نعمتوں پر ترجیح دیتے ہیں جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿لو کان عرضاً قریباً و سفراً قاصداً لا تبعوك﴾(۲)

''پیغمبر،اگر کوئی قریبی فائدہ یا آسان سفر ہوتا تو یہ ضرور تمہارا اتباع کرتے''

اس طرح انسان کی طبیعت اور فطرت میں ہی جلد بازی پائی جاتی ہے۔

۳۔دنیا دھوکہ اور فریب کا اڈہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

---

(۱)سورۂ اعراف آیت ۱۶۹۔

(۲)سورۂ توبہ آیت ۴۲۔

﴿فلا تغرّنکم الحیاۃ الدنیا و لایغرّنکم باللہ الغرور﴾(۱)

''لہٰذا تمہیں زندگانی دنیا دھوکہ میں نہ ڈال دے اور خبردار کوئی دھوکہ دینے والا بھی تمہیں دھوکہ نہ دے سکے''

۴۔اور دنیا متاع غرور ہے: یہ دو الفاظ کی ترکیب ہے جن کو قرآن مجید نے دنیا کے لئے الگ الگ اور ایک ساتھ دونوں طرح استعمال کیا ہے۔جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿وما الحیاۃ الدنیا الا متاع الغرور﴾(۲)

''اور زندگانی دنیا تو صرف دھوکہ کا سرمایہ ہے''

اس فریب کی اصل بنیاد دنیا کی وقتی اور ختم ہو جانے والی پونجی ہے۔

دنیا اور آخرت کا تقابلی جائزہ

اگر ہم قرآن مجید پر ایک اور نظر ڈالیں تو اسکے بیان کردہ اوصاف کی روشنی میں دنیا و آخرت کا موازنہ کرنا بہت آسان ہے جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کے قرآن مجید کی نگاہ میں یہ دنیا وقتی، بہت جلد قابل زوال اور ایسی پونجی ہے جو کسی کے لئے دائمی (اور باقی رہنے والی) نہیں ہے لیکن آخرت سکون و اطمینان کی ایک دائمی جگہ ہے۔جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿یاقوم انما ھذہ الحیاۃ الدنیا متاع و انّ الآخرۃ ھی دار القرار﴾(۳)

''قوم والو، یاد رکھو کہ یہ حیات دنیا صرف چند روزہ لذت ہے اور ہمیشہ رہنے کا گھر صرف آخرت کا گھر ہے''

---

(۱)سورۂ لقمان آیت ۳۳ سورۂ فاطر آیت ۵۔

(۲)سورۂ آل عمران آیت ۱۸۵ سورۂ حدید آیت ۲۰۔

(۳)سورۂ غافر آیت ۳۹۔

دنیا ایک کھیل تماشہ ہے لیکن آخرت دائمی حیات کا گھر ہے اور وہی حقیقی زندگی ہے اور وہ زندگی کھیل تماشہ نہیں ہے۔

جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿وماھذہ الحیاۃ الدنیا الا لھو ولعب وان الدار الآخرۃ لھی الحیوان لو کانوا یعلمون﴾(۱)

''اور یہ دنیاوی زندگی تو کھیل تماشہ کے سوا کچھ نہیں اور اگر یہ لوگ سمجھیں بوجھیں تو اس میں شک نہیں کہ ابدی زندگی (کی جگہ) تو بس آخرت کا گھر ہے''

کلام امیر المومنینؑ میں دنیا کا تذکرہ

مولائے کائناتؑ نے اپنے اقوال میں دنیا کی حقیقت کو بالکل آشکار کردیا ہے اور اس کے چہرہ سے دھوکہ اور فریب کی نقاب نوچ لی ہے جس کے بعد ہر شخص دنیا کی اصلی شکل وصورت کو بآسانی پہچان سکتا ہے۔

لہٰذا دنیا کے بارے میں آپ کے چند اقوال ملاحظہ فرمائیں:

۱۔﴿واللہ مادنیاکم عندی الا کسَفرٍ علیٰ منھل حلّوا،اذصاح بھم سائقھم فارتحلوا،ولالذاذتُھافی عینی الا کحمیم أشربُہ غسّاقا،وعلقم أتجرع بہ زُعافا،وسمّ أفعاۃٍ دِھاقاً،وقَلادۃٍ من نار﴾(۲)

''خدا کی قسم تمہاری دنیا میرے نزدیک ان مسافروں کی طرح ہے جو کسی چشمہ پر اترے ہوں،اور جیسے ہی قافلہ سالار آواز لگائے وہ چل پڑیں،اور اسکی لذتیں میری نگاہ میں اس گرم اور

---

(۱)سورۂ عنکبوت آیت ۶۴۔

(۲)بحار الانوار ج ۷۷ ص ۳۵۲۔

گندے پانی کی طرح ہیں جسے مجبوراً پینا پڑے اور وہ کڑوی چیز ہے جسے مردنی کی حالت میں زبردستی گلے سے نیچے اتارا جائے اور وہ اژدہے کے زہر سے بھرا ہوا پیالہ اور آگ کا طوق ہے"

اس دنیا کا جو رخ لوگوں کو دکھائی دیتا ہے وہ اسی بھرے ہوئے چشمہ کی طرح ہے جس پر قافلہ ٹھہرا ہو"سفر علی منهل حلوا "اور یہ اسکا وہی ظاہری رخ ہے جس کے اوپر وہ ایک دوسرے کو مرنے اور مارنے کو تیار رہتے ہیں۔ جبکہ مولائے کائناتؑ نے اس کو زود گذر قرار دیا ہے جو کہ دنیا کا واقعی چہرہ ہے:

﴿اذصاح بهم سائقهم فارتحلوا﴾ "جیسے ہی قافلہ سالار آواز لگائے وہ چل پڑیں"

یہی وجہ ہے کہ دنیا کی جن لذتوں کیلئے لوگ ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے ہیں وہ مولائے کائناتؑ کی نگاہ میں گرم، بدبودار اور سانپ کے زہر کے پیالہ کی طرح ہے۔

"جب معاویہ نے جناب ضرار بن حمزہ شیبانی (رح) سے امیر المومنین " کے اوصاف و خصائل و معلوم کئے تو آپ نے کہا کہ بعض اوقات میں نے خود دیکھا ہے کہ آپ رات کی تاریکی میں محراب عبادت میں کھڑے ہیں اور اپنی ریش مبارک ہاتھ میں لئے ہوئے ایک بیمار کی طرح تڑپ رہے ہیں اور ایک غمزدہ کی طرح گریہ کر رہے ہیں اس وقت آپ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری رہتے ہیں:

﴿یادنیاالیك عنی،أبی تعرّضتِ؟أم الیّ تشوّقتِ؟هیهات!!غرّی غیری لا حاجة لی فیك،قدطلّقتك ثلاثاً،لارجعة فیها: فعیشك قصیر،وخطرك کبیر،واملك حقیر،آه من قلّة الزاد،وطول الطریق﴾(۱)

"اے دنیا مجھ سے دور ہو جا کیا تو میرے سامنے بن ٹھن کر آئی ہے اور کیا واقعاً میری مشتاق بن کر آئی ہے بہت بعید ہے جا میرے علاوہ کسی اور کو دھوکا دینا مجھے تیری کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں تجھے تین بار طلاق دے چکا ہوں جسکے بعد رجوع ممکن نہیں ہے تیری زندگی بہت مختصر، تیری حیثیت

---

(۱) نہج البلاغہ حکمت ۷۷ و بحار الانوار ج ۳۳ ص ۱۲۹۔

بہت معمولی، تیری آرزوئیں حقیر ہیں، آہ، زادراہ کس قدر کم اور راستہ کتنا طولانی ہے"

آپ نے دنیا کے ان تینوں حقائق کو اس سے فریب کھانے والے شخص کے لئے واضح کر دیا ہے کہ اسکی زندگی بہت مختصر اسکے خطرات زیادہ اور اسکی آرزوئیں حقیر ہیں۔

اس بارے میں آپ کے یہ ارشادات بھی ہیں۔

۱۔﴿ألاوان الدنيا دار غرّارة، خداعة، تنكح في كل يوم بعلاً، وتقتل في كل ليلة أهلاً، وتُفرّق في كل ساعة شملاً﴾(۱)

"یاد رکھو یہ دنیا بہت پر فریب گھر ہے اور بیحد دھوکے باز (عورت کے مانند ہے جو) ہر روز ایک نئے شوہر سے نکاح کرتی ہے اور ہر رات اپنے گھر والوں کو ہلاک کر ڈالتی ہے اور ہر ساعت ایک قوم کو متفرق کر ڈالتی ہے"

۲۔﴿ان اقبلت غرّت، وان ادبرت ضرّت﴾(۲)

"اگر یہ دنیا تمہاری طرف رخ کرے گی تو تمہیں فریب میں مبتلا کر دیگی اور اگر وہ تمہارے ہاتھ سے نکل گئی تو نقصان دہ ہے"

۳۔﴿الدنیا غرور حائل، وسراب زائل، وسناد مائل﴾(۳)

"دنیا بدل جانے والا فریب، زائل ہو جانے والا سراب اور خم شدہ ستون ہے"

۴۔دنیا کے ظاہر و باطن کی نقشہ کشی آپ نے ان الفاظ میں کی ہے:

﴿مثل الدنيا مثل الحيّة مسّها ليّن، وفي جوفها السم القاتل، يحذرها الرجال ذوو العقول، ويهوى اليها الصبيان بأيديهم﴾(۴)

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۷ ص ۳۷۴۔

(۲) بحار الانوار ج ۷۸ ص ۲۳۔

(۳) غرر الحکم ج ۱ ص ۱۰۹۔

(۴) بحار الانوار ج ۷۸ ص ۳۱۱۔

''یہ دنیا بالکل سانپ کی طرح ہے جو چھونے میں بہت نرم ہے مگر اسکے اندر مہلک زہر بھرا ہوا ہے اہل عقل اس سے ڈرتے رہتے ہیں اور بچے اسے ہاتھ میں اٹھانے کیلئے جھک جاتے ہیں''

اس قول میں امام نے بہت ہی حسین وجمیل انداز میں دنیا کے ظاہر و باطن کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے کہ اسکا ظاہر سانپ کی طرح جاذب نظر اور چھونے پر بہت نرم معلوم ہوتا ہے لیکن اسکے باطن میں دھوکہ اور زوال ہی زوال ہے جیسے ایک سانپ کے منھ میں مہلک زہر بھرا رہتا ہے۔

اسی طرح اس دنیا کی طرف دیکھنے والے لوگوں کی بھی دو قسمیں ہیں:

اہل عقل اور صاحبان بصیرت اس سے خائف رہتے ہیں جس طرح انہیں سانپ سے خوف محسوس ہوتا ہے۔لیکن ان کے علاوہ بقیہ لوگ اس سے اسی طرح دھوکہ کھا جاتے ہیں جس طرح زہریلے سانپ کی چمکیلی اور نرم کھال دیکھ کر بچے دھوکہ کھاتے ہیں۔

آپ کے ایک خطبہ کا ایک حصہ

''یہ ایک ایسا گھر ہے جو بلاؤں میں گھرا ہوا ہے اور اپنی غداری میں مشہور ہے نہ اس کے حالات کو دوام ہے اور نہ اس میں نازل ہونے والوں کے لئے سلامتی ہے۔

اسکے حالات مختلف اور اسکے طور طریقے بدلنے والے ہیں اس میں پر کیف زندگی قابل مذمت ہے اور اس میں امن وامان کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں ہے۔۔۔اسکے باشندے وہ نشانے ہیں جن پر دنیا اپنے تیر چلاتی رہتی ہے اور اپنی مدت کے سہارے انھیں فنا کے گھاٹ اتارتی رہتی ہے۔

اے بندگان خدا، یاد رکھو اس دنیا میں تم اور جو کچھ تمہارے پاس ہے سب کا وہی راستہ ہے جس پر پہلے والے چل چکے ہیں جن کی عمریں تم سے زیادہ طویل اور جن کے علاقے تم سے زیادہ آباد تھے ان کے آثار بھی دور دور تک پھیلے ہوئے تھے لیکن اب ان کی آوازیں دب گئیں ہیں ان کی ہوائیں اکھڑ گئیں ہیں ان کے جسم بوسیدہ ہو گئے ہیں۔ان کے مکانات خالی ہو گئے ہیں اور ان کے آثار مٹ چکے ہیں وہ مستحکم قلعوں اور بچھی ہوئی مسندوں کو پتھروں اور چنی ہوئی سلوں اور زمین کے

اندر قبروں میں تبدیل کر چکے ہیں جن کے صحنوں کی بنیاد تباہی پر قائم ہے اور جن کی عمارت مٹی سے مضبوط کی گئی ہے ۔ان قبروں کی جگہیں تو قریب قریب ہیں لیکن ان کے رہنے والے سب ایک دوسرے سے اجنبی اور بیگانہ ہیں ایسے لوگوں کے درمیان ہیں جو بوکھلائے ہوئے ہیں اور یہاں کے کاموں سے فارغ ہو کر وہاں کی فکر میں مشغول ہو گئے ہیں ۔نہ اپنے وطن سے کوئی انس رکھتے ہیں اور نہ اپنے ہمسایوں سے کوئی ربط رکھتے ہیں ۔حالانکہ بالکل قرب وجوار اور نزدیک ترین دیار میں ہیں ۔ اور ظاہر ہے اب ملاقات کا کیا امکان ہے جبکہ بوسیدگی نے انہیں اپنے سینہ سے دبا کر پیس ڈالا ہے اور پتھروں اور مٹی نے انہیں کھا کر برابر کر دیا ہے اور گویا کہ اب تم بھی وہیں پہونچ گئے ہو جہاں وہ پہونچ چکے ہیں اور تمہیں بھی اسی قبر نے گروی رکھ لیا ہے اور اسی امانت گاہ نے جکڑ لیا ہے ۔

ذرا سوچو اس وقت کیا ہوگا جب تمہارے تمام معاملات آخری حد تک پہنچ جائیں گے اور دوبارہ قبروں سے نکال لیا جائے گا اس وقت ہر نفس اپنے اعمال کا خود محاسبہ کرے گا اور سب کو مالک برحق کی طرف پلٹا دیا جائے گا اور کسی پر کوئی افتراپردازی کام آنے والی نہ ہوگی ۔(۱)

سید رضی نے نہج البلاغہ میں نقل کیا ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ نے شریح بن حارث سے فرمایا:

﴿بلغني انك ابتعت داراً بثمانين ديناراً، وكتبت لها كتاباً، وأشهدت فيه شهوداً؟!...﴾

مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم نے اسی (۸۰) دینار میں ایک گھر خریدا ہے اور اسکے لئے باقاعدہ ایک بیع نامہ لکھ کر لوگوں کی گواہی بھی درج کی ہے ۔تو شریح نے عرض کی: اے امیر المومنینؑ ۔جی ہاں: ایسا ہی ہے ۔تو آپ نے ان کی طرف غصہ بھری نظروں سے دیکھ کر کہا ۔اے شریح عنقریب تمہارے پاس ایسا شخص آنے والا ہے جو نہ تمہارے اس بیع نامہ کو دیکھے گا اور نہ گواہوں کے بارے

---

(۱) نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۶۔

میں تم سے کچھ سوال کرے گا اور وہ تمہیں اس گھر سے نکال کر تن تنہا تمہاری قبر کے حوالے کر دیگا لہذا۔ اے شریح۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم نے اس گھر کو اپنے مال سے نہ خریدا ہو اور ناجائز طریقے سے اسکے دام ادا کئے ہوں۔ اگر ایسا ہوا تو تم دنیا اور آخرت دونوں جگہ گھاٹے میں ہو۔ کاش تم یہ گھر خریدنے سے پہلے میرے پاس آ جاتے تو میں تمہارے لئے ایک دستاویز تحریر کر دیتا تو تم ایک درہم میں بھی یہ گھر نہ خریدتے۔

میں اسکی دستاویز اس طرح لکھتا:

یہ وہ مکان ہے جسے ایک بندۂ ذلیل نے اس مرنے والے سے خریدا ہے جسے کوچ کے لئے آمادہ کر دیا گیا ہے۔ یہ مکان پر فریب دنیا میں واقع ہے جہاں فنا ہونے والوں کی بستی ہے اور ہلاک ہونے والوں کا علاقہ ہے۔ اس مکان کے حدود اربعہ یہ ہیں۔

ایک حد اسباب آفات کی طرف ہے اور دوسری اسباب مصائب سے ملتی ہے تیسری حد ہلاک کر دینے والی خواہشات کی طرف ہے اور چوتھی گمراہ کرنے والے شیطان کی طرف اور اسی طرف سے گھر کا دروازہ کھلتا ہے۔

اس مکان کو امیدوں کے فریب خوردہ نے اجل کے راہ گیر سے خریدا ہے جس کے ذریعہ قناعت کی عزت سے نکل کر طلب وخواہش کی ذلت میں داخل ہو گیا ہے۔ اب اگر اس خریدار کو اس سودے میں کوئی خسارہ ہو تو یہ اس ذات کی ذمہ داری ہے جو بادشاہوں کے جسموں کو تہ وبالا کرنے والا، جابروں کی جان لینے والا، فرعونوں کی سلطنت کو تباہ کر دینے والا، کسریٰ وقیصر، تبع وحمیر اور زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے والوں، مستحکم عمارتیں بنا کر انھیں سجانے والوں، ان میں بہترین فرش بچھانے والوں اور اولاد کے خیال سے ذخیرہ کرنے والوں اور جاگیریں بنانے والوں کو فنا کے گھاٹ اتار دینے والا ہے۔ کہ ان سب کو قیامت کے میدان حساب اور منزل ثواب وعذاب میں حاضر کر دے جب حق

وباطل کا حتمی فیصلہ ہوگا اور اہل باطل یقیناً خسارہ میں ہونگے۔

اس سودے پر اس عقل نے گواہی دی ہے جو خواہشات کی قید سے آزاد اور دنیا کی وابستگیوں سے محفوظ ہے''(۱)

دنیا کے بارے میں آپ نے یہ بھی فرمایا ہے:

یادرکھو:اس دنیا کا سرچشمہ گندہ اور اسکا گھاٹ گندھلا ہے،اسکا منظر خوبصورت دکھائی دیتا ہے لیکن اندر کے حالات انتہائی درجہ خطرناک ہیں،یہ ایک فنا ہوجانے والا فریب،بجھ جانے والی روشنی،ڈھل جانے والا سایہ اور ایک گرجانے والا ستون ہے۔جب اس سے نفرت کرنے والا مانوس ہوجاتا ہے اور اسے برا سمجھنے والا مطمئن ہوجاتا ہے تو یہ اچانک اپنے پیروں کو پٹکنے لگتی ہے اور عاشق کو اپنے جال میں گرفتار کرلیتی ہے اور پھر اپنے تیروں کا نشانہ بنالیتی ہے انسان کی گردن میں موت کا پھندہ ڈال دیتی ہے اور اسے کھینچ کر قبر کی تنگی اور وحشت کی منزل تک لے جاتی ہے جہاں وہ اپنا ٹھکانہ دیکھ لیتا ہے اور اپنے اعمال کا معاوضہ حاصل کرلیتا ہے اور یوں ہی یہ سلسلہ نسلوں میں چلتا رہتا ہے کہ اولاد بزرگوں کی جگہ پر آجاتی ہے نہ موت چیرہ دستیوں سے باز آتی ہے اور نہ آنے والے افراد گناہوں سے باز آتے ہیں پرانے لوگوں کے نقش قدم پر چلتے رہتے ہیں اور تیزی کے ساتھ اپنی آخری منزل انتہاء وفنا کی طرف بڑھتے رہتے ہیں۔(۲)

دنیا کے بارے میں آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے:

''میں اس دار دنیا کے بارے میں کیا بیان کروں جسکی ابتداء رنج وغم اور انتہا فنا ونابودی ہے

---

(۱) نہج البلاغہ مکتوب ۳۔

(۲) نہج البلاغہ خطبہ ۸۳۔

اسکے حلال میں حساب ہے اور حرام میں عذاب، جو اس میں غنی ہو جائے وہ آزمائشوں میں مبتلا ہو جائے۔ اور جو فقیر ہو جائے وہ رنجیدہ وافسردہ ہو جائے۔ جو اسکی طرف دوڑ لگائے اسکے ہاتھ سے نکل جائے اور جو منھ پھیر کر بیٹھ رہے اسکے پاس حاضر ہو جائے جو اسکو ذریعہ بنا کر آگے دیکھے اسے بینا بنادے اور جو اسے منظور نظر بنالے اسے اندھا بنادے"(۱)

اپنے دور خلافت سے پہلے آپ نے جناب سلمان فارسیؓ کو اپنے ایک خط میں یہ بھی تحریر فرمایا تھا۔ امابعد: اس دنیا کی مثال صرف اس سانپ جیسی ہے جو چھونے میں انتہائی نرم ہوتا ہے لیکن اسکا زہر انتہائی قاتل ہوتا ہے اس میں جو چیز اچھی لگے اس سے بھی کنارہ کشی اختیار کرو۔ کہ اس میں سے ساتھ جانے والا بہت کم ہے۔ اسکے ہم وغم کو اپنے سے دور رکھو کہ اس سے جدا ہونا یقینی ہے اور اسکے حالات بدلتے ہی رہتے ہیں۔ اس سے جس وقت زیادہ انس محسوس کرو اس وقت زیادہ ہوشیار رہو کہ اسکا ساتھی جب بھی کسی خوشی کی طرف سے مطمئن ہو جاتا ہے تو یہ اسے کسی ناخوشگواری کے حوالے کر دیتی ہے اور انس سے نکال کر وحشت کے حالات تک پہونچا دیتی ہے۔ والسلام"(۲)

دنیا کے بارے میں آپ نے یہ بھی فرمایا ہے:

آگاہ ہو جاؤ دنیا جا رہی ہے اور اس نے اپنی رخصت کا اعلان کر دیا ہے اور اسکی جانی پہچانی چیزیں بھی اجنبی ہو گئی ہیں وہ تیزی سے منھ پھیر رہی ہے اور اپنے باشندوں کو فنا کی طرف لی جا رہی ہے اور اپنے ہمسایوں کو موت کی طرف ڈھکیل رہی ہے اسکی شیرینی تلخ ہو چکی ہے اور اسکی صفائی ہو چکی ہے اب اس میں صرف اتنا ہی پانی باقی رہ گیا ہے جو، تہ میں بچا ہوا ہے اور وہ نپا تلا گھونٹ رہ گیا ہے جسے پیاسا پی بھی لے تو اسکی پیاس نہیں بجھ سکتی ہے لہٰذا بندگان خدا اب اس دنیا سے کوچ کرنے کا ارادہ کر لو جسکے رہنے والوں کا مقدر زوال ہے اور خبردار: تم پر خواہشات غالب نہ آنے پائیں اور اس

---

(۱) نہج البلاغہ خطبہ ۸۲۔

(۲) نہج البلاغہ مکتوب ۶۸۔

مختصر مدت کو طویل نہ سمجھ لینا"(۱)

دنیا کے بارے میں آپؑ نے یہ بھی فرمایا ہے:

میں تم لوگوں کو دنیا سے ہوشیار کر رہا ہوں کہ یہ شیریں اور شاداب ہے لیکن خواہشات میں گھری ہوئی ہے اپنی جلد مل جانے والی نعمتوں کی بنا پر محبوب بن جاتی ہے اور تھوڑی سی زینت سے خوبصورت بن جاتی ہے یہ امیدوں سے آراستہ ہے اور دھوکہ سے مزین ہے۔ نہ اس کی خوشی دائمی ہے اور نہ اس کی مصیبت سے کوئی محفوظ رہنے والا ہے یہ دھوکہ باز، نقصان رساں، بدل جانے والی، فنا ہو جانے والی، زوال پذیر اور ہلاک ہو جانے والی ہے۔ یہ لوگوں کو کھا بھی جاتی ہے اور مٹا بھی دیتی ہے۔

جب اسکی طرف رغبت رکھنے والوں اور اس سے خوش ہو جانے والوں کی خواہشات انتہاء کو پہونچ جاتی ہے تو یہ بالکل پروردگار کے اس ارشاد کے مطابق ہو جاتی ہے:

﴿کماءٍ أنزلناہ من السماء فاختلط بہ نبات الأرض فاصبح ھشیماً تذروہ الریاح و کان اللہ علیٰ کل شیءٍ مقتدرا﴾(۲)

"یعنی دنیا کی مثال اس پانی کے جیسی ہے جسے ہم نے آسمان سے نازل کیا اور اسکے ذریعہ زمین کے سبزہ مخلوط (ہوکر روئیدہ) ہوئے وہ سبزہ سوکھ کر ایسا تنکا ہو گیا جسے ہوائیں اڑا لے جاتی ہیں اور اللہ ہر شئے پر قدرت رکھنے والا ہے"

اس دنیا میں کوئی شخص خوش نہیں ہوا ہے مگر یہ کہ اسے بعد میں آنسو بہانا پڑے اور کوئی اس کی خوشی کو آتے نہیں دیکھتا ہے مگر یہ کہ وہ مصیبت میں ڈال کر پیٹھ دکھلا دیتی ہے اور کہیں راحت و آرام کی ہلکی بارش نہیں ہوتی ہے مگر یہ کہ بلاؤں کا دوگڑا گرنے لگتا ہے۔ اس کی شان ہی یہ ہے کہ اگر صبح کو کسی طرف سے بدلہ لینے آتی ہے تو شام ہوتے ہوتے انجان بن جاتی ہے اور اگر ایک طرف سے

---

(۱) نہج البلاغہ خطبہ ۵۲۔

(۲) سورۂ کہف آیت ۴۵۔

شیریں اور خوش گوار نظر آتی ہے تو دوسرے رُخ سے تلخ اور بلا خیز ہوتی ہے۔کوئی انسان اس کی تازگی سے اپنی خواہش پوری نہیں کرتا ہے مگر یہ کہ اس کے پے در پے مصائب کی بنا پر رنج وتعب کا شکار ہو جاتا ہے اور کوئی شخص شام کو امن وامان کے پروں پر نہیں رہتا ہے مگر یہ کہ صبح ہوتے ہوتے خوف کے بالوں پر لا دیا جاتا ہے۔یہ دنیا دھوکہ باز ہے اور اس کے اندر جو کچھ ہے سب دھوکہ ہے۔یہ فانی ہے اور اس میں جو کچھ ہے سب فنا ہونے والا ہے۔اس کے کسی زادراہ میں کوئی خیر نہیں ہے سوائے تقویٰ کے۔ اس میں سے جو کم حاصل کرتا ہے اسی کو راحت زیادہ نصیب ہوتی ہے اور جو زیادہ کے چکر میں پڑ جاتا ہے اس کے مہلکات بھی زیادہ ہو جاتے ہیں اور یہ بہت جلد اس سے الگ ہو جاتی ہے۔کتنے اس پر اعتبار کرنے والے ہیں جنہیں اچانک مصیبتوں میں ڈال دیا گیا اور کتنے اس پر اطمینان کرنے والے ہیں جنہیں ہلاک کر دیا گیا اور کتنے صاحبان حیثیت تھے جنہیں ذلیل بنا دیا گیا اور کتنے اکڑنے والے تھے جنہیں حقارت کے ساتھ پلٹا دیا گیا۔اس کی بادشاہی پلٹا کھانے والی۔اس کا عیش مکدر ۔اس کا شیریں شور۔اس کا میٹھا کڑوا۔اس کی غذا زہر آلود اور اس کے اسباب سب بوسیدہ ہیں۔اس کا زندہ معرض ہلاکت میں ہے اور اس کا صحت مند بیماریوں کی زد پر ہے۔اس کا ملک چھننے والا ہے اور اس کا صاحب عزت مغلوب ہونے والا ہے۔اس کا مالدار بد بختیوں کا شکار ہونے والا ہے اور اس کا ہمسایہ لُٹنے والا ہے۔کیا تم انھیں کے گھروں میں نہیں ہو جو تم سے پہلے طویل عمر، پائیدار آثار اور دور رس امیدوں والے تھے۔بے پناہ سامان مہیا کیا، بڑے بڑے لشکر تیار کئے اور جی بھر کر دنیا کی پرستش کی اور اسے ہر چیز پر مقدم رکھا لیکن اس کے بعد یوں روانہ ہو گئے کہ نہ منزل تک پہونچانے والا زادراہ ساتھ تھا اور نہ راستہ طے کرانے والی سواری۔کیا تم تک کوئی خبر پہونچی ہے کہ اس دنیا نے ان کو بچانے کے لئے کوئی فدیہ پیش کیا ہو یا ان کی کوئی مدد کی ہو یا ان کے ساتھ اچھا وقت گزارا ہو؟ بلکہ اُس نے تو ان پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے، آفتوں سے اُنھیں عاجز و درماندہ کر دیا اور لوٹ لوٹ

کر آنے والی زحمتوں سے انھیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور ناک کے بل اُنھیں خاک پر پچھاڑ دیا اور اپنے گھروں سے کچل ڈالا، اور ان کے خلاف زمانہ کے حوادث کا ہاتھ بٹایا۔ تم نے تو دیکھا ہے کہ جو ذرا دُنیا کی طرف جھکا اور اسے اختیار کیا اور اس سے لپٹا، تو اس نے (اپنے تیور بدل کر ان سے کیسی) اجنبیت اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہو کر چل دیئے، اور اس نے انھیں بھوک کے سوا کچھ زادِ راہ نہ دیا، اور ایک تنگ جگہ کے سوا کوئی ٹھہرنے کا سامان نہ کیا، اور سوا گھُپ اندھیرے کے کوئی روشنی نہ دی اور ندامت کے سوا کوئی نتیجہ نہ دیا، تو کیا تم اسی دنیا کو ترجیح دیتے ہو، یا اسی پر مطمئن ہو گئے ہو یا اسی پر مرے جا رہے ہو؟ جو دنیا پر بے اعتماد نہ رہے اور اس میں بے خوف و خطر ہو کر رہے اس کے لئے یہ بہت برا گھر ہے۔ جان لو اور حقیقت میں تم جانتے ہی ہو، کہ (ایک نہ ایک دِن) تمھیں دنیا کو چھوڑنا ہے، اور یہاں سے کوچ کرنا ہے ان لوگوں سے عبرت حاصل کرو جو کہا کرتے تھے کہ ''ہم سے زیادہ قوت و طاقت میں کون ہے۔'' انھیں لاد کر قبروں تک پہونچایا گیا مگر اس طرح نہیں کہ انھیں سوار سمجھا جائے انھیں قبروں میں اتار دیا گیا، مگر وہ مہمان نہیں کہلاتے پتھروں سے اُن کی قبریں چن دی گئیں، اور خاک کے کفن ان پر ڈال دیئے گئے اور گلی سڑی ہڈیوں کو ان کا ہمسایہ بنا دیا گیا ہے۔ وہ ایسے ہمسایہ ہیں جو پکارنے والے کو جواب نہیں دیتے ہیں اور نہ زیادتیوں کو روک سکتے ہیں اور نہ رونے دھونے والوں کی پروا کرتے ہیں۔ اگر بادل (جھوم کر) ان پر برسیں، تو خوش نہیں ہوتے اور قحط آئے تو ان پر مایوسی نہیں چھا جاتی۔ وہ ایک جگہ ہیں، مگر الگ الگ، وہ آپس میں ہمسایہ ہیں مگر دور دور، پاس پاس ہیں مگر میل ملاقات نہیں، قریب قریب ہیں مگر ایک دوسرے کے پاس نہیں پھٹکتے، وہ بردبار بنے ہوئے بے خبر پڑے ہیں، ان کے بغض و عناد ختم ہو گئے اور کینے مٹ گئے۔ نہ ان سے کسی ضرر کا اندیشہ ہے، نہ کسی تکلیف کے دور کرنے کی توقع ہے انھوں نے زمین کے اوپر کا حصہ اندر کے حصہ سے اور کشادگی اور وسعت تنگی سے، اور گھر بار پردیس سے اور روشنی اندھیرے سے بدل لی ہے اور جس طرح ننگے پیر اور ننگے بدن پیدا ہوئے تھے، ویسے ہی زمین میں (پیوند خاک) ہو گئے اور اس دنیا سے صرف عمل

لے کر ہمیشہ کی زندگی اور سدا رہنے والے گھر کی طرف کوچ کر گئے۔ جیسا کہ خداوند قدوس نے فرمایا ہے:

﴿کما بدأنا أول خلق نعیده وعداً علینا انّا کنا فاعلین﴾(۱)

''جس طرح نے ہم نے مخلوقات کو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا اسی طرح دوبارہ پیدا کریں گے۔ اس وعدہ کا پورا کرنا ہمارے ذمہ ہے اور ہم اسے ضرور پورا کر کے رہیں گے''

آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

﴿وأحذّركم الدنیا فانها منزل قُلعة، ولیست بدار نُجعة، قد تزیّنت بغرورها، وغرّت بزینتها، دارهانت علیٰ ربها، فخلط حلالها بحرامها، وخیرها بشرها، وحیاتها بموتها، وحلوها بمرّها، لم یصفّها الله تعالیٰ لاولیائه، ولم یَضنّ بها علیٰ أعدائه...﴾(۲)

''میں تمہیں اس دنیا سے ہوشیار کر رہا ہوں کہ یہ کوچ کی جگہ ہے۔ آب ودانہ کی منزل نہیں ہے۔ یہ اپنے دھوکے ہی سے آراستہ ہوگئی ہے اور اپنی آرائش ہی سے دھوکا دیتی ہے۔ اس کا گھر پروردگار کی نگاہ میں بالکل بے ارزش ہے اسی لئے اس نے اس کے حلال کے ساتھ حرام۔ خیر کے ساتھ شر، زندگی کے ساتھ موت اور شیریں کے ساتھ تلخ کو رکھ دیا ہے اور نہ اسے اپنے اولیاء کے لئے مخصوص کیا ہے اور نہ اپنے دشمنوں کو اس سے محروم رکھا ہے۔ اس کا خیر بہت کم ہے اور اس کا شر ہر وقت حاضر ہے۔ اس کا جمع کیا ہوا ختم ہوجانے والا ہے اور اس کا ملک چھن جانے والا ہے اور اس کے آباد کو ایک دن خراب ہوجانا ہے۔ بھلا اُس گھر میں کیا خوبی ہے جو کمزور عمارت کی طرح گر جائے اور اس عمر میں کیا بھلائی ہے جو زادراہ کی طرح ختم ہوجائے اور اس زندگی میں کیا حسن ہے جو چلتے پھرتے تمام ہوجائے۔

دیکھو اپنے مطلوبہ امور میں فرائض الٰہیہ کو بھی شامل کرلو اور اسی سے اس کے حق کے ادا

---

(۱) نہج البلاغہ خطبہ ۱۱۱، آیت ۱۰۴ از سورۂ انبیاء۔

(۲) نہج البلاغہ خطبہ ۱۱۳۔

کرنے کی توفیق کا مطالبہ کرو اپنے کانوں کو موت کی آواز سنا دو قبل اسکے کہ تمہیں بلا لیا جائے"

دنیا کے سلسلہ میں ہی فرماتے ہیں:

﴿...عباداللہ أوصیکم بالرفض لهذه الدنیا التارکة لکم وان لم تحبوا ترکها، والمبلیة لأجسامکم وان کنتم تحبون تجدیدها، فانّما مثلکم ومثلها کسَفرٍ سلکوا سبیلاً فکأنهم قد قطعوه...﴾(۱)

"بندگانِ خدا! میں تمھیں وصیت کرتا ہوں کہ اس دنیا کو چھوڑ دو جو تمہیں بہر حال چھوڑنے والی ہے چاہے تم اسکی جدائی کو پسند نہ کرو۔ وہ تمہارے جسم کو بہر حال بوسیدہ کر دے گی تم لاکھ اس کی تازگی کی خواہش کرو۔ تمہاری اور اسکی مثال ان مسافروں جیسی ہے جو کسی راستہ پر چلے اور گویا کہ منزل تک پہونچ گئے۔ کسی نشان راہ کا ارادہ کیا اور گویا کہ اسے حاصل کرلیا اور کتنا تھوڑا وقفہ ہوتا ہے اس گھوڑا دوڑانے والے کے لئے جو دوڑاتے ہی مقصد تک پہونچ جائے۔ اس شخص کی بقا ہی کیا ہے جس کا ایک دن مقرر ہو جس سے آگے نہ بڑھ سکے اور پھر موت تیز رفتاری سے اسے ہنکا کرلے جا رہی ہو یہاںتک کہ بادل ناخواستہ دنیا کو چھوڑ دے۔ خبردار دنیا کی عزت اور اسکی سربلندی میں مقابلہ نہ کرنا اور اسکی زینت ونعمت کو پسند نہ کرنا اور اسکی دشواری اور پریشانی سے رنجیدہ نہ ہونا کہ اسکی عزت وسربلندی ختم ہو جانے والی ہے اور اسکی زنیت ونعمت کو زوال آجانے والا ہے اور اسکی تنگی اور سختی بہرحال ختم ہوجانے والی ہے۔ یہاں ہر مدت کی ایک انتہا ہے اور ہر زندہ کے لئے فنا ہے۔ کیا تمہارے لئے گذشتہ لوگوں کے آثار میں سامان تنبیہ نہیں ہے؟ اور کیا آباء واجداد کی داستانوں میں بصیرت وعبرت نہیں ہے؟ اگر تمہارے پاس عقل ہے! کیا تم نے یہ نہیں دیکھا ہے کہ جانے والے پلٹ کر نہیں آتے ہیں اور بعد میں آنے والے رہ نہیں جاتے ہیں؟ کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ اہل دنیا

---

(۱) نہج البلاغہ خطبہ ۹۹۔

مختلف حالات میں صبح وشام کرتے ہیں ۔کوئی مردہ ہے جس پر گریہ ہو رہا ہے اور کوئی زندہ ہے تو اسے پرسہ دیا جارہا ہے ۔ایک بستر پر کوئی غفلت میں پڑا ہوا ہے تو زمانہ اس سے غافل نہیں اور اس طرح جانے والوں کے نقش قدم پر رہ جانے والے چلے جا رہے ہیں ۔آگاہ ہو جاؤ کہ ابھی موقع ہے اسے یاد کرو جو لذتوں کو فنا کر دینے والی ۔خواہشات کو مکدر کر دینے والی اور امیدوں کو قطع کر دینے والی ہے ایسے اوقات میں جب برے اعمال کا ارتکاب کر رہے ہو اور اللہ سے مدد مانگو تا کہ اس کے واجب حق کو ادا کر دو اور ان نعمتوں کا شکریہ ادا کر سکو جن کا شمار کرنا نا ممکن ہے"

یہ زندگانی دنیا کا پہلا رخ ہے چنانچہ دنیا کے اس چہرے کی نشاندہی کرنے کے لئے ہم نے روایات کو اسی لئے ذرا تفصیل سے ذکر کیا ہے کیونکہ اکثر لوگ دنیا کے باطن کو چھوڑ کر اسکے ظاہر پر ہی ٹھہر جاتے ہیں اور ان کی نظریں باطن تک نہیں پہونچ پاتیں ۔شاید ہمیں انہیں روایات میں ایسے اشارے مل جائیں جن کے سہارے ہم ظاہر دنیا سے نکل کر اسکے باطن تک پہونچ جائیں ۔

ب۔ دنیا کا ظاہری رخ (روپ)

دنیاوی زندگی کا ظاہری روپ بے حد پر فریب ہے کیونکہ جسکے پاس چشم بصیرت نہ ہو اسکو یہ زندگانی دنیا دھوکے میں مبتلا کر کے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور پھر اسے آرزووں ،خواہشات ،فریب اور لہو ولعب کے حوالے کر دیتی ہے ۔جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿وما الحیاۃ الدنیا الا لعب ولھو﴾(۱)

"اور یہ زندگانی دنیا صرف کھیل تماشہ ہے"

﴿ما ھذہ الحیاۃ الدنیا الا لھو ولعب﴾(۲)

---

(۱)سورۂ انعام آیت ۳۲۔

(۲)سورۂ عنکبوت آیت ۶۴۔

''اور یہ زندگانی دنیا ایک کھیل تماشے کے سوا اور کچھ نہیں ہے''

﴿انما الحیاۃ الدنیا لعب ولھو وزینۃ وتفاخر بینکم﴾(۱)

''یاد رکھو کہ زندگانی دنیا صرف ایک کھیل تماشہ، آرائش باہمی فخر ومباہات اور اموال واولاد کی کثرت کا مقابلہ ہے''

خداوند عالم نے دنیا کے جس رخ کو لہو ولعب قرار دیا ہے وہ اسکا ظاہری رخ ہے۔اور لہو ولعب سنجیدگی اور متانت کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔۔۔

البتہ انسان اسی وقت لہو ولعب میں گرفتار ہوتا ہے کہ جب وہ دنیا کے ظاہری روپ پر نظر رکھے اور سنجیدگی ومتانت سے دور رہے چنانچہ اگر وہ دنیا کے ظاہر کے بجائے اسکے باطن پر توجہ رکھے تو لہو ولعب (کھیل کود) سے بالکل دور ہوکر زاہد وپارسا بن جائیگا اور دنیا کے دوسرے معاملات میں الجھنے کے بجائے اسے صرف اپنے نفس کی فکر لاحق رہے گی۔کیونکہ دنیا''لُماظۃ''ہے۔

مولائے کائناتؑ فرماتے ہیں:

﴿ألا مَن یدع ھذہ اللُّماظۃ﴾(۲)

''کون ہے جو اس لماظہ کو چھوڑ دے''لماظہ منھ کے اندر بچی ہوئی غذا کو کہا جاتا ہے

حضرت علیؑ:

﴿أُحذِّرکم الدنیا فانھا حلوۃ خضرۃ، حُفّت بالشھوات﴾(۳)

''میں تمہیں دنیا سے ڈراتا ہوں کیونکہ یہ ایسی شیرین وسرسبز ہے جو شہوتوں سے گھری ہوئی ہے''

---

(۱)سورۂ حدید آیت ۲۰۔

(۲)بحار الانوار ج ۷۳ ص ۱۳۳۔

(۳)بحار الانوار ج ۷۳ ص ۹۶۔

دنیاوی زندگی کے ظاہر اور باطن کا موازنہ

قرآن کریم میں دنیاوی زندگی کے دونوں رخ (ظاہر و باطن) کا بہت ہی حسین موازنہ پیش کیا گیا ہے نمونہ کے طور پر چند آیات ملاحظہ فرمائیں:

۱۔﴿انّمامثل الحیاۃالدنیا کماءٍ أنزلناہ من السماء فاختلط بہ نبات الارض ممایأکل الناس والانعام حتیٰ اذا أخذت الارض زُخرفھا وازّینت وظنّ أھلھا أنّھم قادرون علیھا أتاھا أمرنا لیلاً أونھاراً فجعلناھا حصیداً کأن لم تغن بالامس کذٰلک نفصّل الآیات لقومٍ یتفکّرون﴾(۱)

"زندگانی دنیا کی مثال صرف اس بارش کی ہے جسے ہم نے آسمان سے نازل کیا پھر اس سے مل کر زمین سے نباتات برآمد ہوئیں جن کو انسان اور جانور کھاتے ہیں یہاں تک کہ جب زمین نے سبزہ زار سے اپنے کو آراستہ کرلیا اور مالکوں نے خیال کرنا شروع کردیا کہ اب ہم اس زمین کے صاحب اختیار ہیں تو اچانک ہمارا حکم رات یا دن کے وقت آگیا اور ہم نے اسے بالکل کٹا ہوا کھیت بنادیا گویا اس میں کل کچھ تھا ہی نہیں ہم اس طرح اپنی آیتوں کو مفصل طریقہ سے بیان کرتے ہیں اس قوم کے لئے جو صاحب فکر ونظر ہے"

اس آیۂ کریمہ میں زندگانی دنیا، اسکی زینت اور آرائشوں اور اسکی تباہی و بربادی اور اس میں اچانک رونما ہونے والی تبدیلیوں کی عکاسی موجود ہے۔

چنانچہ دنیا کو اس بارش کے پانی سے تشبیہ دی گئی ہے جو آسمان سے زمین پر برستا ہے اور اس سے زمین کے نباتات ملتے ہیں تو ان نباتات میں نمو پیدا ہوتا ہے اور وہ انسانوں اور حیوانوں کی غذا نیز زمین کی زینت بنتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب زمین اپنی آرائشوں اور زینتوں سے آراستہ

---

(۱) سورۂ یونس آیت ۲۴۔

ہو جاتی ہے۔۔۔۔تو اچانک یہ حکم الٰہی کسی بجلی، آندھی (ہوا) وغیرہ کی شکل میں اسکی طرف نازل ہو جاتا ہے اور اسے بالکل ویرانے اور خرابے میں تبدیل کر دیتا ہے جیسے کل تک وہ آباد، سرسبز و شاداب ہی نہ تھی یہ دنیا کے ظاہری اور باطنی دونوں چہروں کی بہترین عکاسی ہے کہ وہ اگر چہ سرسبز و شاداب، پُر فریب، برانگیختہ کرنے والی، پر کشش (جالب نظر) دلوں کے اندر خواہشات کو بھڑکانے والی ہے لیکن جب دل اس کی طرف سے مطمئن ہو جاتے ہیں تو اچانک حکم الٰہی نازل ہو جاتا ہے اور اسے کھنڈر اور بنجر بنا ڈالتا ہے جس سے لوگوں کو کراہیت محسوس ہوتی ہے۔

اس سورہ کا پہلا حصہ دنیا کے ظاہری چہرہ کی وضاحت کر رہا ہے جو انسان کو دھوکہ اور فریب میں مبتلا کر دیتا ہے جبکہ دوسرا حصہ وعظ و نصیحت اور عبرت حاصل کرنے کا سرچشمہ ہے۔ جو کہ دنیا کا باطنی رخ ہے۔

۲۔:﴿انّا جعلنا ما علیٰ الارض زینةً لها لنبلوهم أیّهم أحسن عملاً﴾(۱)

''بیشک ہم نے روئے زمین کی ہر چیز کو زینت قرار دیدیا ہے تا کہ ان لوگوں کا امتحان لیں کہ ان میں عمل کے اعتبار سے سب سے بہتر کون ہے''

دنیا یقیناً ایک زینت ہے جس میں کسی قسم کے شک و شبہہ کی گنجائش نہیں ہے اور یہی زینت و آرائش انسانی خواہشات کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے مگر ان آرائشوں کی کوکھ میں مختلف قسم کے امتحانات بلائیں اور آزمائشیں پوشیدہ رہتی ہیں جن کے اندر انسان کی تنزلی کے خطرات چھپے رہتے ہیں اور یہ بالکل اسی طرح ہیں جیسے کسی شکار کو پکڑنے کے لئے چارا ڈالا جاتا ہے۔

۳۔﴿اعلموا أنما الحیاة الدنیا لعب ولهو وزینة وتفاخر بینکم وتکاثر فی الاموال والاولاد کمثل غیث أعجب الکفار نباته ثم یهیج فتراه

---

(۱) سورۂ کہف آیت ۷۔

مصفرّا ثم یکون حطاماً وفی الآخرۃ عذاب شدید ومغفرۃ من اللہ ورضوان وما الحیاۃ الدنیا الا متاع الغرور﴾(۱)

''یاد رکھو کہ زندگانی دنیا صرف ایک کھیل تماشہ، آرائش، باہمی فخر و مباہات، اور اموال واولاد کی کثرت کا مقابلہ ہے اور بس۔ جیسے کوئی بارش ہو جسکی قوت نامیہ کسان کو خوش کردے اور اسکے بعد وہ کھیتی خشک ہو جائے پھر تم اسے زرد دیکھو اور آخر میں وہ ریزہ ریزہ ہو جائے اور آخرت میں شدید عذاب بھی ہے اور مغفرت اور رضائے الٰہی بھی ہے اور زندگانی دنیا تو بس ایک دھوکہ کا سرمایہ ہے اور کچھ نہیں ہے''

دنیا کے بارے میں نگاہوں کے مختلف زاویے

درحقیقت دنیا کو متعدد زاویوں سے دیکھنے کی وجہ سے ہی دنیا کے مختلف رخ دکھائی دیتے ہیں اسی لئے زاویہ نگاہ تبدیل ہوتے ہی دنیا کا رخ بھی تبدیل ہو جاتا ہے ورنہ دنیا تو ایک ہی حقیقت کا نام ہے مگر لوگ اسکی طرف دو رخ سے نظر کرتے ہیں۔

کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو دنیا کو پر غرور اور پر فریب نگاہوں سے دیکھتے ہیں جبکہ بعض حضرات اسے عبرت کی نگاہوں سے دیکھا کرتے ہیں ان دونوں نگاہوں کے زاویوں میں ایک انداز نگاہ سطحی ہے جو دنیا کی ظاہری سطح پر برقرار رہتا ہے اور انسان کو شہوت وغرور (فریب) میں مبتلا کر دیتا ہے جبکہ دوسرا انداز نظر اتنا گہرا ہے کہ وہ دنیا کے باطن کو بھی دیکھ لیتا ہے لہٰذا یہ انداز نظر رکھنے والے حضرات اس دنیا سے دوری اور زہد اختیار کرتے ہیں مختصر یہ کہ اس مسئلہ کا دارومدار دنیا کے بارے میں ہمارے زاویہ نگاہ اور انداز فکر پر منحصر ہے۔ لہٰذا دنیا کے معاملات کو صحیح کرنے کے لئے سب سے پہلے اسکے بارے میں انسان کا انداز فکر صحیح ہونا چاہیئے جس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے وہ دنیا کے بارے میں اپنا زاویہ

---

(۱)سورۂ حدید آیت ۲۰۔

نگاہ صحیح کرے اسکے بعد وہ اسکو جس نگاہ سے دیکھے گا اسی اعتبار سے اسکے ساتھ پیش آئے گا۔

لہٰذا جو حضرات دنیا کو پر فریب نگاہوں سے دیکھتے ہیں انہیں دنیا دھوکہ میں ڈال دیتی ہے اور خواہشات میں مبتلا کر دیتی ہے اور ان کے لئے یہ زندگانی ایک کھیل تماشہ بن کر رہ جاتی ہے جسکی طرف قرآن مجید نے متوجہ کیا ہے۔اور جو لوگ دنیا کو عبرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو وہ اپنے اعمال میں صداقت اور سنجیدگی کا خیال رکھتے ہیں اور آخرت کا واقعی احساس انہیں دنیا کے کھیل تماشہ سے دور کر دیتا ہے۔

مولائے کائنات کے کلمات میں دنیا کے بارے میں موجود مختلف نگاہوں کی طرف واضح اشارے موجود ہیں جن میں سے ہم یہاں بعض کا تذکرہ کر رہے ہیں:

﴿کان لی فیما مضیٰ أخ فی اللّٰہ،وکان یعظمه فی عینی صغر الدنیا فی عینه﴾(۱)

''گذشتہ زمانہ میں میرا ایک بھائی تھا جس کی عظمت میری نگاہوں میں اس لئے تھی کہ دنیا اسکی نگاہ میں حقیر تھی''

دنیا کی توصیف میں آپ فرماتے ہیں:

﴿ما أصف من دار أوّلها عناء،وآخرها فناء، فی حلالها حساب،وفی حرامها عقاب،من استغنیٰ فیها فُتن،ومن افتقر فیها حزن﴾(۲)

''میں اس دنیا کے بارے میں کیا کہوں جسکی ابتدا رنج و غم اور انتہا فنا و نیستی ہے اسکے حلال میں حساب اور حرام میں عقاب ہے۔جو اس میں غنی ہو جاتا ہے وہ آزمائشوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور جو فقیر ہو جاتا ہے وہ رنجیدہ و افسردہ ہو جاتا ہے''

---

(۱) نہج البلاغہ حکمت ۲۸۹۔

(۲) نہج البلاغہ خطبہ ۸۲۔

یہی رخ دنیا کا باطنی رخ اور وہ وقت نظر ہے جو دنیا کے باطن میں جھانک کر دیکھ لیتی ہے۔

پھر آپ فرماتے ہیں:

﴿من ساعاھا فاتته، ومن قعد عنھا واتته﴾(۱)

''جو اسکی طرف دوڑ لگاتا ہے اسکے ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور جو منھ پھیر کر بیٹھ رہے اسکے پاس حاضر ہوجاتی ہے''

دنیا سے انسانی لگاؤ کے بارے میں خداوند عالم کی یہ ایک سنت ہے جس میں کبھی بھی خلل یا تغیر پیدا نہیں ہوسکتا ہے چنانچہ جو شخص دنیا کی طرف دوڑ لگائے گا اور اسکے لئے سعی کریگا اور اسکی قربت اختیار کریگا تو وہ اسے تھکا ڈالے گی۔ اور اسکی طمع کی وجہ سے اسکی نگاہیں مسلسل اسکی طرف اٹھتی رہیں گی۔ چنانچہ اسے جب بھی کوئی رزق نصیب ہوگا تو اسے اس سے آگے کی فکر لاحق ہوجائیگی۔ اور وہ اسکے لئے کوشش شروع کردیگا مختصر یہ کہ وہ دنیا کا ساتھی ہے اور اسکے پیچھے دوڑ لگا تا رہے گا مگر اسے دنیا میں اسکا مقصد ملنے والا نہیں ہے۔

البتہ جو دنیا کی تلاش اور طلب میں صبر و حوصلہ سے کام لیکر میانہ روی اختیار کریگا تو دنیا خود اسکے قدموں میں آکر اسکی اطاعت کرے گی اور وہ بآسانی اپنی آرزو تک پہونچ جائے گا۔

پھر آپ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿من أبصر بھا بصّرته، ومن أبصر الیھا أعمته﴾(۲)

''جو اسکو ذریعہ بنا کر آگے دیکھتا ہے اسے بینا بنا دیتی ہے اور جو اسکو منظور نظر بنالیتا ہے اسے اندھا کردیتی ہے''

---

(۱) نہج البلاغہ خطبہ ۸۲۔

(۲) گذشتہ حوالہ۔

سید رضی علیہ الرحمہ نے اس حدیث کی یہ تشریح فرمائی ہے: کہ اگر کوئی شخص حضرت کے اس ارشاد گرامی ﴿من ابصر بها بصرته﴾ میں غور وفکر کرے تو عجیب وغریب معانی اور دور رس حقائق کا ادراک کرلے گا جن کی بلندیوں اور گہرائیوں کا ادراک ممکن نہیں ہے۔

مولائے کائنات ؑ نے دنیا کے بارے میں نگاہ کے ان دونوں زاویوں کا تذکرہ فرمایا ہے جس میں سے ایک یہ ہے ''کہ دنیا کو ذریعہ بنا کر آگے دیکھا جائے'' اس نگاہ میں عبرت پائی جاتی ہے اور دوسرا زاویہ نظر یہ ہے کہ انسان دنیا کو اپنا منظور نظر اور اصل مقصد بنالے اس نگاہ کا نتیجہ دھوکہ اور فریب ہے جسکی وضاحت کچھ اس طرح ہے:

یہ دنیا کبھی انسان کے لئے ایک ایسا آئینہ بن جاتی ہے جس میں وہ مختلف تصویریں دیکھتا ہے اور کبھی اسکی نظر خود اسی دنیا پر لگی رہتی ہے۔

چنانچہ جب دنیا انسان کے لئے ایک آئینہ کی مانند ہوتی ہے جس میں جاہلیت کے تمدن اور زمین پر فساد برپا کرنے والے ان متکبرین کا چہرہ بخوبی دیکھ لیتا ہے جن کو خدا نے اپنے عذاب کا مزہ اچھی طرح چکھا دیا۔۔۔ تو یہ نگاہ، عبرت ونصیحت کی نگاہ بن جاتی ہے۔

لیکن جب دنیا انسان کے لئے کل مقصد حیات کی شکل اختیار کرلے اور وہ ہمیشہ اسی نگاہ سے اسے دیکھتا رہے تو دنیا اسے ہوی وہوس اور فتنوں میں مبتلا کر کے اندھا کر دیتی ہے اور وہ اسے بہت ہی سرسبز وشیرین دکھائی دیتی ہے۔

اس طرح پہلی نگاہ میں عبرت کا مادہ پایا جاتا ہے اور دوسری نظر میں فتنہ وفریب کا مادہ ہوتا ہے۔ پہلی نگاہ میں فقط بصیرت پائی جاتی ہے جبکہ دوسری نگاہ میں عیاری اور دھوکہ ہے۔

انہیں جملوں کی شرح کے بارے میں ابن الحدید کا بیان ہے کہ جب میں نے حضرت کے یہ جملات پڑھے تو اسکی تشریح میں یہ دو اشعار کہے:

دنیاك مثل الشمس تدني ال   يك الضوء لكن دعوة المهلكِ

ان أنت أبصرت الیٰ نورها تَعْشُ و ان تُبصر به تدرك

تمہاری دنیا کی مثال اس سورج جیسی ہے جس کی ضیاء تمہارے سامنے ہے لیکن ایک مہلک انداز میں کہ اگر تم اس (نور) کی طرف دیکھو گے تو تمہاری نگاہ میں خیرگی پیدا ہو جائیگی اور اگر اسکے ذریعہ کسی چیز کو دیکھنا چاہو گے تو اسے دیکھ لوگے۔

اسی زاویہ نگاہ کی بنیاد پر مولائے کائناتؑ نے یہ ارشاد فرمایا ہے:

﴿...جعل لکم أسماعاً لتعي ماعناها،أبصاراً لتجلوعن عشاها...وكأن الرشد في احرازدنيا ها...﴾(۱)

''اس نے تمہیں کان عطا کئے ہیں تاکہ ضروری باتوں کو سنیں اور آنکھیں دی ہیں تاکہ بے بصری میں روشنی عطا کریں۔۔۔اور تمہارے لئے ماضی میں گذر جانے والوں کے آثار میں عبرتیں فراہم کردی ہیں۔۔۔لیکن موت نے انہیں امیدوں کی تکمیل سے پہلے ہی گرفتار کرلیا۔۔۔انہوں نے بدن کی سلامتی کے وقت کوئی تیاری نہیں کی تھی اور ابتدائی اوقات میں کوئی عبرت حاصل نہیں کی تھی ۔۔۔تو کیا آجتک کبھی اقرباء نے موت کو دفع کیا ہے یا فریاد کسی کے کام آئی ہے (ہرگز نہیں) مرنے والے کو قبرستان میں گرفتار کردیا گیا ہے اور تنگی قبر میں تنہا چھوڑ دیا گیا ہے اس عالم میں کہ کیڑے مکوڑے اسکی جلد کو پارہ پارہ کررہے ہیں۔۔۔اور آندھیوں نے اسکے آثار کو مٹادیا ہے اور روزگار کے حادثات نے نشانات کو محو کردیا ہے۔۔۔تو کیا تم لوگ انہیں آباء واجداد کی اولاد نہیں ہو اور کیا انہیں کے بھائی بندے نہیں ہو کہ پھر انہیں کے نقش قدم پر چلے جارہے ہو اور انہیں کے طریقے کو اپنائے ہوئے ہو اور انہیں کے راستے پر گامزن ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ دل اپنا حصہ حاصل کرنے میں سخت ہوگئے ہیں اور راہ ہدایت سے غافل ہوگئے ہیں غلط میدانوں میں قدم جمائے ہوئے ہیں ایسا معلوم

---

(۱) نہج البلاغہ خطبہ ۸۳۔

ہوتا ہے کہ اللہ کا مخاطب ان کے علاوہ کوئی اور ہے اور شاید ساری عقلمندی دنیا ہی کے جمع کر لینے میں ہے"

اس بارے میں آپ نے یہ بھی فرمایا ہے:

﴿وانما الدنیا منتھیٰ بصر الاعمیٰ، لا یبصر مماوراء ھا شیئاً، والبصیر ینفذھا بصرہ، ویعلم أن الدار ورائھا، فالبصیر منھا شاخص، والأعمیٰ الیھا شاخص، والبصیر منھا متزود، والأعمیٰ لھامتزود﴾(۱)

"یہ دنیا اندھے کی بصارت کی آخری منزل ہے جو اسکے ماوراء کچھ نہیں دیکھتا ہے جبکہ صاحب بصیرت اس سے کوچ کرنے والا ہے اور اندھا اسکی طرف کوچ کرنے والا ہے بصیر اس سے زادِراہ فراہم کرنے والا ہے اور اندھا اسکے لئے زادِراہ اکٹھا کرنے والا ہے"

واقعاً اندھا وہی ہے جس کی نگاہیں دنیا سے آگے نہ دیکھ سکیں اور وہ اس سے وابستہ ہوکر رہ جائے (اس طرح دنیا اندھے کی نگاہ کی آخری منزل ہے) لیکن صاحب بصیرت وہ ہے جسکی نگاہیں ماوراء دنیا کا نظارہ کر لیتی ہیں اور اس کی عاقبت کو دیکھ لیتی ہیں آخرت اسکی نظروں کے سامنے ہے لہٰذا (اسکی نگاہیں) اور اسکے قدم اس دنیا پر نہیں ٹھہرتے بلکہ وہ اس سے عبرت حاصل کرکے آگے کی طرف کوچ کر جاتا ہے۔

ابن ابی الحدید نے اس جملہ کی مذکورہ شرح کے علاوہ ایک اور حسین تشریح کی ہے جس کے الفاظ کچھ یوں ہیں۔ دنیا اور مابعد دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے اندھا کسی خیالی تاریکی کا تصور کرتا ہے اور یہ تصور کرتا ہے کہ وہ اس تاریکی کو محسوس کر رہا ہے جبکہ وہ واقعاً اسکا احساس نہیں کر پاتا بلکہ وہ عدم ضیاء ہے (وہاں نور کا وجود نہیں ہے) بالکل اس طرح جیسے کوئی شخص کسی تنگ و تاریک گڑھے میں گھس

---

(۱) نہج البلاغہ خطبہ ۱۳۳۔

جائے اور تاریکی کا خیال کرے مگر اسے کچھ نہ دکھائی دے اور اسکی نگاہیں کسی چیز کا مشاہدہ کرتے وقت کام نہیں کر پاتیں مگر وہ یہ خیال کرتا ہے کہ وہ تاریکی وظلمت کو دیکھ رہا ہے۔لیکن جو شخص روشنی میں کسی چیز کو دیکھتا ہے اسکی بصارت (نگاہ) کام کرتی ہے اور وہ واقعاً محسوسات کو دیکھتا ہے۔ چنانچہ دنیا اور آخرت کی بھی بالکل یہی حالت ہے: کیونکہ اہل دنیا کی نگاہوں کی آخری منزل اور ان کی پہنچ صرف ان کی دنیا تک ہے۔اور ان کا خیال یہ ہے کہ وہ کچھ دیکھ رہے ہیں جبکہ واقعاً انہیں کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا ہے اور نہ ان کے حواس کسی چیز کے اوپر کام کرتے ہیں۔لیکن اہل آخرت کی نگاہیں بہت کارگر ہیں اور انہوں نے آخرت کو باقاعدہ دیکھ لیا ہے لہٰذا دنیا پر ان کی نگاہیں نہیں ٹھہرتی ہیں ،تو درحقیقت یہی حضرات صاحبان بصارت ہیں''(۱)

طرز نگاہ کا صحیح طریقہ کار

جس طرح انسان کے تمام اعمال وحرکات میں کچھ صحیح ہوتے ہیں اور کچھ غلط۔اسی طرح کسی چیز کے بارے میں اسکا طرز نگاہ بھی صحیح یا غلط ہوسکتا ہے۔جیسا کہ قرآن کریم نے رفتار وکردار کے صحیح طریقوں کی تعلیم دیتے ہوئے صحیح طرز نگاہ کی تعلیم ان الفاظ میں دی ہے:

﴿ولا تمدّنّ عينيك الیٰ ما متّعنا به أزواجاً منهم زهرة الحياة الدنيا لنفتنهم فيه ورزق ربك خير وأبقیٰ﴾(۲)

''اور خبردار ہم نے ان میں سے بعض لوگوں کو جو زندگانی دنیا کی رونق سے مالا مال کردیا ہے اسکی طرف آپ نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں کہ یہ ان کی آزمائش کا ذریعہ ہے اور آپ کے پروردگار کا رزق اس سے کہیں زیادہ بہتر اور پائیدار ہے''

---

(۱)شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج۸ص ۲۷۶۔

(۲)سورۂ طٰہ آیت ۱۳۱۔

نظر اٹھا کر دیکھنا بھی کسی چیز کو دیکھنے کا ایک طریقہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی نگاہ اس مال و دولت اور رزق کے اوپر پڑتی رہے جو خداوند عالم نے دوسروں کو عنایت فرمائی ہے اس مدنظر (نگاہیں اٹھا کر دیکھنے) میں اپنی حد سے تجاوز کرنے کے معنی پائے جاتے ہیں۔ گویا انسان کی نگاہیں اپنے پاس موجود خداوند عالم کی عطا کردہ نعمتوں سے تجاوز کر کے دوسروں کے دنیاوی راحت و آرام اور نعمتوں کی سمت اٹھتی رہیں اور مسلسل انہیں پر جمی رہیں۔

حد سے یہ تجاوز ہی انسانی مشکلات اور عذاب کا سرچشمہ ہے۔۔۔ کیونکہ جب تک خداوند عالم اسے مال نہ دیگا اسے مسلسل اسکی تمنا رہے گی اور وہ اسکے لئے کوشش کرتا رہے گا۔ اور جب خداوند عالم اسے اس نعمت سے نواز دیگا تو پھر وہ ان دوسری نعمتوں کی خواہش اور تمنا شروع کر دیگا جو دوسروں کے پاس ہیں اور اسکے پاس نہیں ہیں۔۔۔ اور اس طرح دنیا سے اسکی وابستگی اور اسکے لئے سعی و کوشش میں دوام پیدا ہو جاتا ہے۔ (جیسا کہ مولائے کائناتؑ نے ارشاد فرمایا ہے) نیز اسکے پیچھے دوڑنے سے عذاب مزید طولانی ہو جاتا ہے اور وہ اپنے آخری مقصد تک نہیں پہونچ پاتا ہے، دنیا کے بارے میں اس طرز نگاہ سے انسان کو یاس و حسرت کے علاوہ اور کچھ ہاتھ آنے والا نہیں ہے۔

واضح رہے کہ لوگوں کے پاس موجود نعمتوں پر نگاہیں نہ جمانے اور ان کی طرف توجہ نہ کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ انسان سعی و کوشش اور محنت و مشقت کرنا ہی چھوڑ دے کیونکہ ایک مسلمان ہمیشہ متحرک رہتا ہے۔ مگر لوگوں کے پاس موجود نعمتوں کو دیکھ کر حسرت اور غصہ کے گھونٹ پینے کی وجہ سے نہیں۔

مختصر یہ کہ: کسی بھی چیز کے بارے میں انسان کی طرز نگاہ اسکے نفس کی سلامتی یا بربادی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ کیونکہ کبھی کبھی ایک نظر انسان کی روح کو آلودہ اور گندہ بنا دیتی ہے اور اسے ایک طولانی مصیبت اور عذاب میں مبتلا کر دیتی ہے۔ جیسا کہ روایت میں ہے:

﴿رُبَّ نظرة تورث حسرة﴾(۱)

''کتنی نگاہوں سے حسرت ہی ہاتھ آتی ہے''

جبکہ کبھی کبھی یہی نگاہ انسان کی استقامت اور استحکام عمل کا سرچشمہ قرار پاتی ہے بیشک اسلام ہمیں ''نگاہ ونظر'' سے منع نہیں کرتا ہے بلکہ ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ کسی بھی چیز کے بارے میں ہمارا زاویہ نگاہ کیا ہونا چاہئے!

نفس کے اوپر طرز نگاہ کے اثرات اور نقوش

محبت یا زہد دنیا

انسان اپنی زندگی میں کسی چیز کے بارے میں چاہے جو طرز نگاہ اپنا لے اسکے کچھ نہ کچھ مثبت یا منفی (اچھے یا برے) اثرات ضرور پیدا ہوتے ہیں اور انسان اسی زاویۂ دید کے مطابق اسکی طرف قدم اٹھاتا ہے اس طرح انسان دنیا کے بارے میں چاہے جو زاویہ نگاہ رکھتا ہو یا اسے جس زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہو اسکے فکر وخیال اور رفتار وکردار حتی اسکے نفس کے اوپر اسکے واضح آثار ونتائج اور نقوش نظر آئیں گے جن میں اس وقت تک کسی قسم کا تغیر یا تبدیلی ممکن نہیں ہے جب تک انسان اپنا انداز فکر تبدیل نہ کرلے۔

اس حقیقت کی بیحد اہمیت ہے اور یہ اسلامی نظام تربیت کی ریڑھ کی ہڈی کا ایک حصہ ہے اسی بنیاد پر ہم دنیا کے بارے میں سطحی طرز نگاہ۔ (جو دنیا سے آگے نہیں دیکھتی) اور جسے مولائے کائناتؑ نے۔﴿الابصار الی الدنیا﴾ دنیا کو منظور نظر بنا کر دیکھنے سے تعبیر کیا ہے۔۔۔اور دنیا کے بارے میں عمیق طرز نگاہ جسے امیر المومنینؑ نے ﴿ابصار بالدنیا﴾ دنیا کو ذریعہ بنا کر دیکھنے سے تعبیر کیا ہے ان دونوں کے نفسیاتی اور عملی اثرات کا جائزہ پیش کریں گے البتہ ان دونوں نگاہوں کا

---

(۱) وسائل الشیعہ ج۱۴ص۱۳۸۔فروع کافی ج۵ص۵۵۹۔میزان الحکمت ج۱۰۔

سب سے بڑا اثر حب دنیا یا زہد دنیا ہے۔۔۔ کیونکہ حب دنیا دراصل دنیا کے بارے میں سطحی طرز نگاہ کا فطری نتیجہ ہے اور زہد دنیا اسکے بارے میں عمیق طرز نگاہ کا فطری نتیجہ ہے۔

لہٰذا اس مقام پر ہم انسانی زندگی کی ان دونوں حالتوں پر روشنی ڈال رہے ہیں۔

حب دنیا

جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے کہ حب دنیا دراصل دنیا کے بارے میں سطحی انداز فکر کا نتیجہ ہے اور اس انداز نگاہ میں ماورائے دنیا کو دیکھنے کی طاقت نہیں پائی جاتی ہے لہٰذا یہ دنیا کی رنگینیوں اور آسائشوں تک محدود رہتی ہے اور اسی کی طرف متوجہ کرتی رہتی ہے۔ جبکہ زہد و پارسائی، دنیا کے بارے میں باریک بینی اور دقت نظر کا نتیجہ ہے۔

حب دنیا ہر برائی کا سرچشمہ

انسانی زندگی میں حب دنیا ہی ہر برائی اور شر و فساد کا سرچشمہ ہے چنانچہ حیات انسانی میں کوئی برائی اور مشکل ایسی نہیں ہے جسکی کل بنیاد یا اسکی کچھ نہ کچھ وجہ حب دنیا نہ ہو!

رسول اکرم ﷺ:

﴿حبّ الدنیا أصل کل معصیة، وأول کل ذنب﴾(۱)

''دنیا کی محبت ہر معصیت کی بنیاد اور ہر گناہ کی ابتدا ہے''

حضرت علیؑ کا فرمان ہے:

﴿حبّ الدنیا رأس الفتن وأصل المحن﴾(۲)

---

(۱) میزان الحکمت ج۳ ص۲۹۴۔

(۲) غرر الحکم ج۱ ص۳۴۲۔

"محبت دنیا فتنوں کا سر اور زحمتوں کی اصل بنیاد ہے"

امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے:

﴿رأس كل خطيئة حبّ الدنيا﴾(۱)

"ہر برائی کی ابتدا (سرچشمہ) دنیا کی محبت ہے"

حب دنیا کا نتیجہ کفر؟

حب دنیا کا سب سے خطرناک نتیجہ کفر ہے جیسا کہ قرآن مجید میں محبت دنیا اور کفر کے درمیان موجود رابطہ اور حب دنیا کے خطرناک نتائج کا تذکرہ بار بار کیا گیا ہے۔

۱۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے:

﴿ولكن من شرح بالكفر صدراً فعليهم غضب من الله ولهم عذاب عظيم ذلک بأنهم استحبوا الحياة الدنيا علىٰ الآخرة وأن الله لا يهدى القوم الكافرين﴾(۲)

"لیکن جو شخص کفر کے لئے سینہ کشادہ رکھتا ہو ان کے اوپر خدا کا غضب ہے اور اسکے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔ یہ اس لئے کہ ان لوگوں نے زندگانی دنیا کو آخرت پر مقدم کیا اور اللہ ظالم قوموں کو ہرگز ہدایت نہیں دیتا ہے"

اس آیہ کریمہ میں صرف کفر ہی کو حب دنیا کا اثر نہیں قرار دیا گیا ہے بلکہ آیہ کریمہ نے اس سے کہیں آگے اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ حب دنیا سے کفر کیلئے سینہ کشادہ ہو جاتا ہے اور انسان اپنے کفر پر اطمینان خاطر پیدا کر لیتا ہے اور اسکے لئے کھلے دل (سعہ صدر) کا مظاہرہ کرتا ہے اور یہ صورتحال کفر سے بھی بدتر ہے ایسے لوگوں پر خداوند عالم غضبناک ہوتا ہے اور انھیں اپنی رحمت سے دور کر دیتا ہے۔

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۳ ص ۷۔

(۲) سورۂ نحل آیت ۱۰۶۔۱۰۷۔

۲۔ارشادالٰہی ہے:

﴿وویل للکافرین من عذاب شدید☆الذین یستحبون الحیاة الدنیا علیٰ الآخرة ویصدون عن سبیل اللہ ویبغونها عوجاً﴾(۱)

''اور کافروں کے لئے تو سخت ترین اور افسوسناک عذاب ہے وہ لوگ جو زندگانی دنیا کو آخرت کے مقابلے میں پسند کرتے ہیں اور لوگوں کو راہ خدا سے روکتے ہیں اور اس میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہیں''

اس آیہ کریمہ میں حب دنیا اور کفر یا راہ خدا سے روکنے کے درمیان موجود رابطہ کا بخوبی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

حب دنیا کے نفسیاتی اور عملی آثار

حب دنیا سے انسان کے کردار و عمل پر بے شمار اثرات پڑتے ہیں جن میں سے ہم بعض آثار کی وضاحت پیش کررہے ہیں۔

ا۔طولانی آرزو

اسمیں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ لمبی آرزوئیں بھی حب دنیا کا ایک اثر ہیں۔ کیونکہ جب انسان دنیا کا دلدادہ ہوجاتا ہے اور اس سے وابستہ ہوکر رہ جاتا ہے تو اسکی آرزوئیں بھی بہت طولانی ہوجاتی ہیں یہ ہے تصویر کا پہلا رخ۔

تصویر کا دوسرا رخ! یہ ہے کہ جسکی آرزوئیں زیادہ ہوجاتی ہیں وہ موت کو بہت کم یاد رکھتا ہے اور آخرت کیلئے اسکی تیاری اور اسکا عمل کم ہوجاتا ہے جسکی طرف روایات میں باقاعدہ متوجہ کیا گیا ہے حضرت علیؑ کے مندرجہ ذیل ارشادات ملاحظہ فرمائیں:

---

(۱)ابراہیم آیت ۲۔۳۔

﴿ما أطال عبدٌ الأمل، الا أساء العمل﴾(۱)

''کسی شخص نے اپنی آرزوئیں طولانی نہیں کیں مگر یہ کہ اس نے اپنا عمل خراب کرلیا''

آپ ہی سے یہ بھی مروی ہے:

﴿أکثر الناس أملاً، أقلّهم للموت ذکراً﴾(۲)

''لمبی آرزو رکھنے والے لوگ موت کو سب سے کم یاد کرتے ہیں''

آپ نے یہ بھی فرمایا ہے:

﴿أطول الناس أملاً، أسوؤهم عملاً﴾(۳)

''جسکی آرزوئیں سب سے زیادہ ہوتی ہیں اسکا عمل سب سے بدتر ہوتا ہے''

تیسرا رخ یہ ہے! کہ جسکی آرزوئیں لمبی ہوتی ہیں وہ انہیں کو اپنے لئے سکون واطمینان کا سبب سمجھ لیتا ہے جبکہ اس دنیا کو خود ہی قرار نہیں ہے۔ مگر وہ اس سے وابستہ ہو کر اسی سے مطمئن ہو جاتا ہے۔ جسکی تفصیل آپ مندرجہ ذیل سطروں میں ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔

۲۔ دنیا پر اعتماد اور اطمینان

جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے کہ دنیا کے بارے میں لمبی لمبی آرزوئیں اسکی محبت اور اس سے خوش وخرم رہنے سے دنیا پر اطمینان واعتماد پیدا ہوتا ہے جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے:

﴿ان الذین لا یرجون لقاء نا ورضوا بالحیاة الدنیا واطمأنوا بھا والذین ھم عن آیاتنا غافلون ☆ أولئك مأواھم النار بما کانوا یکسبون﴾(۴)

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۳ ص ۱۶۶۔

(۲) غرر الحکم ج ۱ ص ۱۹۰۔

(۳) گذشتہ حوالہ۔

(۴) سورۂ یونس آیت ۷۔۸۔

"یقیناً جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے ہیں اور زندگانی دنیا پر راضی اور مطمئن ہو گئے ہیں اور جو لوگ ہماری آیات سے غافل ہیں یہ سب وہ ہیں جنکے اعمال کی بناء پر انکا ٹھکانا جہنم ہے"

دنیا کے اوپر اس جھوٹے بھروسہ کی وجہ سے انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہمیشہ اسی دار دنیا میں رہنا ہے جبکہ یہ باقی رہنے والی نہیں ہے بلکہ یہ تو وہ پونجی ہے جو بہت جلد فنا کے گھاٹ اتر جائیگی۔ در حقیقت دار قرار و بقاء تو جنت ہے۔ جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے:

﴿وفرحوا بالحیاة الدنیا وما الحیاة الدنیا فی الآخرة الامتاع﴾ (۱)

"یہ لوگ صرف زندگانی دنیا پر خوش ہو گئے ہیں حالانکہ آخرت کے مقابلہ میں زندگانی دنیا صرف ایک وقتی لذت کا درجہ رکھتی ہے۔"

یا دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

﴿یاقوم انما هذه الحیاة الدنیا متاع وان الآخرة هی دار القرار﴾ (۲)

"قوم والو! یاد رکھو کہ یہ حیات دنیا صرف چند روزہ لذت ہے اور ہمیشہ رہنے کا گھر صرف آخرت کا گھر ہے"

مختصر یہ کہ دنیا ختم ہو جانے والی پونجی ہے مگر آخرت ہمیشہ باقی رہنے والا سرمایہ ہے جبکہ اسکے برخلاف جو لوگ دنیا پر بھروسہ کئے بیٹھے ہیں اور اس کی محبت ان کے دلوں میں بسی ہوئی ہے اور وہ اسی پر خوش ہیں وہ در حقیقت دنیا کی ابدیت اور بقاء کی خام خیالی کے دھوکہ میں مبتلا ہیں۔

حضرت علیؑ سے اس حدیث قدسی کی روایت کی گئی ہے کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿عجبت لمن یری الدنیا وتصرّف أهلها حالاً بعد حال، کیف یطمئن الیها﴾ (۳)

---

(۱) سورۂ رعد آیت ۲۶۔

(۲) سورۂ غافر آیت ۳۹۔

(۳) بحار الانوار ج ۷۳ ص ۹۷۔

''مجھے اس شخص کے اوپر تعجب ہے جو دنیا اور اسکے الٹ پھیر کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہتا ہے پھر بھی وہ اس کے اوپر کیسے بھروسہ کرلیتا ہے؟''

یا خداوند عالم نے جناب موسیٰ کی طرف یہ وحی نازل فرمائی تھی:

﴿یاموسیٰ لا ترکن الیٰ الدنیا رکون الظالمین،ورکون من اتخذھا اُماً و أباً، واترک من الدنیامابک الغنیٰ عنه﴾(۱)

''اے موسیٰ دنیا سے اس طرح دل نہ لگاؤ جس طرح ظالمین دنیا کے دلدادہ ہیں یا جن لوگوں نے اس کو اپنی ماں یا اپنا باپ سمجھ رکھا ہے اور دنیا کو ایسے ترک کردو جیسے تمہیں اسکی ضرورت ہی نہیں ہے''

درحقیقت یہ ایک صاف اور شفاف تعبیر ہے کہ جس طرح ایک بچہ اپنے ماں باپ کے اوپر بھروسہ کرتا ہے اسی طرح بہت سارے لوگ دنیا پر بھروسہ رکھتے ہیں جبکہ انھیں اسکے تغیرات کا بخوبی علم ہے۔جبکہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو دنیا کے کھیل تماشے یا اسکی رنگینیوں اور اسباب راحت جیسے فضولیات کی اوقات کو بخوبی سمجھتے ہیں اور اس سے دھوکہ نہیں کھاتے اور یہ حضرات اسکی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کے بجائے حقیقی زندگی کی تلاش میں صراط مستقیم پر چلتے رہتے ہیں کیونکہ واقعی اور حقیقی زندگی دراصل آخرت کی زندگی ہے۔جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿وما ھذه الحیاة الد نیا الا لھو ولعب وان ا لدار الآخرة لھی الحیوان ...﴾(۲)

''اور یہ دنیاوی زندگی تو کھیل تماشے کے سوا کچھ نہیں اور آخرت کا گھر ہمیشہ کی زندگی کا مرکز ہے...''

۳۔دنیاوی زندگی کو آخرت پر مقدم کرنا

یہ بھی حب دنیا کا ہی ایک نتیجہ ہے کیونکہ جب انسان حد سے زیادہ محبت دنیا کا دلدادہ ہوجاتا

---

(۱)بحار الانوار ج۱۳ص۳۵۴وج۷۳ص۷۳۔

(۲)سورۂ عنکبوت آیت ۶۴۔

ہے تو وہ اسکو آخرت پر ترجیح دینے لگتا جسکی طرف خداوند عالم نے قرآن مجید میں یوں اشارہ کیا ہے:

﴿فأمّا من طغیٰ و آثر الحیاة الدنیا فانّ الجحیم هی المأویٰ﴾(۱)

''پھر جس نے سرکشی کی ہے اور زندگانی دنیا کو اختیار کیا ہے جہنم اسکا ٹھکانا ہوگا''

﴿بل تؤثرون الحیاة الدنیا و الآخرة خیرٌ و أبقیٰ﴾(۲)

''لیکن تم لوگ زندگانی دنیا کو مقدم رکھتے ہو جبکہ آخرت مقدم اور ہمیشہ رہنے والی ہے''

درحقیقت ان لوگوں کو صرف دنیا چاہیے اور دنیا کو آخرت پر اسی وقت ترجیح دی جاسکتی ہے کہ جب ان دونوں کے درمیان ٹکراؤ پیدا ہوجائے کیونکہ یہ طے شدہ ہے کہ جب ان دونوں کے درمیان ٹکراؤ پیدا ہوگا تو ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا پڑیگا یعنی یا صرف دنیا کو لے لیا جائے اور یا صرف آخرت کو؟ اور کیونکہ ان لوگوں نے آخرت کو چھوڑ کر دنیا کو اپنا لیا ہے لہٰذا اب انہیں دنیاوی زندگی کے علاوہ کسی اور چیز کی خواہش نہیں ہے۔ جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے:

﴿فأعرض عمن تولّیٰ عن ذکرنا ولم یرد الا الحیاة الدنیا﴾(۳)

''لہٰذا جو شخص بھی ہمارے ذکر سے منھ پھیرے اور زندگانی دنیا کے علاوہ کچھ نہ چاہے، آپ بھی اس سے کنارہ کش ہوجائیں''

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے دنیا کے بدلے اپنی آخرت کو بیچ ڈالا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿أولئك الذین اشتروا الحیاة الدنیا بالآخرة﴾(۴)

''یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے آخرت کو دے کر دنیا خریدی ہے''

---

(۱) سورۂ نازعات آیت ۳۷، ۳۸، ۳۹۔

(۲) سورۂ اعلیٰ آیت ۱۶، ۱۷۔

(۳) سورۂ نجم آیت ۲۹۔

(۴) سورۂ بقرہ آیت ۸۶۔

اسی بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ روایت ہے:

﴿من عرضت له دنیا و آخرة، فاختار الدنیا علیٰ الآخرة، لقی الله عزّوجلّ ولیست له حسنة یتقی بها النار، ومن أخذ الآخرة وترک الدنیا لقی الله یوم القیامة وهو راضٍ عنه﴾(۱)

''جس کے سامنے دنیا اور آخرت دونوں کو پیش کیا جائے اور وہ آخرت کو چھوڑ کر دنیا کو اپنا لے تو جب وہ خداوند عالم کی بارگاہ میں پہونچے گا تو اسکے نامۂ عمل میں کوئی ایسی نیکی نہ ہوگی جو اسے جہنم سے بچا سکے اور جو شخص دنیا کو چھوڑ کر آخرت کو اپنا لے جب وہ روز قیامت خداوند عالم سے ملاقات کریگا تو وہ اس سے راضی رہے گا''

حضرت علیؑ:

﴿من عبدالدنیا و آثرها علیٰ الآخرة استوخم العاقبة﴾(۲)

''جو دنیا کا پجاری ہوگیا اور اس نے اسے (دنیا کو) آخرت پر ترجیح دی ہے اس نے اپنی عاقبت بگاڑ لی''

حضرت علیؑ:

﴿لا یترک الناس شیئاً من أمر دینهم لاستصلاح دنیاهم الا فتح الله علیهم ما هو أضرّ منه﴾(۳)

''لوگ اپنی دنیا کی بھلائی کے لئے اپنے دین کا کوئی کام ترک نہیں کرتے مگر یہ کہ خداوند عالم ان کے سامنے اس سے زیادہ مضر دروازہ کھول دیتا ہے''

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۷ ص ۲۶۴ و ج ۷۳ ص ۱۰۳۔

(۲) بحار الانوار ج ۷۳ ص ۱۰۴۔

(۳) بحار الانوار ج ۷۰ ص ۱۰۷۔

آپ ہی سے یہ بھی مروی ہے:

﴿من لم يبال مارزء من آخرته اذا سلمت له دنياه فهو هالك﴾(۱)

''اگر کسی کی دنیا سالم ہو اور اسے یہ فکر نہ ہو کہ اس نے اپنی آخرت کے لئے کیا حاصل کیا تو وہ ہلاک ہونے والا ہے''

آخرت کی نعمتوں کے لئے دنیا ہی میں عجلت پسندی

حب دنیا کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ انسان آخرت کی نعمتوں کو دنیا میں ہی حاصل کرنے کے لئے عجلت سے کام لیتا ہے کیونکہ خداوند عالم نے انسان کو درحقیقت جنت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے پیدا کیا ہے لہذا جب انسان دنیا کا دلدادہ ہوجاتا ہے اور اسکی لذتوں اور نعمتوں پر اکتفاء کر بیٹھتا ہے تو گویا اسے دنیا میں ہی آخرت کی تمام نعمتیں حاصل کر لینے کی جلدی ہے جیسے کوئی کسان جلدی غلہ یا پھل توڑنے کی فکر میں اسے خام اور کچا ہی توڑ لیتا ہے یا وہ بچہ جو بزرگی اور بڑھاپے کے دور کی راحت و آرام کو پہلے ہی حاصل کرنے کے لئے کھیل کود میں وقت گذار دیتا ہے اور اپنی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا یعنی اسکے اوپر مستقبل (بڑھاپے اور ادھیڑ پن) کے راحت و آرام کو قربان کر ڈالتا ہے جس کی تصویر کشی اس آیۂ کریمہ نے کتنے حسین انداز میں کی ہے:(۲)

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۷ ص ۲۷۷۔

(۲) اس تحقیق کا موضوع درحقیقت دنیا اور آخرت کے ٹکراؤ کے وقت ہے یعنی ''حدود الٰہی'' اور دنیا کا ٹکراؤ! چنانچہ حدود اور احکام الٰہی کی پابندی کا لازمہ دنیا کی بعض اچھی چیزوں سے محرومی ہے اور دنیا سے لگاؤ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان بعض حدود الٰہیہ سے تجاوز کر جائے اس مرحلہ پر انسان دنیا اور آخرت کے دوراہے پر کھڑا ہوتا ہے اور یہ درحقیقت محرومی نہیں ہے چونکہ جب انسان حدود الٰہیہ کا پابند ہو جاتا ہے تو پروردگار اسکو آخرت کی نعمتیں جو کامل و دائم، تر و تازہ اور باقی رہنے والی ہیں دینا چاہتا ہے لیکن انسان ان کو دنیا ہی میں پانے کے لئے جلدی کرتا ہے اور ان کو اچانک حاصل کر لیتا ہے جو ناپختہ ہوتی ہیں اور یہ بہت جلد زائل ہو جانے والی پونجی ہے اور اس میں بے شمار مشکلات اور خطرات پائے جاتے ہیں۔

جب ہم اسلامی نصوص میں غور و فکر کرتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قاعدہ کسی حد تک دنیا کی حلال چیزوں پر بھی منطبق ہوتا ہے لیکن مطلق طور پر نہیں لہذا جب کوئی انسان دنیا کی بعض حلال چیزوں میں زہد اختیار کرتا ہے (بقیہ آئندہ صفحے پر)

﴿ویوم یعرض الذین کفروا علیٰ النار أذهبتم طیبا تکم فی حیاتکم الدنیا واستمتعتم بها فالیوم تجزون عذاب الهون بما کنتم تستکبرون فی الارض بغیر الحق وبما کنتم تفسقون﴾(۱)

''اور جس دن کفار جہنم کے سامنے لائے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ تم تو اپنی دنیا کی زندگی میں اپنے مزے اڑا چکے اور اس میں خوب چین کر چکے تو آج تم پر ذلت کا عذاب کیا جائے گا اس لئے کہ تم زمین میں اکڑا کرتے تھے اور اس لئے کہ تم بدکاریاں کرتے تھے''

اس قول الٰہی کے بارے میں توجہ فرمائیں:

﴿أذهبتم طیبا تکم فی حیاتکم الدنیا﴾(۲)

''تم تو اپنی دنیا کی زندگی میں اپنے مزے اڑا چکے''

جبکہ خداوند عالم نے انسان کیلئے ان بہترین نعمتوں کو آخرت میں ذخیرہ کر کے رکھا ہے اور وہی دارالقرار ہے لیکن انسان اسکو اچھی طرح پختہ ہونے بلکہ ان پر پھل آنے سے پہلے ہی دنیا میں ان کی فصل کاٹنے کے لئے جلد بازی کرنے لگتا ہے جبکہ وہ بہت جلد تمام ہو کر گذر جانے والی ہیں۔

زود گذر

قرآن مجید نے دنیا کو اسی وجہ سے ''زود گذر'' کہا ہے کیونکہ انسان اس دنیا میں آخرت کی نعمتوں کو ان کے وقت سے پہلے ہی حاصل کر لینا چاہتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

(گذشتہ صفحے کا بقیہ) تو خداوند عالم اسکے لئے آخرت کی نعمتیں ذخیرہ کر دیتا ہے... اور شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ اسکو حاصل کر لینے کے بعد اسکے دل میں دنیا سے لگاؤ اور اسکی محبت پیدا ہو سکتی ہے...... یا یہ حکم مومنین کے غریب طبقہ سے برابری کی بنا پر ہو... بہر حال اسکی وجہ چاہے جو بھی ہو اس قاعدہ اور خداوند عالم کے اس قول: ﴿قل من حرّم زینة الله التی أخرج لعباده والطیبات من الرزق﴾ کے درمیان ہر لحاظ سے مطابقت پائی جاتی ہے۔

(۱/۲) سورۂ احقاف آیت ۲۰۔

﴿من کان یرید العاجلة عجّلنا له فیها ما نشاء لمن نرید﴾(۱)

''اور جو شخص دنیا کا خواہاں ہو تو ہم جسے چاہتے اور جو چاہتے ہیں اسی دنیا میں سردست عطا کر دیتے ہیں''

آیت کے آخری حصہ ﴿ما نشاء لمن نرید﴾ ''ہم جسے چاہتے اور جو چاہتے ہیں'' کے معنی پر توجہ کے بعد یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ دنیا میں ہی آخرت کی نعمتوں کو پانے کے لئے جلد بازی کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انسان اس دنیا میں اپنی عجلت پسندی اور بے تابی کی وجہ سے جو چاہے حاصل کرلے بلکہ اسکے معنی یہ ہیں کہ اسکی جلد بازی کے بعد بھی خداوند عالم ہی اسے جیسے چاہتا ہے اپنے اعتبار سے کم یا زیادہ رزق عطا کرتا ہے گویا رزق پھر بھی خداوند عالم کے ہاتھ میں ہے اور اس پر وہی حکم فرما ہے اور اس میں جلد بازی دکھانے سے انسان کا کچھ بس چلنے والا نہیں ہے۔۔۔ مگر اسکے باوجود بھی وہ آخرت کی نعمتوں سے محروم ہو جاتا ہے اور جن نعمتوں کیلئے اس نے ناجائز طور پر جلد بازی کی تھی وہ کم ہو جاتی ہیں۔

اس بارے میں خداوند عالم کا یہ ارشاد بھی ہے:

﴿قالوا ربّنا عجل لنا قِطّنا قبل یوم الحساب﴾(۲)

''انہوں نے کہا پروردگار روز حساب سے پہلے ہی دنیا میں ہمارا حصہ ہمیں دیدے''

یا خداوند عالم کا یہ بھی ارشاد ہے: ﴿کلا بل تُحبّون العاجلة﴾(۳)

''مگر (لوگو) حق تو یہ ہے کہ تم لوگ (زود گذر) دنیا کو دوست رکھتے ہو''

دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

---

(۱) سورۂ اسراء آیت ۱۸۔

(۲) سورۂ ص آیت ۱۶۔

(۳) سورۂ قیامت آیت ۲۰۔

﴿ان هؤلاء یُحبون العاجلة ویذرون وراء هم یوماً ثقیلا﴾(۱)

''یہ لوگ صرف دنیا کی نعمتوں کو پسند کرتے ہیں اور بڑے بھاری دن کو اپنے پس پشت چھوڑ بیٹھے ہیں''

ہم جب روایات کے اندر غور وفکر کرتے ہیں تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا وآخرت کے درمیان ٹکراؤ ہمیشہ محرمات کے میدان ہی میں نہیں ہوتا بلکہ یہ ٹکراؤ کبھی کبھی ''حلال'' معاملات کے درمیان بھی پیدا ہوسکتا ہے یہ نکتہ اسلامی افکار کے انوکھے نظریات میں سے ایک ہے۔

جیسا کہ روایات میں ہمیں ملتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اہلبیت طاہرین اور خداوند عالم کے دوسرے نیک اور صالح بندے دنیا کی نعمتوں کے استعمال میں افراط کو پسند نہیں کرتے تھے جسکا سبب شاید یہ ہو کہ دنیا کی نعمتوں سے زیادہ لطف اندوز ہونے سے اس کی محبت میں اضافہ ہوجاتا ہے اور انسان دنیا سے مزید وابستہ ہوجاتا ہے کیونکہ دنیا کی محبت اور اس کی نعمتوں کے لئے جلد بازی کرنے کے درمیان دوطرفہ (طرفینی) رابطہ ہے یعنی جب انسان دنیا سے محبت کریگا تو اسکی نعمتوں کو حاصل کرنے کیلئے بے تابی دکھائے گا اور جب نعمتوں کو حاصل کرنے کیلئے جلد بازی سے کام لینے لگے گا تو اسکے دل میں دنیا کی محبت رچ بس جائے گی۔

بہر حال اس تحقیق کا نتیجہ چاہے جو کچھ بھی ہو لیکن ہمیں اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ دنیا اور آخرت کی نعمتوں کے درمیان ٹکراؤ حلال چیزوں میں بھی پایا جاتا ہے البتہ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ خداوند عالم نے اپنے بندوں کے لئے جن آرائشوں یا نعمتوں کو حلال قرار دیا ہے انہیں حرام قرار دیدیا جائے بلکہ اسکا معاملہ حلال وحرام کے ٹکراؤ کے معاملات سے بالکل الگ ہے جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے کہ یہ اسلامی افکار کے مختلف انوکھے نظریات میں سے ایک نظریہ ہے۔

---

(۱) سورۂ انسان آیت ۲۷۔

آئندہ سطروں میں ہم اس بارے میں موجود روایات ذکر کرینگے اور اسکے بعد انکی وضاحت اور تفسیر بھی پیش کریں گے۔

روایات

حضرت عمر کا بیان ہے کہ میں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ اے اللہ کے رسول، خدا سے دعا کیجئے کہ وہ آپ کی امت کو بھی فراوانیاں عطا کرے۔ اللہ نے فارس و روم کو تو خوب نواز رکھا ہے حالانکہ وہ قومیں خدا کی عبادت بھی نہیں کرتی ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا:

﴿أفي شك أنت يابن الخطاب. أو قوم عُجّلت لهم طيبا تهم في الحياة الدنيا﴾(۱)

''اے ابن خطاب تم کس شک میں مبتلا ہو؟ ان قوموں نے اپنے طیبات کو اسی زندگانی دنیا میں پالیا ہے''

پیغمبر اکرم کی خدمت میں ''خبیص'' (ایک قسم کا حلوہ) پیش کیا گیا تو آپ نے کھانے سے انکار فرمادیا حاضرین نے پوچھا۔ کیا آپ اس کو حرام سمجھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ایسا نہیں ہے لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ میرا نفس اسکا شوقین ہو جائے:

پھر آپ نے اس آیہ کریمہ کی تلاوت فرمائی:

﴿أذهبتم طيبا تكم في الحياة الدنيا﴾(۲)

''تم تو اپنی دنیا کی زندگی میں اپنے مزے اڑا چکے''

---

(۱) کنز العمال: ج ۶۶۴۳۔

(۲) نور الثقلین ج ۵ ص ۱۵۔

عمر بن خطاب کا بیان ہے کہ میں نے حضور سے باریابی کی اجازت طلب کی اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوگیا آپ مشربہ ام ابراہیم (ایک جگہ کا نام) میں اس طرح لیٹے ہوئے تھے کہ آپ کے جسم مبارک کے بعض حصے خاک پر تھے آپ کے سر کے نیچے کھجور کی پتیوں کا تکیہ تھا، میں سلام کرکے بیٹھ گیا اور عرض کی: اے رسول خدا آپ اللہ کے نبی، اسکے منتخب بندے اور بہترین خلق خدا ہیں۔ قیصر و کسریٰ سونے کے تخت اور حریر و دیبا کے فرش پر آرام کرتے ہیں (اور آپ کا یہ عالم ہے؟) رسول خدا نے فرمایا:

﴿اُولئك قوم عُجّلت طيباتهم وهي وشيكة الانقطاع، وانما اُخّرت لنا طيباتنا﴾(۱)

''ان اقوام کے طیبات یہیں عطا کردئے گئے ہیں جو بہت جلد منقطع ہوجائیں گے۔ اور ہمارے طیبات کو آخرت پر اٹھا رکھا گیا ہے''

روایت ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اصحاب صفہ کے پاس پہونچے تو وہ اپنے کپڑوں میں چمڑے کا پیوند لگا رہے تھے اور ان کے پاس پیوند لگانے کے لئے کپڑے کا ٹکڑا نہیں تھا تو آپ نے فرمایا ہے کہ یہ دن تمہارے لئے بہتر ہے یا وہ دن جب صبح کو تم بہترین حلے پہنے ہوگے اور شام کے وقت دوسرا پہن لوگے اور صبح کو ایک پیالا اور شام کو دوسرا پیالا استعمال کروگے اور اپنے گھر پر اس طرح غلاف چڑھائے رکھوگے جس طرح کعبہ پر غلاف چڑھا رہتا ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے لئے وہی دن بہتر ہے تو آپ نے فرمایا: نہیں بلکہ تم آج ہی بہتر ہو۔(۲)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جناب فاطمہؑ کو دیکھا کہ آپ اونٹ کے بالوں سے بنی ہوئی چادر اوڑھے ہوئے ہیں اور اپنے ہاتھوں سے چکی چلارہی ہیں اور اپنے بچے کو دودھ پلا رہی ہیں تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور آپ نے فرمایا:

---

(۱) نور الثقلین ج۵ ص۱۵۔

(۲) نور الثقلین ج۵ ص۱۷۔

﴿یابنتاه تعجّلی مرارة الدنیا بحلاوة الآخرة﴾

"اے بیٹی آج تلخی دنیا کے بدلے آخرت کی حلاوت خرید لو"

جناب فاطمہؑ نے فرمایا:

﴿یارسول الله الحمدلله علیٰ نعمائه، والشکرلله علیٰ آلائه﴾

"اے رسول خدا، تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں اسکی نعمتوں پر، اور اسکی عنایات پر اس کا شکر ہے

تو خدا نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿ولسوف یعطیك ربك فترضیٰ﴾(۱)

"عنقریب آپ کا رب آپ کو اس قدر عطا کرے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے"

امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے:

﴿انّا لنحبّ الدنیا، وأن لانؤتاها خیرمن أن نؤتاها، وما أوتی ابن آدم منها شیئاً الا نقص حظّه من الآخرة﴾(۲)

"ہمیں دنیا سے محبت ہے اور ہماری نگاہ میں دنیا کا نہ ملنا اس کے ملنے سے بہتر ہے کیونکہ فرزند آدم کو جس مقدار میں دنیا ملتی ہے آخرت سے اسکا اتنا ہی حصہ کم ہو جاتا ہے"

امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے:

﴿آخرنبی یدخل الجنة سلیمان بن داؤد(ع) وذلك لما أُعطی فی الدنیا﴾(۳)

"جنت میں داخل ہونے والے آخری نبی سلیمان بن داؤدؑ ہوں گے کیونکہ دنیا میں انہیں

---

(۱) نور الثقلین ج۵ ص۵۹۴ و میزان الحکمت ج۳: ص۳۲۶۔۳۲۷۔

(۲) بحار الانوار ج۷۲ ص۸۱ و میزان الحکمت ج۲: ص۳۲۶۔

(۳) بحار الانوار ج۱۴ ص۷۴۔

بہت کچھ عطا کر دیا گیا تھا''

امیر المومنین حضرت علی ؑ کا ارشاد ہے:

﴿کلمافاتك من الدنیا شیءٌ فهو غنیمة﴾(۱)

''دنیا میں جو چیز بھی تم سے فوت ہو جائے وہ غنیمت ہے''

آپ ہی کا ارشاد گرامی ہے:

﴿مرارة الدنیاحلاوة الآخرة،وحلاوة الدنیامرارة الآخرة وسوء العقبیٰ﴾(۲)

''دنیا کی تلخی آخرت کی حلاوت وشیرینی ہے اور دنیا کی حلاوت آخرت کی تلخی اور بری عاقبت ہے''

آپ نے ارشاد فرمایا:

﴿من طلب من الدنیاشیئاً فاته من الآخرة أکثر مما طلب﴾(۳)

''جو دنیا میں کسی شے کو طلب کرتا ہے اس سے زیادہ اسکا آخرت میں گھاٹا ہو جاتا ہے''

آپ ہی سے منقول ہے:

﴿مازادفی الدنیا نقص فی الآخرة،ومانقص من الدنیا زاد فی الآخرة﴾(۴)

''دنیا کی زیادتی آخرت کا نقصان اور دنیا کا نقصان آخرت کی زیادتی ہے''

امام جعفر صادق ؑ نے حضرت امام زین العابدین ؑ کا یہ قول نقل کیا ہے:

﴿ماعرض لی قط أمران،أحدهما للدنیا،والآخر للآخرة،فآثرت

---

(۱)غرر الحکم ج۲ص ۱۱۱۔

(۲)نہج البلاغہ حکمت ۲۴۳۔

(۳)غرر الحکم ج۲ص ۲۲۱۔

(۴)غرر الحکم ج۲ص ۲۶۸۔

الدنیا الا رأیت ما أکره قبل أن أُمسی﴾

''میرے سامنے جب بھی کبھی دو کام آتے ہیں ایک دنیا سے متعلق اور دوسرا آخرت سے متعلق، اگر میں نے ان میں دنیاوی کام کو ترجیح دیدی تو شام ہونے سے قبل ناپسندیدہ اور مکروہ شے کا مشاہدہ کر لیتا ہوں''

پھر امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

﴿لبنی أمیة أنهم یؤثرون الدنیا علیٰ الآخرة منذ ثمانین سنة ولیس یرون شیئاً یکرهونه﴾(۱)

''اور یہ بنی امیہ اسّی سال سے دنیا کو آخرت پر ترجیح دے رہے ہیں اور انہیں کسی بھی چیز سے کراہت محسوس نہیں ہوتی ہے''

اس مسئلہ کی وضاحت امیرالمومنینؑ کے اس قول سے ہوجاتی ہے:

﴿واعملوا أن مانقص من الدنیا،وزاد فی الآخرة خیرمما نقص من الآخرة وزاد فی الدنیا،فکم من منقوص...فا تقوا اللّٰہ حق تقا ته ولا تموتن الا وأنتم مسلمون﴾(۲)

''یاد رکھو کہ دنیا میں کسی شے کا کم ہونا اور آخرت میں زیادہ ہونا اس سے بہتر ہے کہ دنیا میں زیادہ ہو اور آخرت میں کم ہوجائے کہ کتنے ہی کمی والے فائدہ میں رہتے ہیں اور کتنے ہی زیادتی والے گھاٹے میں رہ جاتے ہیں۔ بیشک جن چیزوں کا تمہیں حکم دیا گیا ہے ان میں زیادہ وسعت ہے بہ نسبت ان چیزوں کے جن سے روکا گیا ہے اور جنہیں حلال کیا گیا ہے وہ ان سے کہیں زیادہ ہیں

---

(۱) بحارالانوار ج ۷۳ ص ۱۲۷۔

(۲) نہج البلاغہ خطبہ ۱۱۳۔

جنہیں حرام قرار دیا گیا ہے لہٰذا قلیل کو کثیر کے لئے اور تنگی کو وسعت کی خاطر چھوڑ دو۔ پروردگار نے تمہارے رزق کی ذمہ داری لی ہے اور عمل کرنے کا حکم دیا ہے لہٰذا ایسا نہ ہو کہ جس کی ضمانت لی گئی ہے اسکی طلب اس سے زیادہ ہو جائے جس کو فرض کیا گیا ہے۔ خدا گواہ ہے کہ تمہارے حالات کو دیکھ کر شبہ ہونے لگتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ شائد جس کی ضمانت لی گئی ہے وہ تم پر واجب کیا گیا ہے اور جس کا حکم دیا گیا ہے اسے ساقط کر دیا گیا ہے۔ خدا را عمل کی طرف سبقت کرو اور موت کے اچانک وارد ہو جانے سے ڈرو اس لئے کہ موت کے واپس ہونے کی وہ امید نہیں ہے جس قدر رزق کے پلٹ کر آجانے کی ہے۔ جو رزق آج ہاتھ سے نکل گیا ہے اس میں کل اضافہ کا امکان ہے لیکن جو عمر آج نکل گئی ہے اسکے کل واپس آنے کا بھی امکان نہیں ہے۔ امید آنے والے کی ہو سکتی ہے جانے والے کی نہیں اس سے تو مایوسی ہی ہو سکتی ہے" اللہ سے اس طرح ڈرو جو ڈرنے کا حق ہے اور خبردار اس وقت تک دنیا سے نہ جانا جب تک واقعی مسلمان نہ ہو جاؤ"

روایات کا تجزیہ

مذکورہ روایات میں سند یا متن کے لحاظ سے شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے یہ تعداد کے اعتبار سے بہت زیادہ اور سند کے لحاظ سے مستفیضہ ہیں لہٰذا ان سب کے بارے میں شک کا امکان نہیں ہے یہ روایات فقط حرام امور سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ حرام و حلال دونوں قسم کی لذتوں کو بیان کرتی ہیں ان روایات کے مطابق دنیا و آخرت کا ٹکراؤ صرف حرام اشیاء میں ہی نہیں بلکہ اس ٹکراؤ میں حلال لذتیں بھی شامل ہیں ان کے معانی و مطالب واضح اور ظاہر ہیں اور ان کے بارے میں یہ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یہ صرف حرام لذتوں سے منع کر رہی ہیں جس کی بنا پر خداوند عالم کا یہ قول:

﴿یا أیها الناس کلوا مما فی الارض حلالاً طیباً ولا تتبعوا خطوات

الشیطان انہ لکم عدو مبین﴾(۱)

"اے انسانو: زمین میں جو کچھ بھی حلال وطیب ہے اسے استعمال کرو اور شیطانی اقدامات کا اتباع نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے"

یا دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

﴿قل من حرّم زینة اللہ التی أخرج لعبادہ و الطیبات من الرزق،قل ھی للذین آمنوا فی الحیاۃ الدنیا خالصة یوم القیامة﴾(۲)

"پیغمبر آپ پوچھئے کہ کس نے اس زینت کو جسے خدا نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے اور پاکیزہ رزق کو حرام کر دیا ہے اور بتائیے کہ یہ چیزیں روز قیامت صرف ان لوگوں کے لئے ہیں جو زندگانی دنیا میں ایمان لائے ہیں"

مذکورہ دونوں اقوال صرف خداوند عالم کی حلال کردہ طیبات سے مخصوص ہو جائیں جبکہ یہ روایات حرام چیزوں کے علاوہ زندگانی دنیا کی آسائشوں (متاع) سے استفادہ کرنے سے بھی منع کر رہی ہیں۔

تو ہم ان روایات سے کیا نتیجہ اخذ کریں؟ایک جانب یہ روایات ہیں اور دوسری طرف قرآن مجید کی آیات ہیں کہ جن میں خداوند عالم اپنے بندوں کو طیب وطاہر رزق سے استفادہ کی دعوت دے رہا ہے اور طیبات الٰہی کو حرام قرار دینے والوں کو ٹوک رہا ہے؟

ذیل میں ہم چند نکات کے ذریعہ اس سوال کا جواب پیش کرنے کی کوشش کریں گے امید ہے کہ ان نکات کے ساتھ ہمیں بہ ترتیب اسکا صحیح جواب مل جائے گا:

۱۔ذرا دیر پہلے ہم نے جو روایات پیش کی ہیں ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اسلام نعمات

---

(۱) سورۂ بقرہ آیت ۱۶۸۔

(۲) سورۂ اعراف آیت ۳۲۔

الٰہیہ اور طیب وطاہر رزق کو مسلمانوں کے لئے ممنوع قرار دیتا ہے۔ اللہ نے اپنے بندوں کے لئے جو اسباب زینت اور طیبات خلق کئے وہ بندوں کے لئے جائز اور مباح ہیں مگر یہ کہ خود پروردگار منع کردے خداوند عالم فرماتا ہے:

﴿قل من حرّم زينة الله التی أخرج لعباده والطيبات من الرزق قل هی للذين آمنوا فی الحياة الدنيا خالصة يوم القيامة وكذالك نفصل الآيات لقوم يعلمون﴾(۱)

''کہو کہ کس نے اس زینت کو جس کو خدا نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے اور پاکیزہ رزق کو حرام کردیا ہے۔ اور بتایئے کہ یہ چیزیں روز قیامت صرف ان لوگوں کے لئے ہیں جو زندگانی دنیا میں ایمان لائے ہیں''

ان روایات کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ انسان روئے زمین پر سعی وکوشش ہی نہ کرے بلکہ اس سلسلہ میں خدا کا حکم تو یہ ہے کہ:

﴿فاذا قُضيت الصلوٰة فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل الله﴾(۲)

''پھر جب نماز تمام ہو جائے تو زمین میں منتشر ہو جاؤ اور فضل خدا کو تلاش کرو''

لیکن اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان دنیا کا ہی ہو کر رہ جائے اور اسکی تمام تر کوششوں کا ماحصل صرف دنیا ہو بلکہ انسان کا اصل مقصد سلوک الی اللہ ہونا چاہیئے اور اسی کے ضمن میں دنیا کے لئے بھی کوشش کرتا رہے۔

﴿وابتغ فيما آتاك الله الدار الآخرة ولا تنس نصيبك من الدنيا﴾(۳)

---

(۱) سورۂ اعراف آیت ۳۲۔

(۲) سورۂ جمعہ آیت ۱۰۔

(۳) سورۂ قصص آیت ۷۷۔

''اور جو کچھ خدا نے دیا ہے اس سے آخرت کے گھر کا انتظام کرو اور دنیا میں اپنا حصہ بھول نہ جاؤ''

لہٰذا بنیادی طور پر انسان کی حرکت خدا اور آخرت کے جانب ہونا چاہیئے مگر دنیا میں اپنے حصہ کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔

۲۔اس وضاحت کے باوجود مسئلہ مکمل طور پر حل نہیں ہوجاتا کیونکہ دنیا اور آخرت کا ٹکراؤ صرف محرمات کی حد تک نہیں ہے بلکہ حلال چیزوں میں بھی یہ ٹکراؤ پایا جاتا ہے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

﴿ان الدنیا والآخرۃ عدوّان متفاوتان،وسبیلان مختلفان،فمن أحبّ الدنیا وتولّاھا أبغض الآخرۃ وعاداھا،وھمابمنزلۃالمشرق والمغرب،وماشٍ بینھما کلما قرب من واحد بَعُدَ من الآخر،وھمابعدضرّتان!﴾(۱)

''یاد رکھو دنیا و آخرت آپس میں دو ناسازگار دشمن ہیں اور دو مختلف راستے۔لہٰذا جو دنیا سے محبت اور تعلق خاطر رکھتا ہے وہ آخرت کا دشمن ہوجاتا ہے اور یہ دونوں مشرق و مغرب کی طرح ہیں کہ جو راہرو ایک سے قریب تر ہوتا ہے وہ دوسرے سے دور تر ہوجاتا ہے پھر یہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کی سوت جیسی ہیں''

انسان اس دنیا کی نعمتوں اور حلال لذتوں سے چاہے جتنا استفادہ کرلے خدا اسے سزا نہیں دے سکتا کیونکہ یہ چیزیں حرام نہیں ہیں البتہ جتنا دنیا میں نعمتوں سے استفادہ کرتا جائے گا اسی مقدار میں جنت کی نعمتوں سے محروم ہوتا جائے گا کیونکہ لذائذ دنیا سے استفادہ کرنے کی وجہ سے آخرت کو پانے کے مواقع کم ہوتے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ حلال لذتوں کے اعتبار سے بھی دنیا و آخرت میں ٹکراؤ پایا جاتا ہے مندرجہ ذیل چند مثالوں کے ذریعہ اس بات کی وضاحت ہوجائے گی۔

---

(۱) نہج البلاغہ حکمت ۱۰۰۔

۱۔اللہ نے بندوں کو جو معین عمر عطا فرمائی ہے اس میں انسان مسلسل روزے رکھ سکتا ہے روزہ اگر چہ صرف ماہ رمضان میں ہی واجب ہے لیکن سال کے بقیہ دنوں میں مستحب ہی نہیں بلکہ ''مستحب مؤکد'' ہے۔

امام محمد باقرؑ نے پیغمبر اکرم ﷺ کے حوالہ سے خداوند عالم کا یہ قول نقل کیا ہے۔

﴿الصوم لی وانا اجزی به﴾(۱)

''روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اسکی جزا دوں گا''

اس طرح سال کے دوران روزہ چھوڑ دینے سے انسان کتنے عظیم ثواب سے محروم ہوتا ہے؟ اسے خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔اب انسان جس دن بھی روزہ نہ رکھکر اللہ کی جائز اور حلال نعمتیں استعمال کرتا ہے اس کی وجہ سے وہ جنت کی کتنی نعمتوں سے محروم ہوا ہے؟ اسکا علم خدا کے علاوہ کسی کو نہیں ہے اگر چہ یہ طے ہے کہ جو کچھ اس نے کھایا وہ رزق حلال ہی تھا لیکن اس تھوڑے سے رزق کے باعث بہر حال آخرت کی نعمتیں حاصل کرنے کا موقع اسکے ہاتھ سے جاتا رہا۔حلال لذتوں کے باعث دنیا و آخرت کے درمیان ٹکراؤ کی یہ ایک مثال ہے۔

۲۔جب انسان رات میں نیند کی لذت سے لطف اندوز ہوتا ہے تو بلا شبہ یہ زندگانی دنیا کی حلال اور بہترین لذت ہے لیکن جب انسان پوری رات سوتے ہوئے گذار دیتا ہے تو اس رات نماز شب اور تہجد کے ثواب سے محروم رہتا ہے۔

فرض کیجئے خدا نے کسی کو ستر برس کی حیات عطا کی ہو تو اس کے لئے ستر سال تک یہ ثواب ممکن ہے لیکن جس رات بھی نماز شب قضا ہو جاتی ہے آخرت کی نعمتوں میں سے ایک حصہ کم ہو جاتا ہے اگر (خدانخواستہ) پورے ستر سال اسی طرح غفلت میں بسر ہو جائیں تو نعمات اخروی

---

(۱) بحار الانوار ج۹۶ص۲۵۴،۲۵۵،۲۴۹۔

حاصل کرنے کا موقع بھی ختم ہو جائے گا اور پھر انسان افسوس کرے گا کہ "اے کاش میں نے اپنی پوری عمر عبادت الٰہی میں بسر کی ہوتی"

۳۔ اگر خداوند عالم کسی انسان کو مال عطا کرے تو اس مال کو راہ خدا میں خرچ کرکے کافی مقدار میں اخروی نعمتیں حاصل کرنے کا امکان ہے انسان جس مقدار میں دنیاوی لذتوں کی خاطر مال خرچ کرتا ہے اتنی ہی مقدار میں آخرت کی نعمتوں سے محروم ہو سکتا ہے کہ اسی مال کو راہ خدا میں خرچ کرکے دنیا کے بجائے آخرت کی لذتیں اور نعمتیں حاصل کر سکتا تھا لہٰذا اگر انسان اپنا پورا مال دنیاوی کاموں کے لئے خرچ کردے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ اس نے اس مال سے اخروی نعمتیں حاصل کرنے کا موقع گنوا دیا۔ چاہے اس نے یہ مال حرام لذتوں میں خرچ نہ کیا ہو۔

اسی طرح انسان کے پاس آخرت کی لذتیں اور نعمتیں حاصل کرنے کے بے شمار مواقع ہوتے ہیں۔ مال، دولت، عمر، شباب، صحت، ذہانت، سماجی حیثیت اور علم جیسی خداداد نعمتوں کے ذریعہ انسان آخرت کی طیب و طاہر نعمتیں کما سکتا ہے لیکن جیسے ہی اس سلسلہ میں کوتاہی کرتا ہے اپنا گھاٹا کر لیتا ہے خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿والعصرِ ☆ انّ الا نسان لفی خسر﴾(۱)

"قسم ہے عصر کی بیشک انسان خسارہ میں ہے"

آیۂ کریمہ نے جس گھاٹے کا اعلان کیا ہے وہ اس اعتبار سے ہے کہ آخرت کی نعمتیں حاصل کرنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے خداوند عالم نے وہ تمام چیزیں اپنے بندوں کو (مفت) عطا کر دی ہیں اور انھیں خداداد نعمتوں سے آخرت کی نعمتیں حاصل کرنے کا بھی انتظام کر دیا ہے اس کے باوجود انسان کوتاہی کرتا ہے اور ان نعمتوں کو خواہشات دنیا کے لئے صرف کرکے آخرت کمانے کا

---

(۱) سورۂ عصر آیت ۱۔۲۔

موقع کھودیتا ہے تو یقیناً گھاٹے میں ہے۔

اس صورت حال کی منظر کشی امیر المومنین حضرت علی ؑ نے بہت ہی بلیغ انداز میں فرمائی ہے آپ کا ارشاد ہے:

﴿واعلم أن الدنیا دار بلیّة،لم یفرغ صاحبها فیها قط ساعة إلا كانت فرغته علیه حسرة یوم القیامة﴾(۱)

''آگاہ ہو جاؤ یہ دنیا دار ابتلا ہے اس میں اگر کوئی ایک ساعت بے کار رہتا ہے تو یہ ایک ساعت کی بے کاری روز قیامت حسرت کا باعث ہوگی''

یہاں بے کاری کا مطلب یہ ہے کہ انسان ذکر خدا نہ کرے اور اسکی خوشنودی کے لئے کوئی عمل نہ بجالائے اور اسکے اعضاء و جوارح بھی قربت خدا کے لئے کوئی کام نہ کر رہے ہوں یا یاد خدا میں مشغول نہ ہوں۔

اب اگر ایک گھنٹہ بھی اس طرح خالی اور بے کار رہے چاہے اس دوران کوئی گناہ بھی نہ کرے تو اسکی بنا پر قیامت کے دن اسے حسرت کا سامنا کرنا ہوگا اس لئے کہ اس نے عمر، شعور اور قلب جیسی نعمتوں کو معطل رکھا اور انہیں ذکر و اطاعت خدا میں مشغول نہ رکھ کر اس نے رضائے خدا اور نعمات اخروی حاصل کرنے کا وہ موقع گنوا دیا ہے جسکا تدارک قطعاً ممکن نہیں ہے بعد میں چاہے وہ جنتی اخروی نعمتیں حاصل کرلے لیکن یہ ضائع ہو جانے والا موقع بہر حال نصیب نہ ہوگا۔

۳۔ سنت الٰہی یہ ہے کہ انسان ترقی و تکامل اور قرب الٰہی کی منزلیں سختیوں اور مصائب کے ذریعہ طے کرتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ﴾(۲)

---

(۱) نہج البلاغہ مکتوب ۵۹۔

(۲) سورۂ عنکبوت آیت ۲۔

''کیا لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ صرف اس بات پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ وہ یہ کہہ دیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور ان کا امتحان نہیں ہوگا''

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

﴿ولنبلونّکم بشيء من الخوف والجوع ونقصٍ من الأموال والأنفس والثمرات...﴾(۱)

''اور ہم یقیناً تمہیں تھوڑا خوف تھوڑی بھوک اور اموال ونفوس اور ثمرات کی کمی سے آزمائیں گے۔۔۔''

نیز ارشاد خداوندی ہے:

﴿...فأخذناهم بالبأساء والضرّاء لعلهم يتضرّعون﴾(۲)

''...اسکے بعد ہم نے انہیں سختی اور تکلیف میں مبتلا کیا کہ شاید ہم سے گڑگڑائیں''

یہ آخری آیت واضح الفاظ میں ہمارے لئے خدا کی طرف انسانی قافلہ کی حرکت اور ابتلاء وآزمائش، خوف، بھوک اور جان ومال کی کمی کے درمیان موجود رابطہ کی تفسیر کر رہی ہے کیونکہ تضرع وزاری قرب الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے اور تضرع کی کیفیت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان جان ومال کی کمی، بھوک، خوف اور شدائد ومصائب میں گرفتار ہوتا ہے اس طرح انسان کے پاس دنیاوی نعمتیں جتنی زیادہ ہوں گی اسی مقدار میں اسے تضرع سے محرومی کا خسارہ اٹھانا پڑے گا اور نتیجتاً وہ قرب الٰہی کی سعادتوں اور اخروی نعمتوں سے محروم ہوجائے گا۔

زندگانی دنیا کے مصائب ومشکلات کبھی تو خدا اپنے صالح بندوں کو مرحمت فرماتا ہے تاکہ وہ تضرع وزاری کیلئے آمادہ ہوسکیں اور کبھی اولیائے الٰہی اور بندگان صالح خود ہی ایسی سخت زندگی

---

(۱) سورۂ بقرہ آیت ۱۵۵۔

(۲) سورۂ انعام آیت ۴۲۔

کو اختیار کر لیتے ہیں۔

۴۔لذائذ دنیا سے کنارکشی کا ایک سبب یہ ہوتا ہے کہ انسان کبھی یہ خوف محسوس کرتا ہے کہ کہیں لذائذ دنیا کا عادی ہوکر وہ بتدریج حب دنیا میں مبتلا نہ ہو جائے اور یہ حب دنیا اسے خدا اور نعمات اخروی سے دور نہ کردے۔اس لئے کہ لذائذ دنیا اور حب دنیا میں دوطرفہ رابطہ پایا جاتا ہے یہ لذتیں انسان میں حب دنیا کا جذبہ پیدا کرتی ہیں یا اس میں شدت پیدا کردیتی ہیں اس کے برعکس حب دنیا انسان کو دنیاوی لذتوں کو آخرت پر ترجیح دینے اور ان سے بھرپور استفادہ کرنے بلکہ اسکی لذتوں میں بالکل ڈوب جانے کی دعوت دیتی ہے۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ انسان لاشعوری طور پر حب دنیا کا شکار ہو جائے لہٰذا لذائذ دنیا سے ہوشیار رہنا چاہئے کیونکہ عین ممکن ہے کہ یہ لذتیں اسے اسکے مقصد سے دور کردیں۔

۵۔کبھی ہمیں روایات میں ایسی بات بھی نظر آتی ہے کہ جو مذکورہ وضاحتوں سے الگ ہے جیسا کہ مولائے کائنات حضرت علیؑ نے جناب محمد بن ابی بکر کو مصر کا حاکم مقرر کرتے وقت ﴿عہد نامہ میں﴾ ان کے لئے یہ تحریر فرمایا تھا:

﴿واعلموا۔عباداللہ۔أن المتقین ذھبوا بعاجل الدنیا و آجل الآخرۃ،...﴾(۱)

"بندگان خدا!یاد رکھو کہ پرہیزگار افراد دنیا اور آخرت کے فوائد لے کر آگے بڑھ گئے۔وہ اہل دنیا کے ساتھ ان کی دنیا میں شریک رہے لیکن اہل دنیا ان کی آخرت میں شریک نہ ہوسکے۔وہ دنیا میں بہترین انداز سے زندگی گذارتے رہے جو سب نے کھایا اس سے اچھا پاکیزہ کھانا کھایا اور وہ تمام لذتیں حاصل کرلیں جو عیش پرست حاصل کرتے ہیں اور وہ سب کچھ پالیا جو جابر اور متکبر افراد کے حصہ میں آتا ہے۔اسکے بعد وہ زاد راہ لے کر گئے جو منزل تک پہونچادے اور وہ تجارت کر کے گئے

---

(۱) نہج البلاغہ مکتوب ۲۷۔

جس میں فائدہ ہو۔ دنیا میں رہ کر دنیا کی لذت حاصل کی اور یقین رکھے رہے کہ آخرت میں پروردگار کے جوار رحمت میں ہوں گے۔ جہاں نہ ان کی آواز ٹھکرائی جائے گی اور نہ کسی لذت میں ان کے حصہ میں کوئی کمی ہوگی''

ان جملات میں متقین اور غیر متقین کا موازنہ کیا گیا ہے جبکہ جن روایات کا ہم تجزیہ پیش کررہے تھے انمیں درجات متقین کا موازنہ ہے، نہ کہ متقین اور غیر متقین کا! ظاہر ہے کہ یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں لہٰذا ان دونوں کا حکم بھی الگ ہوگا۔

باطن بیں نگاہ

دنیا کے بارے میں سرسری اور سطحی نگاہ سے ہٹ کر ہم دنیا پر زیادہ گہرائی اور سنجیدگی کے ساتھ نظر کر سکتے ہیں۔ جسے ہم (الرؤیۃ النافذۃ) کا نام دے سکتے ہیں اس رویت میں ہم دنیا کے ظاہر سے بڑھ کر اس کے باطن کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ جس سے ہمیں معلوم ہوگا کہ دنیا کا ظاہر اگر حب دنیا کی طرف لے جاتا ہے اور انسان کو فریب دیتا ہے تو اس کے برخلاف دنیا کا باطن انسان کو زہد اور دنیا سے کنارہ کشی کی دعوت دیتا ہے۔ باطن بیں نگاہ ظاہر سے بڑھکر دنیا کی اندرونی حقیقت کو عیاں کر کے یہ بتاتی ہے کہ متاع دنیا بہر حال فنا ہو جانے والی ہے نیز یہ کہ انسان کا دنیا میں انجام کیا ہوگا؟ یوں انسان خود بخود زہد اختیار کر لیتا ہے۔

روایات میں کثرت سے یہ تاکید کی گئی ہے کہ دنیا کو اس (نظر) سے دیکھنا چاہئے، انسان موت کی طرف متوجہ رہے اور ہمیشہ موت کو یاد رکھے، طویل آرزوؤں اور موت کی طرف سے غافل ہونے سے منع کیا گیا ہے۔

موت دراصل اس باطنی دنیا کا چہرہ ہے جس سے انسان فرار کر کے موت کو بھلانا چاہتا ہے چنانچہ روایت میں وارد ہوا ہے کہ (موت سے بڑھ کر کوئی یقین، شک سے مشابہ نہیں ہے) اس لئے کہ موت یقینی ہے، اسمیں شک وشبہ کی گنجائش نہیں اس کے باوجود انسان اس سے گریزاں ہے

اور اسے بھلائے رکھنا چاہتا ہے۔

حالانکہ روایات میں اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے:

﴿أكثروا ذكر الموت، فانه لم يُكثر الانسان ذكر الموت الازهد في الدنيا﴾(۱)

"موت کو کثرت سے یاد کرو کیونکہ انسان جتنا کثرت سے موت کو یاد کرتا ہے اس کے زہد میں اتنا ہی اضافہ ہوتا ہے"

امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿من صوّر الموت بين عينيه هان أمر الدنيا عليه﴾(۲)

"جس کی نگاہوں کے سامنے موت ہوتی ہے دنیا کا مسئلہ اس کے لئے آسان ہوتا ہے"

آپ ہی کا ارشاد ہے:

﴿أحق الناس بالزهادة من عرف نقص الدنيا﴾(۳)

"جو دنیا کے نقائص سے آگاہ ہے وہ زہد کا زیادہ حقدار ہے"

امام موسیٰ کاظمؑ کا ارشاد ہے:

﴿ان العقلاء زهدوا في الدنيا، ورغبوا في الآخرة...﴾(۴)

"بے شک صاحبان عقل دنیا میں زاہد اور آخرت کی جانب راغب ہوتے ہیں انھیں معلوم ہے کہ دنیا طالب بھی ہے مطلوب بھی، اسی طرح آخرت بھی طالب اور مطلوب ہوتی ہے۔ جو آخرت کا طلبگار ہوتا ہے اسے دنیا طلب کرتی ہے اور اپنا حصہ لے لیتی ہے۔ جو دنیا کا طلبگار ہوتا ہے آخرت اس

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۳ ص ۶۴۔

(۲) غرر الحکم ج ۲ ص ۲۰۱۔

(۳) غرر الحکم ج ۱ ص ۱۹۹۔

(۴) بحار الانوار ج ۷۸ ص ۳۰۱۔

کی طالب ہوتی ہے پھر جب موت آتی ہے تو اس کی دنیا و آخرت دونوں خراب ہو جاتی ہیں''

روایت میں ہے کہ امام موسیٰ کاظم ؑ ایک جنازہ کے سرہانے تشریف لائے تو فرمایا:

﴿ان شیئاً هذا أوّله لحقیق أن یُخاف آخره﴾(۱)

''جس چیز کا آغاز یہ (مردہ لاش) ہو اس کے انجام کا خوف حق بجانب ہے''

ان روایات میں ذکر موت اور زہد کے درمیان واضح تعلق نظر آتا ہے بالفاظ دیگران روایات میں نظریہ یا تھیوری اور پریکٹیکل کے درمیان تعلق کو ظاہر کیا گیا ہے کیونکہ موت کا ذکر اور اسے یاد رکھنا ایک قسم کا نظریہ اور تھیوری ہے اور زھد اس نظریہ کے مطابق راہ وروش یا پریکٹیکل کی حیثیت رکھتا ہے امیر المومنین حضرت علی ؑ لوگوں کو دنیا کے بارے میں صحیح اور حقیقی نظریہ سے روشناس کراتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

﴿کونوا عن الدنیا نُزّاها، والیٰ الآخرة ولّاها...ولا تشیموا بارقها، ولا تسمعوا ناطقها، ولا تجیبوا ناعقها، ولا تستضیئوا باشراقها، ولا تفتنوا باعلاقها، فإن برقها خالب، ونطقها کاذب، واموالها محروبة، واعلاقها مسلوبة﴾(۲)

''دنیا سے پاکیزگی اختیار کرو اور آخرت کے عاشق بن جاؤ۔۔۔اس دنیا کے چمکنے والے بادل پر نظر نہ کرو اور اسکے ترجمان کی بات مت سنو، اسکے منادی کی بات پر لبیک مت کہو اور اسکی چمک دمک سے روشنی مت حاصل کرو اور اسکی قیمتی چیزوں پر جان مت دو اس لئے کہ اسکی بجلی فقط چمک دمک ہے اور اسکی باتیں سراسر غلط ہیں اسکے اموال لٹنے والے ہیں اور اسکا سامان چھننے والا ہے''

آپ ہی کا ارشاد گرامی ہے:

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۸ ص ۳۲۰۔

(۲) نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۱۔

﴿واخرجوا من الدنیا قلوبکم من قبل ان تخرج منها ابدانکم﴾(۱)

''دنیا سے اپنے دلوں کو نکال لو قبل اس کے کہ تمہارے بدن دنیا سے نکالے جائیں''

دنیا سے دل نکال لینے کا مطلب، دنیا سے قطع تعلق کرنا ہے جسے ہم (ارادی اور اختیاری موت) کا نام دے سکتے ہیں اس کے بالمقابل (قہری اور غیر اختیاری موت) ہے جسمیں ہمارے بدن دنیا سے نکالے جائیں گے۔ امام نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم قہری موت سے پہلے ارادی موت اختیار کرلیں اور دنیا سے قطع تعلق کا ہی دوسرا نام ''زہد'' ہے۔۔۔ دنیا کے باطن کو دیکھنے والی نظر اور زہد سے اسکے رابطہ کو سمجھنے کے لئے خود زہد کے بارے میں جاننا اور گفتگو کرنا ضروری ہے۔

زہد

زہد، حب دنیا کے مقابل حالت ہے۔ طور وطریقہ اور سلوک کی یہ دونوں حالتیں دو الگ الگ نظریوں سے پیدا ہوتی ہیں۔

حب دنیا کی کیفیت اس وقت نمودار ہوتی ہے کہ جب انسان دنیا کے فقط ظاہر پر نظر رکھتا ہے اس کے برخلاف اگر انسان کی نظر دنیا کے باطن کو بھی دیکھ رہی ہے تو اس سے زہد کی کیفیت جنم لیتی ہے۔

چونکہ حب دنیا کا مطلب دنیا سے تعلق رکھنا ہے اور زہد اس کے مقابل کیفیت کا نام ہے تو زہد کا مطلب ہوگا دنیا سے آزاد البتہ اس کے معنیٰ کی وضاحت ضروری ہے۔ حب دنیا کے مفہوم کو سمیٹ کر دو لفظوں میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ فرحت ومسرت

۲۔ حزن وملال

حب دنیا کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کو لذائذ دنیا میں جب کچھ بھی نصیب ہوتا ہے تو وہ خوش

---

(۱) نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۴۔

ہو جاتا ہے اور جب وہ کسی نعمت سے محروم رہتا ہے یا اس سے کوئی نعمت چھن جاتی ہے تو وہ محزون ہو جاتا ہے چونکہ زہد حب دنیا کے مقابل کیفیت کا نام ہے لہٰذا زہد کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ انسان دنیا سے اتنا آزاد اور بے پرواہ ہو کہ دنیا میں سب کچھ مل جانے پر بھی خوشی محسوس نہ کرے اور کچھ بھی نہ ملنے پر مغموم و محزون نہ ہو۔

خداوند عالم فرماتا ہے:

﴿...لکیلا تحزنوا علیٰ مافاتکم و لامااصابکم...﴾(۱)

"۔۔۔تاکہ تم نہ اس پر رنجیدہ ہو جو چیز ہاتھ سے نکل گئی ہے اور نہ اس مصیبت پر جو نازل ہوگئی ہے۔۔۔"

دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے:

﴿...لکیلا تاسوا علیٰ مافاتکم و لا تفرحوا بما آتاکم...﴾(۲)

"تاکہ جو تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اسکا افسوس نہ کرو اور جو مل جائے اس پر غرور اور فخر نہ کرو۔۔۔"

امیر المومنین حضرت علیؑ سے مروی ہے:

﴿الزھد کلہ فی کلمتین من القرآن﴾

"پورا زہد قرآن کے دو لفظوں میں سمٹا ہوا ہے جیسا کہ خدا کا ارشاد ہے:

﴿لکیلا تأسوا علیٰ مافاتکم﴾(۳)

"تاکہ جو تمہارے ہاتھ سے نکل گیا ہے اسکا افسوس نہ کرو"

---

(۱) سورۂ آل عمران آیت ۱۵۳۔

(۲) سورۂ حدید آیت ۲۳۔

(۳) سورۂ حدید آیت ۲۳۔

﴿فمن لم یأس علی الماضی ولم یفرح بالآتی فهو الزاهد﴾(۱)

جوانسان ماضی پرافسوس نہ کرے اور ہاتھ آجانے والی چیز پر خوش نہ ہو وہ زاہد ہے"

ایک دوسرے مقام پرآپ سے روایت ہے:

"الزهد کلمة بین کلمتین من القرآن قال اللّٰه:﴿لکیلا تاسوا﴾فمن لم یأس علیٰ الماضی،ولم یفرح بالآتی،فقد اخذ الزهد بطرفیه"(۲)

"زہد قرآن کے دولفظوں کا مجموعہ ہے خداوندعالم فرماتا ہے:

﴿لکیلا تأسوا...﴾"تاکہ جوتمہارے ہاتھ سے نکل گیا ہے اسکا افسوس نہ کرو"

لہٰذا جوانسان ماضی پرافسوس نہ کرے اور ہاتھ آجانے والی چیز پر خوش نہ ہو اس نے پورا زہد حاصل کرلیا ہے"

امیرالمومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

﴿من اصبح علی الدنیا حزیناً،فقد أصبح لقضاء اللّٰه ساخطاً،ومن لهج قلبه بحب الدنیاالتاط قلبه منها بثلاث:همّ لایُغِبُّه،وحرص لایترکه،وأمل لایدرکه﴾(۳)

"جودنیا کے بارے میں محزون ہوگا وہ قضاوقدرالٰہی سے ناراض ہوگا جس کا دل محبت دنیا کا دلدادہ ہوجائے اسکے دل میں یہ تین چیزیں پیوست ہوجاتی ہیں وہ غم جواس سے جدانہیں ہوتا ہے،وہ لالچ جواسکا پیچھا نہیں چھوڑتی ہے وہ امید جسے وہ کبھی حاصل نہیں کرسکتا ہے"

یہ بھی حزن وفرحت سے آزادی کا ایک رخ ہے کہ دنیا کے بارے میں حزن وملال،قضا وقدرالٰہی سے ناراضگی کے باعث ہوتا ہے اس لئے کہ انسان دنیا میں جن چیزوں سے بھی محروم ہوتا

---

(۱)بحارالانوارج ۷۸ص ۷۰۔

(۲)بحارالانوارج ۷۰ص ۳۲۔

(۳)نہج البلاغہ حکمت ۲۲۸۔

ہے وہ درحقیقت قضاوقدر الٰہی کے تحت ہی ہوتا ہے نیز حب دنیا انسان میں تین صفتیں پیدا کرتی ہے، ہم وغم، حرص وطمع، آرزو۔ اس طرح وہ انسان کو ظلم وستم اور عذاب کے پنجوں میں جکڑ دیتی ہے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

﴿ایھا الناس انما الدنیا ثلا ثة: زاھد وراغب وصابر، فأما الزاھد فلا یفرح بشیء من الدنیا أتاه، ولا یحزن علیٰ شیٔ منھا فاته وامّا الصابر فیتمنّاھا بقلبه، فان ادرك منھا شیئا صرف عنھا نفسه، لما یعلم من سوء عاقبتھا وامّا الراغب فلا یبالی من حِلّ اصابھا أم من حرام"﴾(۱)

''اے لوگو: دنیا کے افراد تین قسم کے ہیں: ۱۔زاہد ۲۔صابر ۳۔راغب

۱۔زاہد وہ ہے جو کسی بھی چیز کے مل جانے سے خوش یا کسی بھی شے کے نہ ملنے سے محزون نہیں ہوتا۔ صابر وہ ہے جو دل ہی دل میں دنیا کی تمنا تو کرتا ہے لیکن اگر اسے دنیا مل جاتی ہے تو چونکہ اسکے برے انجام سے واقف ہے لہٰذا اپنا منھ اس سے پھیر لیتا ہے اور راغب وہ ہے کہ جسے یہ پروا نہیں ہے کہ اسے دنیا حلال راستہ سے مل رہی ہے یا حرام راستہ سے''

زہد کے معنی، لوگوں کی تین قسموں اور ان قسموں پر زاہدین کی تقسیم کے سلسلہ میں یہ حدیث عالی ترین مطالب کی حامل ہے۔ اسکے مطابق لوگوں کی تین قسمیں ہیں:

زاہد، صابر اور راغب۔

زاہد وہ ہے کہ جو دنیا اور اسکی فرحت وملال سے آزاد ہو۔

صابر وہ ہے کہ جو ان چیزوں سے آزاد تو نہیں ہے مگر حب دنیا، دنیاوی فرحت ومسرت اور حزن وملال سے نجات پانے کے لئے کوشاں ہے۔

---

(۱) بحار الانوار ج ا ص ۱۳۱۔

راغب وہ ہے کہ جو دنیا کا اسیر اور اسکی فرحت ومسرت اور حزن وملال کے آگے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے۔

ان میں پہلا اور تیسرا گروہ ایک دوسرے کے بالکل مقابل ہے کہ ایک مکمل طریقہ سے آزاد اور دوسرا ہر اعتبار سے مطیع واسیر جبکہ تیسرا گروہ درمیانی ہے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ لوگوں کو اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی فرحت وملال کا رخ دنیا سے آخرت کی جانب موڑ دیں یہی بہترین چیز ہے کیونکہ اگر ہماری کیفیت یہ ہو کہ ہم اطاعت خدا کر کے خوشی محسوس کریں اور اطاعت سے محرومی پر محزون ہوں تو یہ بہترین بات ہے اس لئے کہ اس خوشی اور غم کا تعلق آخرت سے ہے۔

مولائے کائنات حضرت علیؑ، ابن عباس کے نام اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

''امابعد! انسان کبھی کبھی ایسی چیز کو پا کر بھی خوش ہو جاتا ہے جو ہاتھ سے جانے والی نہیں تھی اور ایسی چیز کو کھو کر رنجیدہ ہو جاتا ہے جو ملنے والی نہیں تھی لہٰذا خبردار تمہارے لئے دنیا کی سب سے بڑی نعمت، کسی لذت کا حصول یا جذبۂ انتقام ہی نہ بن جائے بلکہ بہترین نعمت باطل کو مٹانے اور حق کو زندہ کرنے کو سمجھو اور تمہیں ان اعمال سے خوشی ہو جنہیں پہلے بھیج دیا ہے اور تمہارا افسوس ان امور پر ہو جنہیں چھوڑ کر چلے گئے ہو اور تمام تر فکر موت کے مرحلہ کے بارے میں ہونی چاہئے'' (۱)

زہد، تمام نیکیوں کا سرچشمہ

جس طرح حیات انسانی میں حب دنیا تمام برائیوں کی جڑ ہے اسی طرح تمام نیکیوں اور اچھائیوں کا سرچشمہ ''زہد'' ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حب دنیا انسان کو دنیا اور اسکی خواہشات کا اسیر بنا دیتی ہے اور دنیا خود تمام برائیوں اور پستیوں کی بنیاد ہے لہٰذا حب دنیا بھی انسان کو برائیوں اور

---

(۱) نہج البلاغہ مکتوب ۶۶۔

پستیوں کی طرف لے جاتی ہے جبکہ زہد کا مطلب ہے دنیااور خواہشات دنیا سے آزاد ہونا اور جب انسان برائیوں کی طرف لے جانے والی دنیا سے آزاد ہوگا تو اسکی زندگی خود بخود نیکیوں اور اچھائیوں کا سرچشمہ بن جائے گی۔

روایات معصومین ؑ میں اس چیز کی طرف متعدد مقامات پر مختلف انداز سے اشارہ کیا گیا ہے بطور نمونہ ہم یہاں چند احادیث پیش کررہے ہیں۔

امام صادق ؑ کا ارشاد ہے:

﴿جُعل الخير كله فی بيت و جُعل مفتاحه الزهد فی الدنيا﴾(۱)

''تمام نیکیاں ایک گھر میں قرار دی گئی ہیں اور اسکی کنجی دنیا کے سلسلہ میں زہد اختیار کرنا ہے''

امیر المومنین حضرت علی ؑ کا ارشاد ہے:

﴿الزهد أصل الدين﴾(۲)

''دین کی اصل، زہد ہے''

آپ ہی کا ارشاد ہے:

﴿الزهد اساس الدين﴾(۳)

''دین کی اساس اور بنیاد، زہد ہے''

امام جعفر صادق ؑ کا ارشاد ہے:

﴿الزهد مفتاح باب الآخرة، والبراءة من النار، وهو تركك كل شئ

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۳ ص ۴۹۔

(۲) غرر الحکم ج ۱ ص ۲۹۔

(۳) غرر الحکم ج ۱ ص ۳۰۔

یشغلک عن اللّٰہ من غیر تأسف علیٰ فوتھا ولا أعجاب فی ترکھا، ولا انتظار فرج منھا، ولا طلب محمدۃ علیھا، ولا عوض منھا بل تریٰ فواتھا راحۃ، وکونھا آفۃ، وتکون أبداً ھارباً من الآفۃ، معتصماً بالراحۃ﴾(۱)

''زہد، باب آخرت کی کنجی اور جہنم سے نجات کا پروانہ ہے۔ زہد کا مطلب یہ ہے کہ تم ہر اس چیز کو ترک کردو جو تمہیں یاد خدا سے غافل کردے اور تمہیں اسکے چھوٹ جانے کا نہ کوئی افسوس ہو اور نہ اسے ترک کرنے میں کوئی زحمت ہو۔ اس کے ذریعہ تمہاری کشادگی کی توقع نہ ہو، نہ ہی اس پر تعریف کی امید رکھو، نہ اسکا بدلہ چاہو بلکہ اسکے فوت ہوجانے میں ہی راحت اور اسکی موجودگی کو آفت سمجھو ایسی صورت میں تم ہمیشہ آفت سے دور اور راحت وآرام کے حصار میں رہوگے''

حضرت علیؑ نے فرمایا ہے:

﴿الزھد مفتاح الصلاح﴾(۲)

''زہد صلاح کی کنجی ہے''

زہد کے آثار

حیات انسانی میں زہد کے بہت عظیم آثار ونتائج پائے جاتے ہیں جنھیں زاہد کے نفس اور اسکے طرز زندگی میں بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ آرزوؤں میں کمی

حب دنیا کا نتیجہ آرزوؤں کی کثرت ہے اور زہد کا نتیجہ آرزوؤں میں کمی۔ جب انسان کا تعلق دنیا سے کم ہو اور وہ خواہشات دنیا سے آزاد ہو تو طبیعی طور پر اسکی آرزوئیں بھی مختصر ہوں گی وہ دنیا میں

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۰ ص ۳۱۵۔

(۲) غرر الحکم ص ۹۹، ۳۷۔۸۔

زندگی بسر کرے گا متاع زندگانی اور دنیاوی لذتوں سے استفادہ کرے گا لیکن ہمیشہ موت کو بھی یاد رکھے گا اور اسی طرح یہ بات بھی اسکے پیش نظر رہے گی کہ ان چیزوں کا سلسلہ کسی بھی وقت اچانک ختم ہو جائے گا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

﴿من یرغب فی الدنیا فطال فیها أمله، أعمیٰ الله قلبه علیٰ قدر رغبته فیها، ومن زهد فیها فقصر فیها أمله، أعطاه الله علماً بغیر تعلّم، وهدیً بغیر هدایة، وأذهب عنه العماء، وجعله بصیراً﴾(۱)

''جو شخص دنیا کی طرف راغب ہوتا ہے اسکی آرزوئیں طولانی ہوتی ہیں اور دنیا کی طرف اسکی رغبت کے مطابق اللہ اسکے قلب کو اندھا کر دیتا ہے اور جو دنیا میں زاہد ہوتا ہے اسکی آرزوئیں مختصر ہوتی ہیں اور اللہ اسے تعلیم کے بغیر علم اور اسباب ہدایت کے بغیر ہدایت عطا کرتا ہے۔ اور اس سے اندھے پن کو دور کر کے اسکو بصیر بنا دیتا ہے''

اس روایت سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ زہد، سے آرزوئیں کم ہو جاتی ہیں اور اس کی سے بصیرت اور ہدایت ملتی ہے اسکے برعکس دنیا کی جانب رغبت سے آرزووں میں کثرت پیدا ہوتی ہے اور یہ کثرت اندھے پن کا سبب ہے تو آخر آرزووں کی قلت اور بصیرت کے درمیان کیا تعلق ہے؟

اسکا راز یہ ہے کہ طویل آرزوئیں انسان کو دنیا میں اس طرح جکڑ دیتی ہیں کہ انسان اس سے بیحد محبت کرنے لگتا ہے اور دنیا کی محبت انسان اور خدا کے درمیان حجاب بن جاتی ہے اور جب آرزوئیں مختصر ہوتی ہیں تو یہ حجاب اٹھ جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب قلب کے حجابات دور ہو جائیں گے تو اس میں بصیرت پیدا ہو جائے گی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۷ ص ۲۶۳۔

﴿الزهد في الدنيا قصر الأمل،وشكر كل نعمة،والورع عن كل ماحرّم الله﴾(۱)

''دنیا میں زہد کا مطلب یہ ہے کہ آرزوئیں قلیل ہوں، ہر نعمت کا شکر ادا کیا جائے اور محرمات الٰہی سے پرہیز کیا جائے''

امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

﴿الزهد تقصير الآمال،واخلاص الاعمال﴾(۲)

''آرزوؤں میں کمی اور اعمال میں خلوص کا نام زہد ہے''

آپ ہی کا ارشاد گرامی ہے:

﴿أيهاالناس،الزهادة قصر الأمل،والشكر عندالنعم،والتورع عندالمحارم،فانْ عزب ذلك عنكم،فلايغلب الحرام صبركم،ولاتنسواعندالنعم شكركم،فقدأعذر الله اليكم بحجج مسفرةظاهرة،وكتب بارزةالعذرواضحة﴾(۳)

''اے لوگوں: زہد امیدوں کے کم کرنے، نعمتوں کا شکریہ ادا کرنے اور محرمات سے پرہیز کرنے کا نام ہے۔ اب اگر یہ کام تمہارے لئے مشکل ہو جائے تو کم از کم اتنا کرنا کہ حرام تمہاری قوت برداشت پر غالب نہ آنے پائے اور نعمتوں کے موقع پر شکر کو فراموش نہ کردینا کہ پروردگار نے نہایت درجہ واضح اور روشن دلیلوں اور حجت تمام کرنے والی کتابوں کے ذریعہ تمہارے ہر عذر کا خاتمہ کردیا ہے''

۲۔ دنیاوی تاثرات سے نجات اور آزادی

دنیاوی نعمتیں ملنے سے نہ انسان خوشی محسوس کرے گا اور نہ ان سے محرومی پر محزون ہوگا۔

امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۷ ص ۱۶۶۔

(۲) غرر الحکم ج ۱ ص ۹۳۔

(۳) نہج البلاغہ خطبہ ۸۱۔

﴿فمن لم یأس علیٰ الماضی،ولم یفرح بالآتی فقد أخذ الزھد بطرفیه﴾(۱)

''جو شخص ماضی پر افسوس نہ کرے اور ہاتھ آنے والی چیزوں سے مغرور نہ ہو جائے اس نے سارا زہد سمیٹ لیا ہے''

امیرالمومنینؑ کے ہر کلام کی مانند حیات انسانی میں زہد کے نتائج کے بارے میں شاہکار کلام پایا جاتا ہے ہم یہاں اس کلام کو نہج البلاغہ سے نقل کر رہے ہیں۔''اپنے کانوں کو موت کی آواز سنا دو قبل اسکے کہ تمہیں بلا لیا جائے دنیا میں زاہدوں کی شان یہی ہوتی ہے کہ وہ خوش بھی ہوتے ہیں تو ان کا دل روتا رہتا ہے اور وہ ہنستے بھی ہیں تو ان کا رنج و اندوہ شدید ہوتا ہے۔وہ خود اپنے نفس سے بیزار رہتے ہیں چاہے لوگ ان کے رزق سے غبطہ ہی کیوں نہ کریں۔افسوس تمہارے دلوں سے موت کی یاد نکل گئی ہے اور جھوٹی امیدوں نے ان پر قبضہ کر لیا ہے۔اب دنیا کا اختیار تمہارے اوپر آخرت سے زیادہ ہے اور وہ عاقبت سے زیادہ تمہیں کھینچ رہی ہے۔تم دین خدا کے اعتبار سے بھائی بھائی تھے۔لیکن تمہیں باطن کی خباثت اور ضمیر کی خرابی نے الگ الگ کر دیا ہے کہ اب نہ کسی کا بوجھ بٹاتے ہو۔نہ نصیحت کرتے ہو۔نہ ایک دوسرے پر خرچ کرتے ہو اور نہ ایک دوسرے سے واقعاً محبت کرتے ہو۔آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ معمولی سی دنیا کو پا کر خوش ہو جاتے ہو اور مکمل آخرت سے محروم ہو کر رنجیدہ نہیں ہوتے ہو۔تھوڑی سی دنیا ہاتھ سے نکل جائے تو پریشان ہو جاتے ہو اور اسکا اثر تمہارے چہروں سے ظاہر ہو جاتا ہے اور اس کی علیحدگی پر صبر نہیں کر پاتے ہو جیسے وہی تمہاری منزل ہے اور جیسے اس کا سرمایہ واقعی باقی رہنے والا ہے۔تمہاری حالت یہ ہے کہ کوئی شخص بھی دوسرے کے عیب کے اظہار سے باز نہیں آتا ہے مگر صرف اس خوف سے کہ وہ بھی اسی طرح پیش آئے گا۔تم سب نے آخرت کو نظر انداز کرنے اور دنیا کی محبت پر اتحاد کر لیا ہے اور ہر ایک کا دین زبان کی چٹنی بن کر رہ گیا

---

(۱) بحارالانوار ج ۷۰ ص ۳۲۰، نہج البلاغہ حکمت ۴۳۹۔

ہے۔ایسا لگتا ہے کہ جیسے سب نے اپنا عمل مکمل کرلیا ہے اور اپنے مالک کو واقعا خوش کرلیا ہے۔''(۱)

۳۔دنیا پر عدم اعتماد

انسانی نفس کے اوپر زہد کے آثار میں سے ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ زاہد کبھی بھی دنیا پر اعتماد نہیں کرتا۔انسان جب دنیا سے محبت کرنے لگتا ہے اور اس کا نفس دنیا میں الجھ جاتا ہے تو وہ دنیا پر بھروسہ کرتا ہے اور دنیا کو ہی اپنا ٹھکانہ اور دائمی قیام گاہ مان لیتا ہے لیکن جب انسان کے اندر زہد کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنے دل سے حب دنیا کو نکال دیتا ہے تو پھر اسے دنیا پر اعتبار بھی نہیں رہ جاتا اور وہ دنیا کو محض ایک گذرگاہ اور آخرت کے لئے ایک پل تصور کرتا ہے۔

دنیا کے بارے میں لوگوں کے درمیان دوطرح کے تصورات پائے جاتے ہیں۔کچھ افراد دنیا کو قیام گاہ مان کر اس سے دل لگا لیتے ہیں اور کچھ لوگ دنیا کو گذرگاہ اور آخرت کے لئے ایک پل سمجھ کر اس سے دل نہیں لگاتے۔دونوں قسم کے افراد اسی دنیا میں رہتے ہیں اور خدا کی نعمتوں سے استفادہ کرتے ہیں مگر ان کے درمیان فرق یہ ہے کہ پہلے گروہ کا منظور نظر خود دنیا ہوتی ہے اور وہ اسی کو سب کچھ مانتے ہیں یہاں تک کہ موت ان سے دنیا کو الگ کر دیتی ہے۔دوسرا گروہ وہ ہے کہ جو دنیا کو سب کچھ سمجھ کر اس سے دل نہیں لگاتا بلکہ اسے گذرگاہ اور پل کی حیثیت سے دیکھتا ہے لہٰذا جب موت آتی ہے تو دنیا کی مفارقت ان پر گراں نہیں گذرتی ہے۔

دنیا میں انسان کی حالت اور اس میں اسکے قیام کی مدت کو روایات میں بہترین مثالوں کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے ایک مثال کے بموجب دنیا میں انسان کا قیام ایسے ہی ہے کہ جیسے کوئی سوار راستہ میں سورج کی گرمی سے پریشان ہوکر کسی سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ جاتا ہے اور تھوڑی دیر آرام کے بعد پھر اپنے کام کے لئے چل پڑتا ہے۔کیا ایسی صورت میں دنیا کو اپنا ٹھکانہ، دائمی قیام گاہ سمجھنا اور

---

(۱) نہج البلاغہ خطبہ ۱۱۳

اس سے دل لگانا صحیح ہے؟

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

﴿مالي وللدنيا، انما مثلي كمثل راكبٍ مرّللقيلولة في ظلّ شجرة في يوم صائف ثم راح وتركها﴾(۱)

"دنیا سے میرا کیا تعلق؟ میری مثال تو اس سوار کی سی ہے جو تیز ہواؤں کے تھپیڑوں کے درمیان آرام کی خاطر کسی درخت کے نیچے لیٹ جاتا ہے اور پھر اس جگہ کو چھوڑ کر چل دیتا ہے"

امیر المومنین حضرت علیؑ نے اپنے فرزند امام حسنؑ کو یہ وصیت فرمائی ہے:

﴿...یابنیّ انی قدأنبأتك عن الدنيا و حالها، وزوالها، وانتقالها، وأنبأتك عن الآخرة وماأعدّ لأهلها فيها، وضربت لك فيهماالأمثال، لتعتبربها، وتحذو عليها، انمامثل من خبرالدنيا كمثل قوم سفرنبا بهم منزل جديب فأمّوا منزلاًخصيباً، وجناباً مريعاً، فاحتملواوعثاء الطريق، وفراق الصديق، وخشونةالسفر...ومَثَل من اغترّبها كمثل قوم كانوابمنزل خصيب فنبابهم الىٰ منزل جديب، فليس شيء أكره اليهم و لاأفضع عندهم من مفارقة ماكانوا فيه الىٰ مايهجمون عليه ويصيرون اليه...﴾(۲)

"۔۔۔اے فرزند میں نے تمہیں دنیا اور اسکی حالت اور اسکی بے ثباتی و ناپائیداری سے خبردار کردیا ہے۔اور آخرت اور آخرت والوں کے لئے جو سروسامان عشرت مہیا ہے اس سے بھی آگاہ کردیا ہے اور ان دونوں کی مثالیں بھی تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں تاکہ ان سے عبرت حاصل کرو

---

(۱)بحار الانوار ج۷۳ص۱۱۹۔

(۲)نہج البلاغہ مکتوب۳۱۔

اوران کے تقاضے پر عمل کرو۔ جن لوگوں نے دنیا کو خوب سمجھ لیا ہے ان کی مثال ان مسافروں کی سی ہے جن کا قحط زدہ منزل سے دل اچاٹ ہوا، اور انھوں نے راستے کی دشواریوں کو جھیلا، دوستوں کی جدائی برداشت کی، سفر کی صعوبتیں گوارا کیں، اور کھانے کی بد مزگیوں پر صبر کیا تا کہ اپنی منزل کی پہنائی اور دائمی قرارگاہ تک پہنچ جائیں۔ اس مقصد کی دھن میں انھیں ان سب چیزوں سے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ اور جتنا بھی خرچ ہو جائے اس میں نقصان معلوم نہیں ہوتا۔ انھیں سب سے زیادہ وہی چیز مرغوب ہے جو انہیں منزل کے قریب اور مقصد سے نزدیک کر دے اور اسکے برخلاف ان لوگوں کی مثال جنھوں نے دنیا سے فریب کھایا ان لوگوں کی سی ہے جو ایک شاداب سبزہ زار میں ہوں اور وہاں سے دل برداشتہ ہو جائیں اور اس جگہ کا رخ کر لیں جو خشک سالیوں سے تباہ ہو۔ ان کے نزدیک سخت ترین حادثہ یہ ہوگا کہ وہ موجودہ حالت کو چھوڑ کر ادھر جائیں کہ جہاں انھیں اچانک پہنچنا ہے اور بہر صورت وہاں جانا ہے۔۔۔"

حضرت عمر، پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا آپ ایک بوریے پر آرام فرما رہے ہیں اور آپ کے پہلو پر اسکا نشان بن گیا ہے تو عرض کی اے نبی خدا:

﴿یانبیّ الله، لواتخذت فراشاً أوثر منه؟ فقال (ص): مالی وللدنیا، مامثلی ومثَل الدنیا الا کراکب سارفی یوم صائف فاستظلّ تحت شجرة ساعة من نهار، ثم راح وترکها﴾(۱)

اگر آپ اس سے بہتر بستر بچھا لیتے تو کیا تھا؟ پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: "دنیا سے میرا کیا تعلق؟ میری اور دنیا کی مثال ایک سوار کی سی ہے جو تیز ہواؤں کے درمیان چلا جا رہا ہو اور دن میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے کسی سایہ دار درخت کے نیچے رک جائے اور پھر اس جگہ کو چھوڑ کر آگے بڑھ جائے"

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۳ ص ۱۲۳۔

امیرالمومنین حضرت علی ؑ کا ارشاد ہے:

﴿ان الدنیا لیست بدار قرار ولا محلّ اقامة، انّما أنتم فیها کرکب عرّسوا وارتاحوا، ثم استقلّوا فغدوا وراحوا، دخلوها خفافاً، وارتحلوا عنها ثقالاً، فلم یجدوا عنها نزوعاً، ولا الی ما ترکوا بها رجوعاً﴾(۱)

''یہ دنیا دارالقرار اور دائمی قیام گاہ نہیں ہے تم یہاں سوار کی مانند ہو جنہوں نے کچھ دیر کیلئے خیمہ لگایا اور پھر چل پڑے پھر دوسری منزل پر تھوڑا آرام کیا اور صبح ہوتے ہی کوچ کر گئے، ہلکے پھلکے (آسانی سے) اترے اور لاد پھاند کر مشکل سے روانہ ہوئے نہ انہیں اسکا کبھی اشتیاق ہوا اور جس کو ترک کر کے آ گئے نہ اسکی طرف واپسی ممکن ہوئی''

نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا گیا: انسان دنیا میں کیسے زندگی بسر کرے؟ آپ نے فرمایا جیسے قافلہ گذرتا ہے۔ دریافت کیا گیا اس دنیا میں قیام کتنا ہے؟ آپ نے فرمایا جتنی دیر قافلہ سے چھوٹ جانے والا رہتا ہے۔ دریافت کیا گیا! دنیا وآخرت میں فاصلہ کتنا ہے؟ آپ نے فرمایا پلک جھپکنے کا۔ (۲) اور اس آیہ کریمہ کی تلاوت فرمائی:

﴿کأنّهم یوم یرون ما یوعدون لم یلبثوا الاساعة من نهار﴾(۳)

''تو ایسا محسوس کریںگے جیسے دنیا میں ایک دن کی ایک گھڑی ہی ٹھہرے ہیں''

امیرالمومنین حضرت علی ؑ کا ارشاد ہے:

﴿الدنیا ظلّ الغمام، وحلم المنام﴾(۴)

---

(۱) بحارالانوار ج ۷۸ ص ۱۸۔

(۲) بحارالانوار ج ۷۳ ص ۱۲۲۔

(۳) سورۂ احقاف آیت ۳۵۔

(۴) غررالحکم ج ۱ ص ۱۰۲۔

"دنیا بادل کا سایہ اور سونے والے کا خواب ہے"

امام محمد باقرؑ نے فرمایا:

﴿انّ الدنیا عند العلماء مثل الظل﴾(۱)

"اہل علم کے نزدیک دنیا سایہ کے مانند ہے"

امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

﴿ألا و ان الدنیا دار لا یسلم منها الا فیها، ولا ینجیٰ بشیء کان لها، اُبتلی الناس فیها فتنة فما أخذوه منها لها أخرجوا منه وحوسبوا علیه، وما أخذوهُ منها لغیرها، قدموا علیه وأقاموا فیه، فانها عند ذوی العقول کفیء الظلّ بینا تراه سابغاً حتیٰ قلص، وزائداً حتیٰ نقص﴾(۲)

"یادرکھو یہ دنیا ایسا گھر ہے جس سے سلامتی کا سامان اسی کے اندر سے کیا جا سکتا ہے اور کوئی ایسی شے وسیلہ نجات نہیں ہو سکتی ہے جو دنیا ہی کے لئے ہو۔ لوگ اس دنیا کے ذریعہ آزمائے جاتے ہیں جو لوگ دنیا کا سامان دنیا ہی کے لئے حاصل کرتے ہیں وہ وہاں جا کر پالیتے ہیں اور اسی میں مقیم ہو جاتے ہیں۔ یہ دنیا درحقیقت صاحبان عقل کی نظر میں ایک سایہ جیسی ہے جو دیکھتے دیکھتے سمٹ جاتا ہے اور پھیلتے پھیلتے کم ہو جاتا ہے"

دنیا ایک پل

دین اسلام مسلمان کو دنیا کے بارے میں ایک ایسے نظریہ کا حامل بنانا چاہتا ہے کہ اگر اسکے دل میں یہ عقیدہ و نظریہ راسخ ہو جائے تو پھر دنیا کو ایک ایسے پل کے مانند سمجھے گا جس کے اوپر سے گذر

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۸ ص ۱۲۶۔

(۲) نہج البلاغہ خطبہ ۶۳۔

کراسے جانا ہے اور اس مسلمان کی نگاہ میں یہ دنیا دارالقرار نہیں ہوگی ۔ جب ایسا عقیدہ ہوگا تو خود بخود مسلمان دنیا پر فریفتہ نہ ہوگا اور اسکی عملی زندگی میں بھی اس کے نتائج نمایاں نظر آئیں گے۔

حضرت عیسیٰؑ کا ارشاد ہے:

﴿انما الدنیا قنطرة﴾(۱)

''دنیا ایک پل ہے''

امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿أیھاالناس انماالدنیادارمجازوالآخرة دار قرار، فخذوا من ممرّکم لمقرّکم، ولا تھتکوا أستارکم عند من یعلم أسرارکم﴾(۲)

''اے لوگو! یہ دنیا گذرگاہ ہے اور آخرت دار قرار ہے لہٰذا اپنے راستہ سے اپنے ٹھکانے کے لئے توشہ اکٹھا کرلو اور جو تمہارے اسرار کو جانتا ہے اس کے سامنے اپنے پردوں کو چاک نہ کرو''

آپ ہی کا ارشاد گرامی ہے:

﴿الدنیا دار ممرّ ولا دار مقرّ، والناس فیھا رجلان: رجل باع نفسه فاوبقھا، ورجل ابتاع نفسه فاعتقھا﴾(۳)

''دنیا گذرگاہ ہے دارالقرار نہیں اس میں دو طرح کے لوگ رہتے ہیں کچھ وہ ہیں جنھوں نے دنیا کے ہاتھوں اپنا نفس بیچ دیا تو وہ دنیا کے غلام ہوگئے کچھ وہ ہیں جنھوں نے اپنے نفس کو خرید لیا اور دنیا کو آزاد کردیا''

---

(۱) بحارالانوار ج۱۴ص ۳۱۹۔

(۲) نہج البلاغہ خطبہ ۲۰۳۔

(۳) شرح نہج البلاغہ ج۱۸ص ۳۲۹۔

اسباب ونتائج کا رابطہ

اسلامی فکر کا امتیاز یہ ہے کہ وہ انسانی مسائل سے متعلق اسباب ونتائج کو ایک دوسرے سے لاتعلق قرار نہیں دیتی بلکہ انھیں آپس میں ملاکر دیکھنے اور پھر اس سے نتیجہ اخذ کرنے کی قائل ہے جب ہم انسانی اسباب ونتائج کے بارے میں غور کرتے ہیں تو ان مسائل میں اکثر دوطرفہ رابطہ نظر آتا ہے یعنی دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ انسانی مسائل میں ایسے دوطرفہ رابطوں کی مثالیں بکثرت موجود ہیں مثلاً آپ زہد اور بصیرت کو ہی دیکھئے کہ زہد سے بصیرت اور بصیرت سے زہد میں اضافہ ہوتا ہے۔

یہاں پر ہم ان دونوں سے متعلق چند روایات پیش کررہے ہیں۔

زہدو بصیرت

﴿أفمن شرح اللّٰہ صدرہ للاسلام فھو علیٰ نورٍ من ربّہ﴾ کی تفسیر کے ذیل میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

﴿ان النور اذاوقع فی القلب انفسح لہ وانشرح﴾،قالوا یارسول اللّٰہ: فھل لذٰلک علامۃیعرف بھا؟قال:﴿التجافی من دارالغرور،والانابۃ الیٰ دارالخلود، والاستعداد للموت قبل نزول الموت﴾

''قلب پر جب نور کی تابش ہوتی ہے تو قلب کشادہ ہوجاتا ہے اور اس میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے عرض کیا گیا یارسول اللہ اسکی پہچان کیا ہے؟

آپ نے فرمایا:

''دارالغرور (دنیا) سے دوری، دارالخلود (آخرت) کی طرف رجوع اور موت آنے سے

پہلے اسکے لئے آمادہ ہو جاتا ہے"(۱)

امیر المومنین حضرت علی " کا ارشاد ہے:

﴿أحق الناس بالزهادة،من عرف نقص الدنيا﴾(۲)

"جو دنیا کے نقائص سے آگاہ ہے اسے زیادہ زاہد ہونا چاہئے"

آپ ہی کا ارشاد گرامی ہے:

﴿من صوّر الموت بين عينيه،هان أمر الدنيا عليه﴾(۳)

"جس کی دونوں آنکھوں کے سامنے موت کھڑی رہتی ہے اس کے لئے دنیا کے امور آسان ہو جاتے ہیں"

نیز آپ نے فرمایا:﴿زهدالمرء فيمايفنی،علی قدر يقينه فيما يبقی﴾(۴)

"فانی اشیاء(دنیا) کے بارے میں انسان اتنا ہی زاہد ہوتا ہے جتنا اسے باقی اشیاء (آخرت) کے بارے میں یقین ہوتا ہے"

زہد و بصیرت کا رابطہ

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت ابوذر (رح) سے فرمایا:

﴿یاأباذر:مازهد عبد في الدنيا،الاأنبت الله الحكمة في قلبه،وأنطق بهالسانه ،ويبصّره عيوب الدنيا وداء ها ودواء ها،وأخرجه منهاسالماًالی دارالسلام﴾(۵)

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۳ ص ۱۲۲۔

(۲) غرر الحکم۔

(۳) غرر الحکم۔

(۴) بحار الانوار ج ۷۰ ص ۳۱۹۔

(۵) بحار الانوار ج ۷۷ ص ۸۔

''اے ابوذر جو شخص بھی زہد اختیار کرتا ہے اللہ اس کے قلب میں حکمت کا پودا اگا دیتا ہے اور اسے اسکی زبان پر جاری کردیتا ہے اسے دنیا کے عیوب، اور درد کے ساتھ انکا علاج بھی دکھا دیتا ہے اور اسے دنیا سے سلامتی کے ساتھ دار السلام لے جاتا ہے''

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے:

﴿من یرغب فی الدنیا فطال فیھا أملہ، أعمیٰ اللہ قلبہ علیٰ قدر رغبتہ فیھا، ومن زھد فیھا فقصُر أملہ أعطاہ اللہ علماً بغیر تعلّم، وھدیً بغیر ھدایۃ، وأذھب عنہ العماء وجعلہ بصیراً﴾(۱)

جو دنیا سے رغبت رکھتا ہے اسکی آرزوئیں طویل ہوجاتی ہیں اور وہ جتنا راغب ہوتا ہے اسی مقدار میں خدا اسکے قلب کو اندھا کردیتا ہے اور جو زہد اختیار کرتا ہے اسکی آرزوئیں قلیل ہوتی ہیں اللہ اسے تعلیم کے بغیر علم اور رہنمائی کے بغیر ہدایت عطا کرتا ہے اور اس کے اندھے پن کو ختم کرکے اسے بصیر بنا دیتا ہے''

ایک دن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے درمیان آئے اور فرمایا:

﴿ھل منکم من یرید أن یؤتیہ اللہ علماً بغیر تعلّم، وھدیاً بغیر ھدایۃ؟ ھل منکم من یرید أن یذھب عنہ العمیٰ و یجعلہ بصیراً؟ ألا انہ من زھد فی الدنیا، وقصر أملہ فیھا، أعطاہ اللہ علماً بغیر تعلّم، وھدیاً بغیر ھدایۃ﴾(۲)

''کیا تم میں سے کوئی اس بات کا خواہاں ہے کہ اللہ اسے تعلیم کے بغیر علم اور رہنمائی کے بغیر ہدایت دیدے۔ تم میں سے کوئی اس بات کا خواہاں ہے کہ اللہ اس کے اندھے پن کو دور کرکے اسے بصیر بنادے؟ آگاہ ہوجاؤ جو شخص بھی دنیا میں زہد اختیار کرے گا اور اپنی آرزوئیں قلیل رکھے گا

---

(۱) بحار الانوار ج۷۷ص۲۶۳۔

(۲) در المنثور ج۱ص۶۷۔

اللہ اسے تعلیم کے بغیر علم اور رہنمائی کے بغیر ہدایت عطا کرے گا''

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

﴿یاأباذر اذا رأیت أخاك قدزھد فی الدنیا فاستمع منه،فانه یُلقیٰ الحکمة﴾(۱)

''اے ابوذر اگر تم اپنے کسی بھائی کو دیکھو کہ وہ دنیا میں زاہد ہے تو اسکی باتوں کو (دھیان سے) سنو کیونکہ اسے حکمت عطا کی گئی ہے''

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ زہد و بصیرت میں دو طرفہ رابطہ ہے، یعنی زہد کا نتیجہ بصیرت اور بصیرت کا نتیجہ زہد ہے۔ اسی طرح زہد اور قلتِ آرزو کے مابین بھی دو طرفہ رابطہ ہے زہد سے آرزوؤں میں کمی اور اس کمی سے زہد پیدا ہوتا ہے زہد اور قلت آرزو کے درمیان رابطہ کے بارے میں امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے: ﴿الزھد یخلق الابدان،ویحدّد الآمال،ویقرّب المنیة،ویباعد الاُمنیة،من ظفر به نصب،ومن فاته تعب﴾(۲)

''زہد، بدن کو مناسب اور معتدل، آرزوؤں کو محدود، موت کو نگاہوں سے نزدیک اور تمناؤں کو انسان سے دور کر دیتا ہے جو اسکو پانے میں کامیاب ہوگیا وہ خوش نصیب ہے اور جو اسے کھو بیٹھا وہ دردسر میں مبتلا ہوگیا''

آرزوؤں کی کمی اور زہد کے رابطہ کے بارے میں امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے:

﴿استجلب حلاوة الزھادة بقصر الامل﴾(۳)

''آرزو کی قلت سے زہد کی حلاوت حاصل کرو''

ان متضاد صفات کے درمیان دو طرفہ رابطہ کا بیان اسلامی فکر کے امتیازات میں سے ہے۔

---

(۱) بحار الانوار ج۷۷ص۸۰۔

(۲) بحار الانوار ج۷۰ص۳۱۷۔

(۳) بحار الانوار ج۷۸ص۱٦۴۔

زہد و بصیرت یا زہد و قلتِ آرزو کے درمیان دو طرفہ رابطہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں کے اندر ایک دوسرے کے ذریعہ اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اس سے انسان ترقی کرتا رہتا ہے۔اس طرح کہ بصیرت سے زہد کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور جب انسان زاہد ہو جاتا ہے تو بصیرت کے اعلیٰ مراتب حاصل ہو جاتے ہیں نیز بصیرت کے ان اعلیٰ مراتب سے زہد میں اضافہ ہوتا ہے اور اس زہد سے پھر بصیرت کے مزید اعلیٰ مراتب وجود پاتے ہیں۔اسطرح انسان ان دونوں صفات وکمالات کے ذریعہ بلندیوں تک پہنچ جاتا ہے۔

مذموم دنیا اور ممدوح دنیا

ا۔مذموم دنیا

اس سے قبل ہم نے ذکر کیا تھا کہ دنیا کے دو چہرے ہیں:

(۱) ظاہری

(۲) باطنی

دنیا کا ظاہری چہرہ فریب کا سرچشمہ ہے۔یہ چہرہ انسانی نفس میں حب دنیا کا جذبہ پیدا کرتا ہے جبکہ باطنی چہرہ ذریعۂ عبرت ہے یہ انسان کے نفس میں زہد کا باعث ہوتا ہے روایات کے مطابق دنیا کا ظاہری چہرہ مذموم ہے اور باطنی چہرہ ممدوح ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ واقعاً دنیا کے دو چہرے ہیں یہ فرق در حقیقت دنیا کو دیکھنے کے انداز سے پیدا ہوتا ہے ورنہ دنیا اور اسکی حقیقت ایک ہی ہے۔فریب خوردہ نگاہ سے اگر دنیا کو دیکھا جائے تو یہ دنیا مذموم ہو جاتی ہے اور اگر دیدۂ عبرت سے دنیا پر نگاہ کی جائے تو یہی دنیا ممدوح قرار پاتی ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ لذات وخواہشات سے لبریز دنیا کا ظاہری چہرہ ہی مذموم ہے۔

یہاں پر دنیا کے مذموم رخ کے بارے میں چند روایات پیش کی جا رہی ہیں۔

امیرالمومنین حضرت علیؑ نے فرمایا:

﴿الدنیا سوق الخسران﴾(۱)

''دنیا گھاٹے کا بازار ہے''

آپ ہی کا ارشاد ہے:

﴿الدنیا مصرع العقول﴾(۲)

''دنیا عقلوں کا میدان جنگ ہے''

آپ کا ہی ارشاد ہے:

﴿الدنیا ضحکة مستعبر﴾(۳)

''دنیا چشم گریاں رکھنے والے کے لئے ایک ہنسی ہے''

آپ ہی کا ارشاد ہے:

﴿الدنیا مُطَلَّقةُ الاکیاس﴾(۴)

''دنیا ذہین لوگوں کی طلاق شدہ بیوی ہے''

آپ ہی کا ارشاد ہے:

﴿الدنیا معدن الشرور، ومحل الغرور﴾(۵)

''دنیا شر وفساد کا معدن اور دھوکے کی جگہ ہے''

---

(۱) غررالحکم ج۱ص۲۶۔

(۲) غررالحکم ج۱ص۴۵۔

(۳) غررالحکم ج۱ص۲۶۔

(۴) غررالحکم ج۱ص۴۸۔

(۵) غررالحکم ج۱ص۷۳۔

آپ ہی کا ارشاد ہے:

﴿الدنیا لا تصفو لشارب، ولا تفی لصاحب﴾(۱)

''دنیا کسی پینے والے کے لئے صاف وشفاف اور کسی کے لئے باوفا ساتھی نہیں ہے''

آپ ہی کا ارشاد ہے:

﴿الدنیا مزرعة الشر﴾(۲)

''دنیا شر وفساد کی کاشت کی جگہ ہے''

آپ ہی کا ارشاد ہے:

﴿الدنیا مُنیة الاشقیاء﴾(۳)

''دنیا اشقیا کی آرزو ہے''

آپ ہی کا ارشاد ہے:

﴿الد نیا تُسْلِمُ﴾(۴)

''دنیا دوسرے کے حوالے کردیتی ہے''

آپ ہی کا ارشاد ہے:

﴿الدنیا تُذِلُّ﴾(۵)

''دنیا ذلیل کرنے والی ہے''

---

(۱)غرر الحکم ج۱ص۸۵۔

(۲)غرر الحکم ج۱ص۲۶۔

(۳)غرر الحکم ج۱ص۳۷۔

(۴)غرر الحکم ج۱ص۱۱۔

(۵)غرر الحکم ج۱ص۱۱۔

دنیا سے بچاؤ

امیر المومنین حضرت علیؑ ہمیں دنیا سے اس انداز سے ڈراتے ہیں:

﴿أُحذّرکم الدنیافانّھالیست بدار غبطة،قدتزیّنت بغرورھا،وغرّت بزینتھالمن ان ینظر الیھا﴾(۱)

''میں تمہیں دنیا سے ڈراتا ہوں کیونکہ یہ فخر ومباہات کا گھر نہیں ہے۔یہ اپنے فریب سے مزین ہے اور جو شخص اسکی طرف دیکھتا ہے اسے اپنی زینت سے دھوکے میں مبتلا کردیتی ہے''

ایک اور مقام پر آپ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿أُحذّرکم الدنیافانھا حُلوة خضرة،حُفّت بالشھوات﴾(۲)

''میں تمہیں اس دنیا سے بچنے کی تاکید کرتا ہوں کہ یہ دنیا سرسبز وشیریں اور شہوتوں سے گھری ہوئی ہے''

آپ ہی کا ارشاد ہے:

﴿احذروا ھذہ الدنیا،الخداعة الغدّار ة،التی قد تزیّنت بحلیّھا،وفتنت بغرورھا،فأصبحت کالعروسة المجلوة،والعیون الیھا ناظرة﴾(۳)

''اس دھوکے باز مکار دنیا سے بچو یہ دنیا زیورات سے آراستہ اور فتنہ سامانیوں کی وجہ سے سجی سجائی دلہن کی مانند ہے کہ آنکھیں اسی کی طرف لگی رہتی ہیں''

ب:ممدوح دنیا

دنیا کا دوسرا رخ اور اس کے بارے میں جو دوسرا نظریہ ہے وہ قابل مدح وستائش ہے البتہ

---

(۱)بحارالانوار ج۷۸ص۲۱۔

(۲)بحارالانوار ج۷۳ص۹۶۔

(۳)بحارالانوار ج۷۳ص۱۰۸۔

یہ قابل ستائش رخ اس دنیا کے باطن سے نکلتا ہے جو قابل زوال ہے جبکہ مذموم رخ ظاہری دنیا سے متعلق تھا۔

بہر حال یہ طے شدہ بات ہے کہ دنیا کے دو رخ ہیں ایک ممدوح اور دوسرا مذموم۔ ممدوح رخ کے اعتبار سے دنیا نقصان دہ نہیں ہے بلکہ نفع بخش ہے اور مضر ہونے کے بجائے مفید ہے اسی رخ سے دنیا آخرت تک پہونچانے والی، مومن کی سواری، دار صدق اور اولیاء کی تجارت گاہ ہے۔ لہٰذا دنیا کے اس رخ کی مذمت صحیح نہیں ہے روایات کے آئینہ میں دنیا کے اس رخ کو بھی ملاحظہ فرمائیں۔

ا۔ دنیا آخرت تک پہونچانے والی

امام زین العابدینؑ نے فرمایا:

﴿الدنیا دنیاء ان، دنیا بلاغ، و دنیا ملعونة﴾(۱)

"دنیا کی دو قسمیں ہیں؟ دنیائے بلاغ اور دنیائے ملعونہ"

دنیائے بلاغ سے مراد یہ ہے کہ دنیا انسان کو آخرت تک پہونچاتی ہے اور خدا تک رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ بلاغ کے یہی معنی ہیں اور یہ دنیا کی پہلی قسم ہے۔

دوسری دنیا جو ملعون ہے وہ دنیا وہ ہے جو انسان کو اللہ سے دور کرتی ہے اس لئے کہ لعن بھگانے اور دور کرنے کو کہتے ہیں اب ہر انسان کی دنیا انھیں دو میں سے کوئی ایک ضرور ہے یا وہ دنیا جو خدا تک پہونچاتی ہے یا وہ دنیا جو خدا سے دور کرتی ہے۔

اسی سے ایک حقیقت اور واضح ہو جاتی ہے کہ انسان دنیا میں کسی ایک مقام پر ٹھہرا نہیں رہتا ہے بلکہ یا تو وہ قرب خدا کی منزلیں طے کرتا رہتا ہے یا پھر اس سے دور ہوتا جاتا ہے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۳ ص ۲۰۔

﴿لاتسألوا فیها فوق الکفاف، ولاتطلبوا منها أکثر من البلاغ﴾(۱)

''اس دنیا میں ضرورت سے زیادہ کا سوال مت کرو اور نہ ہی کفایت بھر سے زیادہ کا مطالبہ کرو''

اس طرح اس دنیا کا مقصد (بلاغ) ہے اور انسان دنیا میں جو بھی مال ومتاع حاصل کرتا ہے وہ صرف اس مقصد تک پہونچنے کیلئے ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے اس طرح انسان کی ذمہ داری ہے کہ دنیا میں صرف اتنا ہی طلب کرے جس سے اپنے مقصود تک پہنچ سکے لہٰذا اس مقدار سے زیادہ مانگنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی وسیلہ کو مقصد بنانا چاہئے اور یہ یاد رکھنا چاہئے کہ دنیا وسیلہ ہے آخری مقصد نہیں ہے بلکہ آخری مقصد آخرت اور خدا تک رسائی ہے۔

امیرالمومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

﴿الدنیا خلقت لغیرها، ولم تخلق لنفسها﴾(۲)

''دنیا اپنے لئے نہیں بلکہ اپنے غیر (آخرت تک رسائی) کیلئے خلق کی گئی ہے''

وسیلہ کو مقصد قرار دے دیا جائے یہ بھی غلط ہے اسی طرح واسطہ کو وسیلہ اور مقصد (دونوں) قرار دینا بھی غلط ہے اسی لئے امیرالمومنینؑ نے فرمایا ہے کہ دنیا کو صرف اس مقدار میں طلب کرو جس سے آخرت تک پہونچ سکو۔

لیکن خود حصول دنیا کے سلسلہ میں آپؑ نے فرمایا کہ صرف بقدر ضرورت سوال کرو۔امامؑ کے اس مختصر سے جملے میں حصول رزق کے لئے سعی وکوشش کے سلسلہ میں اسلام کا مکمل نظریہ موجود ہے۔چونکہ مال ومتاع دنیا آخرت تک پہنچنے کا ذریعہ ہے لہٰذا کسب معاش اور تحصیل رزق ضروری ہے لیکن اس تلاش وجستجو میں ''بقدر ضرورت'' کا خیال رکھنا ضروری ہے اور ''بقدر'' ضرورت سے مراد وہ

---

(۱)بحارالانوار ج۷۳ص۸۱۔

(۲)نہج البلاغہ حکمت ۴۵۵۔

مقدار ہے کہ جس کے ذریعہ دنیاوی زندگی کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں اور آخرت تک رسائی ہو سکے انسانی ضرورت واقعی اور ضروری بھی ہوتی ہے اور غیر واقعی یا وہمی بھی ۔ یعنی اسے زندہ رہنے اور آخرت تک رسائی کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ حقیقی ضرورتیں ہیں ۔ اوران کے علاوہ کچھ غیر ضروری چیزیں بھی احتیاج وضرورت کی شکل میں انسان کے سامنے آتی ہیں جو درحقیقت حرص وطمع ہے اوران کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے اگر انسان ایک مرتبہ ان کی گرفت میں آ گیا تو پھران کی کوئی انتہا نہیں ہوتی ۔ ان کی راہ میں جدوجہد کرتے ہوئے انسان ہلاک ہوجاتا ہے مگراس جدوجہد سے اذیت وطمع میں اضافہ ہی ہوتا ہے ۔

حضرت امام جعفرصادق ؑ نے اپنے جد بزرگوار حضرت علی ؑ کا یہ قول نقل فرمایا ہے:

﴿یابن آدم: ان کنت ترید من الدنیاما یکفیك فان أیسر ما فیھا یکفیك، و ان کنت انما ترید مالا یکفیك فان کل ما فیھایکفیك(۱)

''اے فرزند آدم اگر تو دنیا سے بقدرضرورت کا خواہاں ہے تو تھوڑا بہت، جو کچھ تیرے پاس ہے وہی کافی ہے اور اگر تو اتنی مقدار میں دنیا کا خواہاں ہے جو تیری ضرورت سے زیادہ ہے تو پھر دنیا میں جو کچھ ہے وہ بھی ناکافی ہے''

دنیا کے بارے میں یہ دقیق نظریہ متعدد اسلامی روایات اوراحادیث میں وارد ہوا ہے ۔

امیرالمومنین حضرت علی ؑ کا ارشاد ہے:

﴿ألا وان الدنیادار لا یُسلَم منھا الا فیھا، ولاینجیٰ بشیء کان لھا، ابتلی الناس بھا فتنة، فما أخذوہ منھا لھا اُخرجوا منہ وحوسبوا علیہ،

---

(۱)اصول کافی ج۲ص ۱۳۸۔

وما أخذوه منهالغيرها قدموا عليه و أقاموا فيه﴾(۱)

''آگاہ ہو جاؤ کہ یہ دنیا ایسا گھر ہے جس سے سلامتی کا سامان اسی کے اندر سے کیا جاسکتا ہے اور کوئی ایسی شئے وسیلۂ نجات نہیں ہو سکتی ہے جو دنیا ہی کے لئے ہو۔لوگ اس دنیا کے ذریعہ آزمائے جاتے ہیں۔جو لوگ دنیا کا سامان ،دنیا ہی کیلئے حاصل کرتے ہیں وہ اسے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور پھر حساب بھی دینا ہوتا ہے اور جو لوگ یہاں سے وہاں کیلئے حاصل کرتے ہیں وہ وہاں جا کر پالیتے ہیں اور اسی میں مقیم ہو جاتے ہے یہ دنیا درحقیقت صاحبان عقل کی نظر میں ایک سایہ جیسی ہے جو دیکھتے دیکھتے سمٹ جاتا ہے اور پھیلتے پھیلتے کم ہو جاتا ہے''

ان کلمات میں اختصار کے باوجود بے شمار معانی ومطالب پائے جاتے ہیں ﴿دار لایسلم منها الا فیها ﴾اس فقرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان سے فرار اور خدا تک رسائی کے لئے دنیا مومن کی سواری ہے اس کے بغیر اسکی بارگاہ میں رسائی ممکن نہیں ہے عجیب وغریب بات ہے کہ دنیا اور لوگوں سے کنارہ کشی کرنے والا قرب خدا کی منزل مقصود تک نہیں پہونچ سکتا بلکہ اللہ یہ چاہتا ہے کہ بندہ اسی دنیا میں رہ کر اسی دنیا کے سہارے اپنی منزل مقصود حاصل کرے۔لہٰذا ان کلمات سے پہلی حقیقت تو یہ آشکار ہوئی ہے کہ دنیا واسطہ اور وسیلہ ہے اس کو نظر انداز کر کے مقصد حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ دنیا مقصد نہ بننے پائے۔اگر انسان دنیا کو وسیلہ کے بجائے ہدف اور مقصد بنالے گا تو ہرگز نجات حاصل نہیں کرسکتا ﴿ولا ینجی لشی کان لها ﴾اس طرح اگر انسان نے دنیا کو اس کی اصل حیثیت ''واسطہ ووسیلہ'' سے الگ کر دیا اور اسی کو ہدف بنالیا تو پھر دنیا شیطان سے نجات اور خدا تک پہنچانے کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہے یہ دوسری حقیقت ہے جو ان

---

(۱) نہج البلاغہ خطبہ ۶۲۔

کلمات میں موجود ہے۔

اور پھر اگر انسان دنیا کو خدا، قرب خدا اور رضائے الٰہی حاصل کرنے کے بجائے خود دنیا کی خاطر اپناتا ہے تو یہی دنیا اسکو خدا سے دور کردیتی ہے۔ اس دنیا کا بھی عجیب وغریب معاملہ ہے یعنی اگر انسان اسے وسیلہ اور خدا تک رسائی کا ذریعہ قرار دیتا ہے تو یہ دنیا اس کے لئے ذخیرہ بن جاتی ہے اور اس کے لئے باقی رہتی ہے نیز دنیا و آخرت میں اس کے کام آتی ہے لیکن اگر وسیلہ کے بجائے اسے مقصد بنالے تو یہ اللہ سے غافل کرتی ہے۔ خدا سے دور کردیتی ہے موت کے بعد انسان سے جدا ہوجاتی ہے اور بارگاہ الٰہی میں اسکا سخت ترین حساب لیا جاتا ہے۔

یہ بھی پیش نظر رہے کہ یہ فرق کمیت اور مقدار کا نہیں ہے بلکہ کیفیت کا ہے اور عین ممکن ہے کہ انسان وسیع وعریض دنیا کا مالک ہو لیکن اسکا استعمال راہ خدا میں کرتا ہو اس کے ذریعہ قرب خدا کی منزلیں طے کرتا ہو ایسی صورت میں یہ دنیا اس کے لئے ''عمل صالح'' شمار ہوگی اس کے برخلاف ہوسکتا ہے کہ مختصر سی دنیا اور اسباب دنیا ہی انسان کے پاس ہوں لیکن اسکا مقصد خود ہی دنیا ہو تو یہ دنیا اس سے چھین لی جائے گی اسکا محاسبہ کیا جائے گا۔ یہ ہے ان کلمات کا تیسرا نتیجہ۔

اگر خود ہی دنیا انسان کے مدنظر ہو تو اسکی حیثیت ''عاجل'' ''نقد'' کی سی ہے جو کہ اسی دنیا تک محدود ہے اور اس کا سلسلہ آخرت سے متصل نہ ہوگا بلکہ زائل ہو کر جلد ختم ہوجائے گی لیکن اگر دنیا کو دوسرے (آخرت) کے لئے اختیار کیا جائے تو اسکی حیثیت ''آجل'' ''ادھار'' کی سی ہوگی کہ جب انسان حضور پروردگار میں پہونچے گا تو وہاں دنیا کو حاضر وموجود پائے گا۔ ایسی دنیا زائل ہونے والی نہیں بلکہ باقی رہے گی ''وما عند اللہ خیر و أبقی'' امیرالمومنین کے اس فقرہ ''وما أخذوہ منہا لغیرہا قدموا علیہ و أقاموا فیہ'' سے یہ چوتھا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔

زیارت امام حسینؑ سے متعلق دعا میں نقل ہوا ہے:

﴿ولا تشغلني بالاكثار عليّ من الدنيا،تلهيني عجائب بهجتها،وتفتنني زهرات زينتها،ولا باقلالٍ يضرّ بعملي،ويملأ صدري همّه﴾(۱)

''کثرت دنیا سے میرے قلب کو مشغول نہ کردینا کہ اسکے عجائبات مجھے تیری یاد سے غافل کردیں یا اسکی زینتیں مجھے اپنے فریب میں لے لیں اور نہ ہی دنیا میں میرا حصہ اتنا کم قرار دینا کہ میرے اعمال متاثر ہوجائیں اور میرا دل اسی کے ہم وغم میں مبتلا رہے''

دنیا اور اس سے انسان کے تعلق، بقاء وزوال، اسکے مفید ومضر ہونے کے بارے میں اس سے قبل جو کچھ بیان کیا گیا وہ کیفیت کے اعتبار سے تھا کمیت ومقدار سے اسکا تعلق نہیں تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ کمیت ومقدار بھی اس میں دخیل ہے کثرت دنیا اور اسکی آسائشیں انسان کو اپنے میں مشغول کرکے یاد خدا سے غافل بنادیتی ہیں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ دنیا میں بڑا حصہ ہونے کے باوجود انسان دنیا میں گم نہ ہو یا یہ زیادتی اسے خدا سے دور نہ کردے اسکے لئے سخت جدوجہد درکار ہوتی ہے اور اسی طرح اگر دنیاوی حصہ کم ہو، دنیا روگردانی کررہی ہو تو یہ بھی انسان کی آزمائش کا ایک انداز ہوتا ہے کہ انسان کا ہم وغم اور اس کی فکریں دنیا کے بارے میں ہوتی ہیں اور وہ خدا کو بھول جاتا ہے اسی لئے اس دعا میں حدمتوسط کا مطالبہ کیا گیا ہے کہ نہ تو اتنی کثرت ہو جس سے انسان یاد خدا سے غافل ہوجائے اور نہ اتنی قلت ہو کہ انسان اسی کی تلاش میں سرگرداں رہے اور خدا کو بھول بیٹھے۔

۲۔ دنیا مومن کی سواری

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے:

﴿لاتسبّوا الدنيا فنعمت مطية المؤمن،فعليها يبلغ الخير وبها ينجو من الشر﴾(۲)

---

(۱) بحار الانوار ج۱۰۱ص ۲۰۸۔

(۲) بحار الانوار ج۷۷ص ۱۷۸۔

"دنیا کو برا مت کہو یہ مومن کی بہترین سواری ہے اسی پر سوار ہو کر خیر تک پہنچا جاتا ہے اور اسی کے ذریعہ شر سے نجات حاصل ہوتی ہے"

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ دنیا سواری کی حیثیت رکھتی ہے جس پر سوار ہو کر انسان خدا تک پہو نچتا اور جہنم سے فرار اختیار کرتا ہے۔

یہ دنیا کا قابل ستائش رخ ہے اگر دنیا نہ ہوتی تو انسان رضائے الٰہی کے کام کیسے بجالاتا، کیسے خدا تک پہو نچتا؟ اولیاء خدا اگر قرب خداوندی کے بلند مقامات تک پہو نچے ہیں تو وہ بھی اسی دنیا کے سہارے سے پہو نچے ہیں۔

۳۔ دنیا صداقت واعتبار کا گھر ہے۔

۴۔ دنیا دار عافیت۔

۵۔ دنیا استغنا اور زاد راہ حاصل کرنے کی جگہ ہے۔

۶۔ دنیا موعظہ کا مقام ہے۔

۷۔ دنیا محبان خدا کی مسجد ہے۔

۸۔ دنیا اولیاء الٰہی کے لئے محل تجارت ہے۔

امیر المومنین حضرت علی ؑ نے جب ایک شخص کو دنیا کی مذمت کرتے ہوئے سنا تو فرمایا:

﴿أيها الذام للدنيا المغترّ بغرورها المنخدع بأباطيلها! أتغتر بالدنيا ثم تذمها، أنت المتجرّم عليها أم هي المتجرّمة عليك؟ متى استهوتك؟ أم متى غرّتك؟...﴾(۱)

"اے دنیا کی مذمت کرنے والے اور اسکے فریب میں مبتلا ہو کر اسکے مہملات میں دھوکا کھا

---

(۱) نہج البلاغہ حکمت ۱۲۶۔

جانے والے! تو اسی سے دھوکا بھی کھاتا ہے اور اسکی مذمت بھی کرتا ہے؟ یہ بتاؤ کہ تجھے اس پر الزام لگانے کا حق ہے یا اسے تجھ پر الزام لگانے کا حق ہے؟ آخر اس نے کیا تجھ سے تیری عقل کو چھین لیا تھا اور کب تجھ کو دھوکہ دیا تھا؟ کیا تیرے آباء واجداد کی کہنگی کی بناء پر گرنے سے دھوکا دیا ہے یا تمہاری ماؤں کی زیر خاک خواب گاہ سے دھوکا دیا ہے؟ کتنے بیمار ہیں جن کی تم نے تیمارداری کی ہے اور اپنے ہاتھوں سے انکا علاج کیا ہے اور چاہا کہ وہ شفایاب ہو جائیں اور اطباء سے رجوع بھی کیا ہے۔ اس صبح کے ہنگام جب نہ کوئی دوا کام آ رہی تھی اور نہ رونا دھونا فائدہ پہنچا رہا تھا۔ نہ تمہاری ہمدردی کسی کو کوئی فائدہ پہنچا سکی اور نہ تمہارا مقصد حاصل ہو سکا اور نہ تم موت کو دفع کر سکے۔ اس صورت حال میں دنیا نے تم کو اپنی حقیقت دکھلا دی تھی اور تمھیں تمہاری ہلاکت سے آگاہ کر دیا تھا (لیکن تمھیں ہوش نہ آیا) یاد رکھو کہ دنیا باور کرنے والے کے لئے سچائی کا گھر اور سمجھدار کے لئے امن و عافیت کی منزل اور نصیحت حاصل کرنے والے کیلئے نصیحت کا مقام ہے۔ یہ دوستان خدا کے لئے سجود کی منزل اور ملائکہ آسمان کا مصلی ہے یہیں وحی الٰہی کا نزول ہوتا ہے اور یہیں اولیاء خدا آخرت کا سودا کرتے ہیں جس کے ذریعہ رحمت کو حاصل کر لیتے ہیں اور جنت کو فائدہ میں لے لیتے ہیں کسے حق ہے کہ اسکی مذمت کرے جبکہ اس نے اپنی جدائی کا اعلان کر دیا ہے اور اپنے فراق کی آواز لگا دی ہے اور اپنے رہنے والوں کی سنائی سنا دی ہے اپنی بلا سے ان کے ابتلا کا نقشہ پیش کیا ہے اور اپنے سرور سے آخرت کے سرور کی دعوت دی ہے۔ اسکی شام عافیت میں ہوتی ہے تو صبح مصیبت میں ہوتی ہے تاکہ انسان میں رغبت بھی پیدا ہو اور خوف بھی۔ اسے آگاہ بھی کردے اور ہوشیار بھی بنا دے۔ کچھ لوگ ندامت کی صبح اسکی مذمت کرتے ہیں اور کچھ لوگ قیامت کے روز اسکی تعریف کریں گے۔ جنہیں دنیا نے نصیحت کی تو انھوں نے اسے قبول کر لیا اس نے حقائق بیان کئے تو اسکی تصدیق کر دی اور موعظہ کیا تو اسکے موعظہ سے اثر لیا''

۹۔ دنیا بازار ہے

حضرت امام علی نقیؑ نے فرمایا ہے:

﴿الدنیا سوق ربح فیها قوم وخسر آخرون﴾(۱)

"دنیا ایک بازار ہے جہاں ایک قوم فائدہ میں ہے اور دوسری قوم خسارہ میں"

۱۰۔ دنیا آخرت کے لئے مددگار ہے۔

امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے:

﴿نعم العون الدنیا علیٰ الآخرة﴾(۲)

"دنیا آخرت کے لئے بہترین مددگار ہے"

۱۱۔ دنیا ذخیرہ (خزانہ) ہے۔

امیرالمومنینؑ کا ارشاد ہے:

﴿الدنیا ذخر والعلم دلیل﴾(۳)

"دنیا خزانہ ہے اور علم رہنما"

۱۲۔ دنیا دارالمتقین ہے۔

قول پروردگار "ولنعم دار المتقین" کی تفسیر کے ذیل میں امام محمد باقرؑ نے فرمایا کہ:

"اس سے مراد "دنیا" ہے۔

---

(۱) بحارالانوار ج ۷۸ ص ۳۶۶۔

(۲) بحارالانوار ج ۷۳ ص ۱۲۷۔

(۳) غررالحکم۔

۱۳۔دنیا کا ماحصل آخرت۔

حضرت علی ؑ نے فرمایا ہے:

﴿بالدنیا تحرز الآخرة﴾(۱)

''دنیا کے ذریعہ آخرت حاصل کی جاتی ہے''

اس طرح اسلام کی نگاہ میں دنیا قابل مدح وستائش، اولیائے الٰہی کی محل تجارت، محبان خدا کی مسجد، آخرت تک رسائی کا ذریعہ اور مومنین کے لئے زاد آخرت حاصل کرنے کا مقام ہے لیکن یہ سب کچھ اس صورت میں ہے کہ جب دنیا سے عبرت ونصیحت حاصل کی جائے لیکن اگر دنیا کو منظور نظر بنالیا جائے تو پھر یہی دنیا انسان کو اندھا بنا دیتی ہے جیسا کہ امیر المومنین حضرت علی ؑ کا ارشاد ہے:

منقول ہے کہ جب آپ نے یہ فرمایا:

﴿أیها الذام الدنیا أنت المتجرّم علیها أم هی المتجرّمه علیك؟قال قائل: بل أنا المتجرّم علیها یاامیر المؤمنین. فقال:''فلم ذممتها؟ألیست دار صدق لمن صدقها؟﴾(۲)

''اے دنیا کی مذمت کرنے والے!تو نے اسکے اوپر تہمت لگائی ہے یا اس نے تیرے اوپر تہمت لگائی ہے؟''تو اس شخص نے کہا:اے امیر المومنینؑ میں نے اس پر تہمت لگائی ہے!تو آپ نے فرمایا:

''تو پھر تم دنیا کی کیوں مذمت کرتے ہو؟کیا یہ دنیا تصدیق کرنے والوں کیلئے دار صدق نہیں ہے''

---

(۱)بحارالانوار ج۷۶ص۶۷۔

(۲)بحارالانوار ج۷۸ص۱۷۔

۳۔ اسکے دل کو اسکا دلدادہ بنا دونگا

جرم اور سزا کے درمیان تبادلہ

"اور اسکے دل کو دنیا سے وابستہ کردوں گا" یہ ان لوگوں کی تیسری سزا ہے جو خدا سے منھ موڑ کر اپنی خواہشات کی جانب دوڑتے ہیں یہاں سزا اور جرم ایک ہی طرح کے ہیں۔اور جب جرم وسزا کی نوعیت ایک ہوتی ہے تو وہ کوئی قانونی سزا نہیں بلکہ "تکوینی" سزا ہوتی ہے اور تکوینی سزا زیادہ منصفانہ ہوتی ہے اور اس سے بچنے کا امکان بھی نہیں ہوتا۔جرم یہ ہے کہ انسان خدا کو چھوڑ کر خواہشات سے دل لگا رہا ہے اور سزا بھی ایسی ہی ہے یعنی خدا بندہ کو دنیا میں ہی مشغول کردیتا ہے "واشغلت قلبه بها"

اس طرح جرم وسزا میں دوطرفہ رابطہ ہے اور دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں خدا کو چھوڑ کر "خواہشات میں الجھنے" کی سزا "دنیا میں الجھنا" ہے اس سزا سے جرم میں مزید اضافہ ہوتا رہتا ہے اور جرم میں اضافہ،مزید سزا کا مطالبہ کرتا ہے اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے اس طرح نہ صرف یہ کہ سزا وہی ملتی ہے جو جرم کیا ہے بلکہ خود سزا جرم کو بڑھاتی ہے اور اسے شدید کردیتی ہے نتیجتاً انسان کچھ اور شدید سزا کا مستحق ہوجاتا ہے۔

انسان جب پہلی مرتبہ جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو اس وقت اسکے پاس گناہوں سے اجتناب اور سقوط وانحراف سے بچانے والی خداداد قوت مدافعت کا مکمل اختیار ہوتا ہے لیکن جب گناہوں کا سلسلہ مسلسل جاری رہتا ہے اور انسان اپنے نفس کو نہیں روکتا تو خدا بھی سزا کے طور پر اسے اسی جرم کے حوالہ کردیتا ہے اور اس سے گناہوں سے اجتناب کرنے اور نفس پر تسلط قائم رکھنے کی فطری اور خداداد صلاحیت کو سلب کرلیتا ہے۔

اور سزا کا درجہ جتنا بڑھتا جاتا ہے انسان اتنا ہی جرم کے دلدل میں پھنستا رہتا ہے،اپنے نفس پر اسکی گرفت کمزور ہوتی رہتی ہے اور گناہوں سے پرہیز کی صلاحیت دم توڑتی جاتی ہے یہاں

تک کہ خداوند عالم اس سے گناہوں سے اجتناب کی فطری صلاحیت اور نفس پر تسلط و اختیار کو مکمل طریقہ سے سلب کر لیتا ہے۔

اس مقام پر یہ تصور ذہن میں نہیں آنا چاہیے کہ جب مجرم کے پاس نفس پر تسلط اور گناہوں سے اجتناب کی صلاحیت بالکل ختم ہوگئی اور گویا اسکا اختیار ہی ختم ہوگیا تو اب سزا کیسی؟ یہ خیال ناروا ہے اس لئے کہ ابتداء میں مجرم نے جب جرم کا ارتکاب کیا تھا اس وقت تو اسکے پاس یہ صلاحیت اور نفس کے اوپر تسلط بھرپور طریقہ سے موجود تھا اور وہ مکمل اختیار کا مالک تھا جو شخص اپنے ہاتھوں دولت اختیار ضائع کردے اسے بے اختیار نہیں کہا جاتا جیسے بلندی سے کودنے والا گرنے کے بعد یقیناً بے اختیار ہوجاتا ہے لیکن اگر کوئی شخص خود جان بوجھ کر بلندی سے چھلانگ لگائے تو اسکے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بے اختیار ہے اور اسکے پاس بچنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی۔

دنیاداری کے دو رخ یہ بھی!

جب انسان دنیاداری میں مشغول ہوجاتا ہے تو اس کا پہلا اثر اور ایک رخ یہ ہوتا ہے کہ انسان کا سارا ہم وغم اسکی دنیا ہی ہوتی ہے اور یہ کیفیت ایک خطرناک بیماری کی شکل اختیار کر کے قلب انسانی کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک دعا میں منقول ہے:

﴿اللّهم أقسم لنا من خشيتك مايحول بيننا وبين معاصيك، ولاتجعل الدنيا أكبر همنا، ولامبلغ علمنا﴾(۱)

"پروردگارا! ہمیں وہ خوف وخشیت عطا فرما جو ہمارے اور گناہوں کے درمیان حائل

---

(۱) بحار الانوار ج۹۵ص۳۶۱۔

ہو جائے اور ہمارے لئے دنیا کو سب سے بڑا ہم وغم اور ہمارے علم کی انتہا قرار مت دینا"

اگر انسان دنیاوی معاملات کو اہمیت دے تو اس میں کوئی قباحت نہیں لیکن دنیا کو اپنا سب کچھ قرار دینا اور اسکو اپنے قلب کا حاکم اور زندگی کا مالک تسلیم کر لینا غلط ہے کیونکہ ایسی صورت میں وہ اپنے اشاروں پر انسان کو نچاتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ صورت حال قلب کے لئے بیماری کا درجہ رکھتی ہے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ نے اپنے فرزند امام حسن مجتبیٰؑ کے نام اپنی وصیت میں فرمایا ہے:

﴿ولا تکن الدنیا أکبر همك﴾(۱)

"دنیا تمہارا سب سے بڑا ہم وغم نہ ہونے پائے"

دنیا داری میں مشغول ہونے کا منفی رخ یہ ہے کہ خدا سے انسان کا تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ معاملات دنیا میں کھو جانے کا مطلب خدا سے قطع تعلق کر لینا ہے اور فطری بات ہے کہ جب انسان کا ہم وغم اسکی دنیا ہوگئی تو پھر انسان کے ہر اقدام کا مقصد دنیا ہوگی نہ کہ رضائے الٰہی، اس طرح انسانی قلب پر دنیا کے دریچے جس مقدار میں کھلتے جائیں گے اسی مقدار میں الٰہی دریچے بند ہوتے جائیں گے لہٰذا اگر انسان کی نگاہ میں دنیاوی کاموں کی سب سے زیادہ اہمیت ہوگی تو خدا کی جانب توجہ کمترین درجہ تک پہونچ جائے گی۔ اور جب سب ہم وغم اور فکر وخیال دنیا کے لئے ہو جائے گا تو یہ کیفیت درحقیقت گذشتہ صورت حال کا نتیجہ اور قلب انسانی کی بدترین بیماری ہے۔

قرآن کریم نے اس خطرناک بیماری کو متعدد مقامات پر مختلف عناوین کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ ہم یہاں پر آیات قرآن کے ذیل میں چند عناوین کا تذکرہ کر رہے ہیں:

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۷ ص ۲۰۲۔

دل کے اوپر خدائی راستوں کی بندش کے بعض نمونے

ا۔غبار اور زنگ

﴿کلا بل ران علیٰ قلوبھم ماکانوا یکسبون﴾(۱)

''نہیں نہیں بلکہ انکے دلوں پر انکے (برے) اعمال کا زنگ لگ گیا ہے''

راغب اصفہانی نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ''ان کے دلوں کی چمک دمک زنگ آلود ہوگئی لہٰذا وہ خیر وشر کی پہچان کرنے سے بھی معذور ہو گئے ہیں۔

۲۔الٹ، پلٹ

یہ ایک طرح کا عذاب ہے جس میں خدا، غافل دلوں کو اپنی یاد سے دور کر دیتا ہے جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿صرف اللہ قلو بھم بانھم قومٌ لایفقھون﴾(۲)

''تو خدا نے بھی انکے قلوب کو پلٹ دیا ہے کہ وہ سمجھنے والے لوگ نہیں ہیں''

۳۔زنگ یا مُہر

خداوند عالم کا ارشاد ہے:

﴿ونطبعُ علیٰ قلوبھم فھم لایسمعون﴾(۳)

''ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں اور پھر انھیں کچھ سنائی نہیں دیتا''

---

(۱)سورۂ مطففین آیت ۱۴۔

(۲)سورۂ توبہ آیت ۱۲۷۔

(۳)سورۂ اعراف آیت ۱۰۰۔

یعنی ان کو غیر خدائی رنگ میں رنگ دیا ہے اور وہ ہوئی و ہوس اور دنیا کا رنگ ہے۔

۴۔مہر

خداوند عالم کا ارشاد ہے:

﴿ختم الله علیٰ قلوبهم و علیٰ سمعهم و علیٰ أبصارهم غشاوة﴾(۱)

''خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی ہے اور انکی آنکھوں پر بھی پردے پڑ گئے ہیں''

ختم (مہر) طبع (چھاپ لگنے) سے زیادہ محکم ہوتی ہے کیونکہ کسی چیز کو مُہر کے ذریعہ سیل بند کردینے کو ''ختم'' کہتے ہیں۔

۵۔قفل

خداوند عالم کا ارشاد ہے:

﴿أفلا یتدبرون القرآن أم علیٰ قلوب أقفالها﴾(۲)

''تو کیا یہ لوگ قرآن میں ذرا بھی غور نہیں کرتے ہیں یا ان کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں''

۶۔غلاف

خداوند عالم کا ارشاد ہے:

﴿وقالوا قلوبنا غُلفٌ بل لعنهم الله بکفرهم﴾(۳)

''اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں بیشک ان کے کفر کی بنا

---

(۱)سورۂ بقرہ آیت ۷۔

(۲)سورۂ محمدؐ آیت ۲۴۔

(۳)سورۂ بقرہ آیت ۸۸۔

پر، ان پر اللہ کی مار ہے"

دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

﴿وقولهم قلوبنا غلف بل طبع الله عليها بكفرهم﴾(۱)

"اور یہ کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر فطرتاً غلاف چڑھے ہوئے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ خدا نے ان کے کفر کی بنا پر ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے"

۷۔ پردہ

اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿وقالوا قلوبنا في أكنّة مما تدعونا اليه وفي آذاننا وقر﴾(۲)

"اور وہ کہتے ہیں کہ تم جن باتوں کی طرف دعوت دے رہے ہو ہمارے دل ان کی طرف سے پردہ میں ہیں اور ہمارے کانوں میں بہرا پن ہے"

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿وجعلنا علىٰ قلوبهم أكنّة أن يفقهوه وفي آذانهم وقراً﴾(۳)

"لیکن ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں۔ وہ سمجھ نہیں سکتے۔ اور ان کے کانوں میں بھی بہرا پن ہے"

۸۔ سختی

خداوند عالم کا ارشاد ہے:

---

(۱) سورۂ نساء آیت ۱۵۵۔

(۲) سورۂ فصلت آیت ۵۔

(۳) سورۂ انعام آیت ۲۵۔

﴿ربنا اطمس علیٰ أموالهم و اشدد علیٰ قلوبهم﴾(۱)

"خدایا ان کے اموال کو برباد کردے اور ان کے دلوں پر سختی فرما"

۹۔قساوت

﴿فویل للقاسیة قلوبهم من ذکر الله﴾(۲)

"افسوس ان لوگوں کے حال پر جن کے دل ذکر خدا (کینہ کرنے) سے سخت ہو گئے ہیں"

خداوند عالم کا ارشاد ہے:

﴿فطال علیهم الأمد فقست قلوبهم﴾(۳)

"تو ایک عرصہ گذرنے کے بعد ان کے دل سخت ہو گئے"

یہ انسانی دل کے اتار، چڑھاؤ، اور بند ہونے یا ذکر خدا سے روگرداں ہونے کی وہ صورت حال ہے جس کو قرآن مجید نے مختلف انداز سے ذکر کیا ہے۔

دنیا قید خانہ کیسے بنتی ہے؟

جب قلب انسانی پر الٰہی راستہ مکمل طریقہ سے بند ہوجائے تو یہی دنیا انسان کے لئے قید خانہ بن جاتی ہے انسان پر ہوس اس طرح غالب آجاتی ہے کہ اس کے لئے رہائی حاصل کرنا ممکن نہیں رہ جاتا۔ کیونکہ قید خانہ کا مطلب یہ ہے کہ اس سے نکلنا ممکن نہیں ہوتا اور اسکی حرکتیں محدود ہوجاتی ہیں یہی حالت اس وقت ہوتی ہے کہ جب دنیا انسان کے لئے قید خانہ بن جاتی ہے کہ انسان اسی میں مقید ہوکر رہ جاتا ہے حرکتیں محدود ہوجاتی ہیں اور اس سے ہر طرح کی آزادی سلب ہوجاتی ہے اور وہ اسکے

---

(۱)سورۂ یونس آیت ۸۸۔

(۲)سورۂ زمر آیت ۲۲۔

(۳)سورۂ حدید آیت ۱۶۔

لئے اہتمام اور اسکی حرص ولالچ کی بنا پر خداوند عالم سے بالکل الگ ہو جاتا ہے۔یہی تفصیلات روایات میں بھی وارد ہوئی ہیں۔حضرت امام محمد باقرؑ کی دعا کا فقرہ ہے:

﴿ولاتجعل الدنیا علیّ سجناً﴾(۱)

''دنیا کو میرے لئے قید خانہ قرار مت دینا''

حضرت امام جعفر صادقؑ کی دعا ہے:

﴿ولاتجعل الدنیاعلیّ سجناً،ولا تجعل فراقها لی حزناً﴾(۲)

''دنیا کو میرے لئے قید خانہ اور اس کے فراق کو میرے لئے حزن وملال کا باعث مت قرار دینا''

یہ بالکل عجیب وغریب بات ہے کہ قیدی پر قید خانہ کا فراق گراں گذر رہا ہے اور وہ رہائی پانے کے بعد حزن وملال میں مبتلا ہے؟اس کا راز یہ ہے کہ یہ قید خانہ دوسرے قید خانوں کے مانند نہیں ہے بلکہ یہ دنیا ایسا قید خانہ ہے کہ انسان اس سے انس والفت کی وجہ سے خود اپنے آپ کو قیدی بناتا ہے چونکہ خود قید کو اختیار کرتا ہے لہٰذا وہ اس سے جدائی گوارا نہیں کرتا اور اگر اسے قید سے جدا کردیا جائے تو اس رہائی سے اسے حزن وملال ہوتا ہے اور قید کا فراق اس کیلئے دشوار اور باعث زحمت ہوتا ہے۔

جب انسان اپنا اختیار دنیا کے حوالے کردیتا ہے تو دنیا اسے کیکڑے کے مانند اپنے چنگل میں دبوچ کر اس کے ہاتھ اور پیروں کو جکڑ دیتی ہے اور اس کی حرکتوں کو مقید ومحدود کر کے اسے اپنا اسیر بنالیتی ہے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ان الدنیا کالشبکة تلتفّ علیٰ من رغب فیها﴾

''دنیا جال کے مانند ہے جو اس کی طرف راغب ہوگا اسی میں الجھتا جائے گا''

---

(۱)بحار الانوار ج۹۷ص۳۷۹۔

(۲)بحار الانوار ج۹۷ص۳۳۸۔

(۳)غرر الحکم۔

آپ کا یہ قول ہمارے سامنے ایک بار پھر قید خانہ اور قیدی کے تعلق اور رابطہ کو اجاگر کرتا ہے

"تلتف علیٰ من رغب فیھا" جو اسکی طرف راغب ہوا وہ اسی پر لپٹتا چلا جائے گا۔

آپؑ ہی کا ارشاد ہے:

﴿من أحبّ الدینار و الدرھم فھو عبد الدنیا﴾(۱)

"جو درہم و دینار سے محبت کرتا ہے وہ دنیا کا غلام ہے"

اہل دنیا

کچھ افراد دنیا دار ہوتے ہیں اور کچھ "اہل آخرت" دنیا دار وہ لوگ ہیں جو دنیاوی زندگی کو دائمی زندگی سمجھ کر اسی کے دلداہ ہوتے ہیں اور دنیا کی فرقت انھیں اسی طرح ناگوار ہوتی ہے جیسے انسان کو اپنے اہل وعیال کی جدائی برداشت نہیں ہوتی ہے۔

اہل آخرت، دنیا میں اسی طرح رہتے ہیں جیسے دوسرے رہتے ہیں۔اور دنیا کی حلال لذتوں سے ایسے ہی لطف اندوز ہوتے ہیں جیسے دوسرے ان سے مستفید ہوتے ہیں بس فرق یہ ہے کہ وہ دنیا کی زندگی کو دائمی زندگی مان کر اس سے دلبستگی کا شکار نہیں ہوتے۔ایسے افراد در حقیقت "اہل اللہ" ہوتے ہیں۔

اہل آخرت اور دنیا داروں کے صفات ایک دوسرے سے الگ ہیں۔چنانچہ حدیث معراج میں دنیا داروں کے صفات یوں نظر آتے ہیں جیسا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے:

﴿أھل الدنیا من کثر أکلہ وضحکہ ونومہ وغضبہ،قلیل الرضا،لایعتذر الیٰ من أساء الیہ،ولایقبل معذرۃ من اعتذر الیہ،کسلان عند الطاعۃ...﴾(۲)

"دنیا داروں کی غذا، ہنسی، نیند، اور غصہ زیادہ ہوتا ہے۔یہ لوگ بہت کم راضی ہوتے ہیں،

---

(۱)بحار الانوار ج ۱۰۳ ص ۳۲۵۔

(۲)بحار الانوار ج ۷۷ ص ۲۳۔

جس کے ساتھ ناروا برتاؤ کرتے ہیں اس سے معذرت نہیں کرتے۔کوئی ان سے معذرت کا خواہاں ہوتو اس کی معذرت کو قبول نہیں کرتے، اطاعت کے موقع پر سست اور معصیت کے مقام پر بہادر ہوتے ہیں ان کے یہاں امن مفقود اور موت نزدیک ہوتی ہے۔کبھی اپنے نفس کا محاسبہ نہیں کرتے، ان کے یہاں منفعت برائے نام، باتیں زیادہ اور خوف کم ہوتا ہے یقیناً دنیادار نہ آسائشوں میں شکر خدا کرتے ہیں اور نہ ہی مصیبت کی گھڑی میں صبر۔جو کام انجام نہیں دیتے اس پر اپنی تعریف کرتے ہیں، جو صفات ان میں نہیں پائے جاتے ان کے بھی مدعی ہوتے ہیں، جو دل میں آتا ہے بول دیتے ہیں لوگوں کے عیوب تو ذکر کرتے ہیں مگر ان کی خوبیاں بیان نہیں کرتے''

دنیادار دنیا سے سکون حاصل کرتے ہیں اسی سے مانوس ہوتے ہیں اور اسی کو اپنا دائمی مستقر سمجھتے ہیں حالانکہ دنیا ''دارالقرار'' نہیں ہے۔چنانچہ جب کوئی انسان اس سے مانوس ہوکر تسکین قلب حاصل کرلے تو وہ فریب دنیا کے شرک میں مبتلا ہوجاتا ہے کیونکہ وہ اسے دارالقرار سمجھتے ہیں جبکہ وہ ایسی نہیں ہے۔

امیرالمومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

﴿...واعلم انك انما خُلقت للآخرة لا للدنيا،وللفناء لا للبقاء،وللموت لا للحياة،وأنك في منزل قلعة ودار بلغة،وطريق الىٰ الآخرة...وايا ك أن تغترّبما ترىٰ من اخلاد أهل الدنيا اليها،وتكالبهم عليها،فقدنبّأ ك الله عنها،ونعتْ لك نفسها،وتكشّفت لك عن مساويها...﴾(۱)

''۔۔۔اور بیٹا! یادرکھو کہ تمہیں آخرت کے لئے پیدا کیا گیا ہے دنیا کے لئے نہیں اور فنا کے لئے بنایا گیا ہے دنیا میں باقی رہنے کے لئے نہیں، تمہاری تخلیق موت کے لئے ہوئی ہے زندگی کے

---

(۱) نہج البلاغہ مکتوب ۳۱۔

لئے نہیں تم اس گھر میں ہو جہاں سے بہر حال اکھڑنا ہے اور صرف بقدر ضرورت سامان فراہم کرنا ہے اور تم آخرت کے راستہ پر ہو۔۔۔اور خبردار دنیا داروں کو دنیا کی طرف جھکتے اور اس پر مرتے دیکھ کر تم دھوکے میں نہ آجانا کہ پروردگار تمہیں اسکے بارے میں بتا چکا ہے اور وہ خود بھی اپنے مصائب سنا چکی ہے اور اپنی برائیوں کو واضح کر چکی ہے۔۔۔''

دنیا کا بہروپ

یہ ایک بہروپ ہی ہے کہ انسان دنیا کو دارالقرار سمجھ کر اس سے مانوس ہو جاتا ہے اور اس سے دل لگا بیٹھتا ہے حالانکہ دنیا صرف ایک گذرگاہ ہے۔نہ خود دنیا کو قرار ہے اور نہ ہی دنیا میں کسی کیلئے قرار ممکن ہے۔یہاں انسان کی حیثیت مسافر کی سی ہے کہ جہاں چند دن گذار کر آخرت کے لئے روانہ ہو جاتا ہے تعجب ہے کہ اس کے باوجود بھی انسان اسی کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے اور اسے دائمی قیام گاہ مان لیتا ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

﴿كن في الدنيا كانك غريب، أو كأنك عابر سبيل﴾(۱)

''دنیا میں ایک مسافر کی طرح رہو جیسے کہ راستہ طے کر رہے ہو''

امیر المومنین حضرت علی ؑ کا ارشاد ہے:

﴿أيها الناس انما الدنيا دار مجاز، والآخرة دار قرار، فخذوا من ممرّكم لمقرّكم﴾(۲)

''اے لوگو! یہ دنیا ایک گذرگاہ ہے قرار کی منزل آخرت ہی ہے لہٰذا اسی گذرگاہ سے وہاں کا

---

(۱) بحار الانوار ج۷۳ص۹۹۔

(۲) نہج البلاغہ خطبہ۲۰۳۔

سامان لے کر آگے بڑھو جو تمہارا دار قرار ہے"

اس مسئلہ پر زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ جو انسان راستہ سے گذرتا ہے وہ کبھی راستہ کا ہو کر نہیں رہ جاتا اسکے برخلاف گھر میں رہنے والے انسان کو گھر سے محبت ہوتی ہے اور آدمی گھر کا ہوتا ہے اس سلسلہ میں حضرت عیسیٰ ؑ بن مریم کا ایک معرکۃ الآرا جملہ نقل کیا جاتا ہے حضرت عیسیٰ ؑ نے فرمایا ہے:

﴿من ذا الذی یبنی علیٰ موج البحر داراً،تلکم الدنیا فلا تتخذوھا قراراً﴾(۱)

"سمندر کی لہروں پر کون گھر بناتا ہے؟ دنیا کا بھی یہی حال ہے لہٰذا دنیا کو قرارگاہ مت بناؤ"

جیسے سمندر کی لہروں کو قرار و بقا نہیں ہے ایسے ہی دنیا بھی ہے۔ تو پھر نفس اس سے کیسے سکون حاصل کر سکتا ہے اور اسے کیسے دائمی تسلیم کر سکتا ہے کیا واقعا کوئی انسان سمندر کی لہروں کے اوپر اپنا گھر بنا سکتا ہے؟

روایت ہے کہ جناب جبرئیل نے حضرت نوح ؑ سے سوال کیا:

﴿یا أطول الانبیاء عمراً،کیف وجدت الدنیا؟قال: کدار لھا بابان،دخلت من أحدھما،وخرجت من الآخر﴾(۲)

"اے طویل ترین عمر پانے والے نبی خدا، آپ نے دنیا کو کیسا پایا؟ حضرت نوح ؑ نے جواب دیا "ایک ایسے گھر کی مانند جس میں دو دروازے ہوں کہ میں ایک سے داخل ہوا اور دوسرے سے باہر نکل آیا"

عمر کے آخری حصہ میں شیخ الانبیاء (حضرت نوح ؑ) کا دنیا کے بارے میں یہ احساس در اصل اس شخص کا صادقانہ احساس ہے کہ جو فریب دنیا سے محفوظ رہا ہو۔

---

(۱) بحار الانوار ج ۱۴ ص ۳۲۶۔

(۲) میزان الحکمۃ ج ۳ ص ۳۳۹۔

لیکن اگر انسان دنیا سے مانوس ہو جائے اور دنیا اس کے لئے وجہ سکون بن جائے تو پھر یہ احساس تبدیل ہو جاتا ہے اور دنیا اس کو اپنے جال میں الجھا لیتی ہے انسان فریب دنیا کا شکار ہو کر شرک دنیا میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ ''ان دنیا داروں'' کا حال ہوتا ہے جن کے خیال خام میں دنیا دارالقرار اور وجہ سکون ہے۔

تیسری فصل

جو شخص خداوند عالم کی مرضی کو
اپنی خواہشات کے اوپر ترجیح دیتا ہے

Presented by: www.jafrilibrary.com

گذشتہ فصل میں ہم نے ''اپنی خواہش کو خدا کی مرضی کے اوپر ترجیح دینے والے شخص کے بارے میں،، تفصیلی گفتگو کی ہے اوراب انشاءاللہ'' خدا کی مرضی کو اپنی مرضی پر ترجیح دینے والے کے بارے میں'' گفتگو کریں گے ۔لیکن اصل بحث چھیڑنے سے پہلے ہم ان تمام روایات کوان کے حوالوں کے ساتھ بیان کررہے ہیں جن میں اس حدیث قدسی کا تذکرہ ہے۔

شیخ صدوق (رح) نے اپنی کتاب ''خصال'' میں اپنی سند کے ساتھ امام محمد باقر ؑ سے روایت نقل کی ہے آپ نے فرمایا کہ:

﴿ان اللہ عزوجل یقول: بجلالي وجمالي وبهائي وعلائي وارتفاعي لایؤثر عبد هوای علیٰ هواه الاجعلت غناه في نفسه، وهمّه في آخرته، وکففت عنه ضیعته، وضمنت السموات والارض رزقه، وکنت له من وراء تجارة کل تاجر﴾(۱)

خداوند عالم کا ارشاد ہے: ''میرے جلال وجمال، حسن، ارتفاع اور بلندی کی قسم کوئی بندہ اپنی خواہش پر میری مرضی کو ترجیح نہیں دیگا مگر یہ کہ میں اسکے نفس کے اندر استغنا پیدا کردوں گا اور اسکی پونجی کا ذمہ دار رہوں گا۔ زمین وآسمان اسکے رزق کے ضامن ہیں اور میں اسکے لئے ہر تاجر کی تجارت سے بہتر ہوں''

شیخ صدوق نے ''ثواب الاعمال'' میں امام زین العابدینؑ سے یہ روایت مع سند نقل کی ہے

---

(۱) بحارالانوار ج۷۰ ص۷۵۔

﴿انّ اللہ عزّوجل یقول:وعزّتی وعظمتی وجلالی و بھائی وعلوّی وارتفاع مکانی لایؤثر عبد ھوای علیٰ ھواہ الاجعلت ھمہ فی آخرتہ،وغناہ فی قلبہ،وکففت علیہ ضیعتہ،وضمنت السمٰوات والارض رزقہ،وأتتہ الدنیا وھی راغمۃ﴾(۱)

''آپ نے فرمایا کہ خداوند عزوجل ارشاد فرماتا ہے: میری عزت،عظمت،جلالت،جمال، رفعت اور میرے مکان کی بلندی اور ارتفاع کی قسم کوئی بندہ میری مرضی کو اپنی خواہش پر ترجیح نہیں دیگا مگر یہ کہ میں اس کی کل فکر اس کی آخرت کے لئے قرار دیدونگا اور اسکے قلب میں استغنا پیدا کر دونگا اور اس کی پونجی کا ذمہ دار رہونگا۔ آسمان وزمین اسکے رزق کے ضامن ہیں اور اسکے سامنے جب دنیا آئے گی تو اسکی ناک رگڑی ہوئی ہوگی''

ابن فہد حلی (رح) نے اپنی کتاب ''عدۃ الداعی'' میں رسول اللہ ﷺ سے یہ روایت نقل کی ہے: کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

﴿وعزّتی وجلالی وعظمتی و کبریائی ونوری وعلوّی وارتفاع مکانی لایؤثر عبد ھوای علیٰ ھواہ،الا استحفظتہ ملا ئکتی وکفّلت السمٰوات والارض رزقۃ،وکنت لہ من وراء تجارۃ کل تاجر،وأتتہ الدنیا وھی راغمۃ﴾(۲)

''میری عزت،جلالت،عظمت،کبریائی،نور،بلندی اور رفیع مقام کی قسم کوئی بندہ میری (خواہش) مرضی کو اپنی خواہش پر ترجیح نہیں دیگا مگر یہ کہ ملائکہ اسکی حفاظت کرینگے۔ آسمان اور زمین اسکے رزق کے ذمہ دار ہیں اور ہر تاجر کی تجارت کے پس پشت میں اسکے ساتھ موجود ہوں اور دنیا اسکے سامنے ذلت ورسوائی کے ساتھ حاضر ہوگی''

---

(۱)بحارالانوار ج۷۰ص۷۷از ثواب الاعمال۔

(۲)بحارالانوار ج۷۰ص۷۸۔

شیخ کلینی نے اصول کافی میں سند کے ساتھ یہ روایت امام محمد باقرؑ سے یوں نقل کی ہے:

﴿...الا کففت علیه ضیعته و ضمنت السموات والارض رزقه، و کنت له وراء تجارة کل تاجر﴾(۱)

''مگر یہ کہ میں اسکے ضروریات زندگی (پونجی) کا ذمہ دار ہوں اور آسمان وزمین اسکے رزق کے ضامن ہیں اور میں ہر تاجر کی تجارت کے پس پشت اسکے ساتھ ہوں''

مرضی خدا کو اپنی خواہش پر ترجیح دینا

اس ترجیح دینے کے معنی یہ ہیں کہ انسان خداوند عالم کے ارادہ کو اپنی خواہشات کے اوپر حاکم بنالے اور احکام الٰہیہ کے مطابق اپنے نفس کو اسکی خواہش سے روکتا رہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿و أما من خاف مقام ربه و نهی النفس عن الهویٰ فان الجنة هی الماوی﴾(۲)

''اور جس نے رب کی بارگاہ میں حاضری کا خوف پیدا کیا اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکا، جنت اسکا ٹھکانہ اور مرکز ہے''

تقویٰ اور فسق و فجور (برائیوں) کے راستے جس نقطہ سے ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں وہ نقطہ وہی ہے جہاں خداوند عالم کی خواہش (اسکا حکم اور قول) اور انسان کی خواہش (ہوس) کے درمیان ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ جب انسان خدا کی خواہش (مرضی) کو اپنی خواہش کے اوپر ترجیح دیتا ہے تو وہ تقوے کے راستہ پر چلنے لگتا ہے اور جب اپنی خواہشوں کو خدا کی مرضی کے اوپر ترجیح دیے

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۰ ص ۷۹۔

(۲) سورۂ نازعات آیت ۴۰۔۴۱۔

لگتا ہے تو فجور (برائیوں) کے راستے پر لگ لیتا ہے۔

۱۔ جعلت غناہ فی نفسہ

''اسکے نفس میں استغنا پیدا کردوں گا''

لوگوں کے درمیان عام تاثر یہ ہے کہ فقر وغنی کا تعلق سونے اور چاندی اور زر و جواہرات سے ہے اور نفس وقلب سے اسکا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اسلام میں فقر وغنی کا مفہوم اسکے برعکس ہے اسلام کی نگاہ میں فقر اور غنی کا تعلق نفس سے ہے نہ کہ مال ودولت سے، لہٰذا ہوسکتا ہے کہ ایک ایسا انسان غنی ہو جو مالی اعتبار سے فقیر ہو اور ہوسکتا ہے کوئی انسان فقیر ہو چاہے وہ مالی اعتبار سے ثروتمند ہی کیوں نہ ہو۔

امام حسینؑ کی دعائے عرفہ میں وارد ہوا ہے:

﴿اللّٰھم اجعل غنای فی نفسی، والیقین فی قلبی، والاخلاص فی عملی، والنور فی بصری، والبصیرة فی دینی﴾

''پروردگار میرے نفس کو غنی بنادے، میرے قلب کو یقین، عمل میں اخلاص، آنکھوں میں نور اور دین میں بصیرت عطا فرما''

آخر فقر وغنی کا مفہوم مال ودولت کے بجائے نفس سے متعلق کیسے ہوتا ہے؟ اسکا راز کیا ہے؟ درحقیقت تبدیلی کا یہ راز دین اسلام کے پراسرار عجائبات میں شامل ہے۔ ہمیں گا ہے بگا ہے اسکے بارے میں غور وخوض کرنا چاہئے۔

افکار کی تبدیلی میں اسلامی اصطلاحات کا کردار

''فقر'' اور ''استغنا'' دو اسلامی اصطلاحیں ہیں اور اسلام اپنی اصطلاحات کے لئے بہت اہمیت کا

قائل ہے اسی لئے اسلام نے دور جاہلیت کی کچھ اصطلاحوں کو کالعدم قرار دیا ہے اور انکی جگہ پر بہت سی نئی اصطلاحات پیش کی ہیں اور انھیں اصطلاحات کے ذریعہ فکر وخیال میں تبدیلی کی ہے اور قدر وقیمت کا نیا نظام پیش کیا ہے۔دور جاہلیت میں اقدار کے اصول جدا تھے جبکہ اسلام کے اصول الگ ہیں۔

کبھی اسلام دور جاہلیت کی قدروں کو مکمل طریقہ سے ختم کرتا ہے اوران کی جگہ پر سماجی زندگی کے جدید اقدار کو روشناس کراتا ہے۔زمانہ جاہلیت میں جس چیز کو سیاسی، اخلاقی اور سماجی زندگی میں بے قیمت سمجھا جاتا تھا اسلام نے اسی چیز کو سیاسی، سماجی اور اخلاقی طور پر بیش قیمت بنا کر پیش کیا ہے۔

مثلاً دور جاہلیت میں عورت کی کوئی حیثیت اور قدر و قیمت نہیں تھی لوگ لڑکیوں کے وجود کو ننگ وعار سمجھتے تھے لیکن اسلام نے اسی بے قیمت سمجھی جانے والی چیز کو عظیم ترین بلندی عطا کی۔

قدر و قیمت کا اختلاف دراصل قدر و قیمت کے نظام میں اختلاف کی بنیاد پر سامنے آتا ہے کیونکہ تمام اقدار حقیقتاً کسی نہ کسی اصول اور نظام کی بنیاد پر استوار ہوتے ہیں جن کی معرفت کے بغیر اقدار کی معرفت ممکن نہیں ہے۔

دین اسلام نے اپنی اصطلاحات کے ذریعہ اقدار کے اصول ونظام کو تبدیل کیا ہے جسکے نتیجہ میں اقدار خود بخود تبدیل ہوجاتے ہیں اور سماج میں تبدیلی آجاتی ہے بطور نمونہ فقط اس تبدیلی کی جانب اشارہ کردینا کافی ہے جو اسلام نے فقر وغنی کے معیار میں کی ہے جس کے نتیجہ میں ان کے مفہوم میں بھی تبدیلی پیدا ہوگئی ہے۔

فقر واستغنا اور اقدار کے اسلامی اصول

عام طور سے لوگوں کے درمیان فقر وغنی کا مطلب مال ودولت کی قلت وکثرت ہے۔یعنی

جسکے پاس زیادہ سونا چاندی نہ ہو وہ فقیر ہے اور جس کے پاس سونا چاندی وافر مقدار میں ہو اسے غنی کہا جاتا ہے اور مالداری کے درجات بھی مال کی مقدار سے طے ہوتے ہیں۔ یعنی جس شخص کی قوت خرید جتنی زیادہ ہوتی ہے وہ اتنا ہی بڑا مالدار شمار کیا جاتا ہے اسکے برخلاف جس کے پاس روپے پیسوں کی قلت ہو وہ اتنا ہی غریب سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح عام لوگوں کے خیال میں فقر و استغنا کا تعلق کمیت ''مال کی مقدار'' سے ہے۔

دور جاہلیت کا نظام قدر و قیمت

فقر و استغنا کے ان معنی میں بذات خود کوئی خرابی نہیں ہے اور اگر بات یہیں تمام ہو جاتی تو اسلام اسکی مخالفت نہ کرتا لیکن حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ جاہلیت کے نظام کے تحت ثروتمندی سے سماجی اور سیاسی اقدار بھی جڑ جاتے ہیں اور ثروتمند انسان معزز و محترم کہلاتا ہے اسکی سماجی حیثیت اور اسکے سیاسی نفوذ میں اضافہ ہو جاتا ہے وہ لوگوں کا معتمد بن جاتا ہے وغیرہ۔۔۔ اس طرح نظام جاہلیت میں واضح طور پر کمیت (Quantity) کیفیت (Quality) میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔

جب بھی ہم غور کریں گے تو ہمیں صاف محسوس ہوگا کہ یہاں زر و جواہر کی مقدار و کمیت (Quantity) سماجی اور سیاسی کیفیت میں تبدیلی ہوگئی ہے بلاشبہ اجتماعی اور سماجی زندگی میں مقدار و کمیت (Quantity) اور کیفیت میں براہ راست تعلق پایا جاتا ہے اور اس تعلق اور رابطہ کو ختم کرنا یا اسکا انکار کرنا ممکن ہے اور اسلام بھی اس تعلق اور رابطہ کو ختم کرنا نہیں چاہتا بلکہ اس رابطہ کو الٹ دینا چاہتا ہے یعنی کمیت اور مقدار کو کیفیت کا تابع قرار دیتا ہے نہ کہ کیفیت کو کمیت کا۔

مثلاً اقتصادی اور کاروباری معاملات کی بنیاد صداقت اور تقویٰ ہونا چاہئے اور اسی بنیاد پر کاروبار کو وسعت دینا چاہیے یا سیاسی میدان میں بھی ہر چیز کی بنیاد صداقت اور تقویٰ ہونا چاہئے اور اسی بنیاد پر ووٹ حاصل کرنا چاہیے کہ یہی چیزیں صحتمند معاشرے کی پہچان ہیں۔

لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہو اور سماجی یا سیاسی زندگی میں کمیت ومقدار معیار بن جائے تو سماج میں پائے جانے والے اقدار واصول کا وجود خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔دور جاہلیت میں بعینہ یہی صورت حال موجود تھی کہ مادیت پر روحانیت کی حکومت ہونے کے بجائے مادیت، روحانیت پر حاکم ہوگئی تھی اور قدر و قیمت کا تعین مادیت سے ہوتا تھا نہ کہ معنویت سے۔

اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ یہی صورت حال مسلمانوں کے سامنے بھی آئی اسلام نے قدر و قیمت کا ایسا نظام پیش کیا تھا کہ جو دور جاہلیت کے پروردہ لوگوں کے لئے نامانوس تھا۔اس نظام میں اسلام نے قدر و قیمت اور منزلت کا معیار روحانیت کو قرار دیا تھا اور مادیت کو روحانیت کا تابع بنایا تھا۔لیکن جب فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور قیصر و کسریٰ کے خزانے مسلمانوں کے ہاتھ آئے اور سرحدوں کی وسعت کے ساتھ دولت میں بھی بے پناہ اضافہ ہوا تو مادیت غالب آ گئی اور قدر و قیمت کا نظام پس پشت چلا گیا۔اور دوبارہ زر و جواہر ہی تمام اقدار کا معیار بن گئے اور انکی حالت اس عہد کی سی ہوگئی جس میں خداوند عالم نے رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث کیا تھا اور آپ کو قائد و پیشوا اور رسول بنا کر بھیجا تھا۔

عثمان بن عفان کے بعد امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب ؑ جب حاکم مسلمین ہوئے تو آپ نے محسوس کیا کہ اسلامی معاشرہ اس طرح منقلب ہو چکا ہے کہ جیسے کوئی اس طرح الٹا لباس پہن لے جسکا اندرونی حصہ باہر، اور ظاہری حصہ اندر، اوپری حصہ نیچے اور نچلا حصہ اوپر ہو گیا ہو۔ چنانچہ امیر المومنین ؑ بنی امیہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

﴿ولُبس الاسلام لُبسَ الفرو مقلوباً﴾(۱)

---

(۱) نہج البلاغہ خطبہ ۱۰۸۔

''اسلام یوں الٹ دیا جائے گا جیسے کوئی الٹی پوستین پہن لے''

جیسا کہ آپ نے ان الفاظ میں اسکی عکاسی کی ہے:

﴿ألا وان بـليـتـكم قدعادت كهيئتها يوم بعث الله نبيكم،والّذى بعثه بالحق لتبلبلنّ بلبلةً ولتغربلنّ غربلةً،ولتساطُنّ سَوطَ القدرحتّى يعود اسفلكم أعلاكم﴾(۱)

''یاد رکھو! تمہارا امتحان بالکل اسی طرح ہے جس طرح پیغمبر کی بعثت کے دن تھا اس ذات کی قسم جس نے رسول کو حق کے ساتھ بھیجا تم بری طرح تہ وبالا کئے جاؤ گے اور اس طرح چھانے جاؤ گے جس طرح چھلنی سے کسی چیز کو چھانا جاتا ہے اور اس طرح خلط ملط کئے جاؤ گے جس طرح پتیلی کے کھانے کو پلٹا جاتا ہے یہاں تک کہ تمہارے ادنیٰ اعلیٰ اور اعلیٰ ادنیٰ ہو جائیں گے''۔

امیر المومنینؑ فرماتے ہیں کہ عنقریب یہ قوم اسلامی اقدار ومفاہیم اور اصول کو چھوڑ کر ایک عظیم فتنہ میں مبتلا ہونے والی ہے اور اسکی وہ حالت ہو جائے گی جو کھولتے ہوئے شوربہ کی ہوتی ہے کہ اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا حصہ اوپر ہو جاتا ہے۔

فتوحات کی وسعت اور خدا کی جانب سے رزق میں فراوانی کے باعث امت اسلامیہ کی یہی حالت ہوگئی تھی جیسا کہ مال ونعمت کی زیادتی کے باعث عہد جاہلیت کی بھی یہی افسوسناک حالت تھی۔

دور جاہلیت کے نظام قدر و قیمت کو تبدیل کرنے اور اس سے مقابلہ کرنے کے لئے اسلام نے فقر اور استغنا کی نئی اصطلاحیں ایجاد کیں اور انہیں نئی اصطلاحوں اور نئے مفاہیم کے ذریعہ دور جاہلیت کے نظام قدر و قیمت کو تبدیل کر دیا۔

قدر و قیمت کا اسلامی نظام

لفظ غنیٰ یا استغنا کے معنی کو دو طرح سے بیان کیا جاتا ہے۔ایک بیان کے مطابق استغنا کا

---

(۱) نہج البلاغہ خطبہ ۱۶۔

مطلب ہے ''انسان کے پاس زر و جواہر کا بکثرت موجود ہونا'' اس طرح غنی کے معنی کا تعلق عالم محسوسات سے ہے اور یہ مطلب لفظ ''ثروتمند'' کے مترادف ہے۔

دوسرے بیان کے مطابق حقیقتاً استغنا سے مراد ''دل کا مستغنی ہونا'' ہے جو کہ اللہ تعالی پر ایمان اور توکل سے حاصل ہوتا ہے اور اس معنی کا مال کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور عین ممکن ہے کہ انسان کے پاس بے پناہ مال و دولت ہو مگر پھر بھی وہ فقیر ہو اور ہوسکتا ہے کہ مال و دولت بالکل نہ ہو پھر بھی انسان غنی ہو۔

فقر و استغنا کے یہ معنی، لغوی اور رائج معنی سے بالکل مختلف ہیں۔ اور ان معنی کے لحاظ سے استغنا کا تعلق نفس انسانی سے ہے نہ کہ مال و دولت اور خزانہ سے۔

دین اسلام لفظ فقر و استغنا کو نئے معنی و مفاہیم دے کر در اصل دور جاہلیت کے نظام قدر و قیمت کو تبدیل کر کے اسکے مقابلہ میں جدید نظام پیش کرنا چاہتا ہے۔

اسکی مزید وضاحت کے لئے ہم استغنا اور فقر کے بارے میں اسلامی روایات کی روشنی میں پہلے لفظ استغنا کا مطلب بیان کریں گے اور پھر اس جدید نظام کی وضاحت کریں گے جو اسلام نے قدر و قیمت کے سلسلہ میں پیش کیا ہے۔

اسلامی روایات میں استغنا کا مفہوم

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

﴿لیس الغنیٰ عن کثرۃ العرَض، ولکن الغنیٰ غنیٰ النفس﴾(۱)

''مال و متاع کی کثرت کا نام استغنا نہیں بلکہ استغنا کا مطلب نفس کا مستغنی ہونا ہے''

---

(۱) تحف العقول ص ۳۶۔

آپ ہی کا ارشاد گرامی ہے:

﴿الغنیٰ فی القلب، و الفقر فی القلب﴾(۱)

''استغنا بھی دل میں ہوتا ہے اور فقر بھی دل ہی میں ہوتا ہے''

امیر المومنین حضرت علیؑ نے فرمایا ہے:

﴿الغنی من استغنیٰ بالقناعة﴾(۲)

''غنی وہ ہے جو قناعت کے باعث مستغنی ہو''

آپ ہی کا ارشاد گرامی ہے:

﴿لا کنز اغنیٰ من القناعة﴾(۳)

''غنی (ہونے) کے لئے قناعت سے بڑھکر کوئی خزانہ نہیں ہے''

نیز آپؑ نے فرمایا ہے:

﴿طلبت الغنیٰ فما وجدت الاّ القناعة، علیکم بالقناعة تستغنوا﴾(۴)

''میں نے استغنا کو تلاش کیا تو مجھے قناعت کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا۔ تم بھی قناعت اختیار کرو تو مستغنی ہو جاؤ گے''

امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے:

﴿لا فقر کفقر القلب، و لا غنیٰ کغنیٰ القلب﴾(۵)

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۲ ص ۶۸۔

(۲) غرر الحکم ج ۱ ص ۶۲۔

(۳) نہج البلاغہ حکمت ۳۷۱۔

(۴) سفینۃ البحار ج ۲ ص ۴۸۷، الحیات جلد ۳ ص ۳۴۲۔

(۵) تحف العقول ص ۲۰۸۔

''دل کی فقیری جیسا کوئی فقر نہیں ہے اور دل ہی کے استغنا جیسی کوئی مالداری بھی نہیں ہے''

امام ہادیؑ کا ارشاد ہے:

﴿الغنیٰ قلّة تمنیك، والرضا بمایکفیك﴾(۱)

''استغنا کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری خواہشات کم ہوں اور جتنا تمہارے لئے کافی ہے اسی پر راضی رہو'' (خواہشات کا کم ہونا اور 'بقدر کافی' پر راضی ہو جانا استغنا ہے۔)

اس طرح اسلام نے استغنا کا تعلق سونے چاندی، زمین جائداد سے ختم کردیا اور اسے نفس کے متعلق قرار دیا ہے بلکہ اسلامی روایات تو اس سے بڑھ کر یہاں تک بیان کرتی ہیں کہ جو افراد مال ودولت کے لحاظ سے ثروتمند ہوتے ہیں اکثر وہ افراد دل کے چھوٹے اور فقیر ہوتے ہیں۔

عموماً جب انسان دنیاوی لحاظ سے مالدار ہوتا ہے تو دل کا چھوٹا اور فقیر ہوتا ہے ایسا نہیں ہے کہ ثروتمند ہونے اور نفس وقلب کے اعتبار سے چھوٹے اور فقیر ہونے میں کوئی معکوس رابطہ ہو۔ نہیں ہرگز نہیں ان دونوں باتوں میں کوئی معکوس رابطہ نہیں ہے۔ درحقیقت ایسی صورت حال ان عوارض کے باعث پیدا ہوتی ہے کہ جو عموماً معاشرہ میں رائج ثروتمندی کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔

امیر المومنین حضرت علیؑ سے روایت ہے:

﴿...وغنیّها(الدنیا)فقیر﴾(۲)

''...اور دنیا کا غنی فقیر ہوتا ہے''

حضرت امام زین العابدینؑ نے فرمایا:

---

(۱) بحارالانوار ج ۷۸ ص ۳۶۸۔

(۲) بحارالانوار ج ۷۸ ص ۱۴۔

﴿من اصاب الدنیا اکثر، کان فیها أشدّ فقراً﴾(۱)

''جسے دنیا زیادہ نصیب ہوجائے گی وہ دنیا میں زیادہ فقیر ہوگا''

جسے دنیا زیادہ نصیب ہوجائے گی وہ دنیا میں زیادہ فقیر ہوگا یہ لازم وملزوم کیوں ہیں؟ ثروتمندی اور استغنا دونوں لفظ غنی کے ہی معنی ہیں مگر ان کے درمیان معکوس رابطہ کیوں پایا جاتا ہے؟ اس سوال کا جواب اور اس رابطہ کا سبب ہمیں امیرالمومنین حضرت علیؑ کی اس حدیث سے بخوبی معلوم ہوجائے گا آپ نے فرمایا:

﴿الغنیّ الشَّرِهُ فقیرٌ﴾(۲)

''لالچی مالدار فقیر ہوتا ہے''

اس حدیث مبارک میں غنی سے مراد ثروتمند ہے اور فقیر سے مراد نفس وقلب کے اعتبار سے فقیر ہے اور اس حدیث میں جو لفظ ''شرہ'' حریص آیا ہے وہ اس معکوس رابطہ کو بیان کرتا ہے اس لئے کہ عام لوگوں کے لحاظ سے جس کے یہاں استغنا پایا جاتا ہے جو ثروتمند ہوتا ہے وہ عموماً حریص بھی ہوتا ہے اور عموماً جتنا مال ودولت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے آدمی کی حرص وہوس میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے اور یہ طے شدہ ہے کہ جب حرص وطمع میں اضافہ ہوگا تو انسان کی اذیت وپریشانی میں اضافہ ہوگا انھیں دونوں حقیقتوں کی جانب قرآن کریم نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے ارشاد رب العزت ہے:

﴿انما یرید اللّٰہ لیعذبهم بها فی الحیاة الدنیا وتزهق انفسهم وهم کافرون﴾(۳)

''بس اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ انہیں کے ذریعہ ان پر زندگانی دنیا میں عذاب کرے اور حالت

---

(۱) خصال صدوق ج۱ صفحہ۶۴۔

(۲) بحارالانوار ج۷۸ ص۲۲۔

(۳) سورۂ توبہ آیت ۵۵۔

کفر ہی میں ان کی جان نکل جائے"

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿انما یرید اللّٰہ أن یعذّبھم بھا فی الدنیا﴾(۱)

"بس اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ انہیں کے ذریعہ ان پر دنیا میں عذاب کرے۔

حرص وطمع اسی وقت پایا جاتا ہے جب انسان قلب کے لحاظ سے فقیر ہو۔نفس جتنا خالی ہو اور فقیر ہوگا حرص و ہوس کا اظہار اتنا ہی شدید ہوگا۔حضرت داؤد ؑ کے دور میں لوگوں کی یہی حالت تھی چنانچہ خداوند عالم نے انھیں توبہ کرنے اور بارگاہ الٰہی میں واپس آنے کا حکم دیا۔

حرص وہوس کس منزل تک پہونچ سکتے ہیں سورۂ ص کی یہ آیت اسکی بخوبی نشاندہی کرتی ہے:

﴿انّ ھذا أخی لہ تسع وتسعون نعجۃ ولیَ نعجۃٌ واحدۃٌ فقال: أکفلنیھا و عزّنی فی الخطاب﴾(۲)

"یہ ہمارا بھائی ہے اسکے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک ہے یہ کہتا ہے وہ بھی میرے حوالے کردے اور اس بات میں سختی سے کام لیتا ہے"

اقدار کے نظام میں انقلاب

اس طرح اسلام نے استغنا کے نئے معنی پیش کئے اور استغنا کا تعلق زر وجواہر اور مال و دولت سے ختم کرکے اسے نفس اور قلب سے جوڑ دیا ہے اس طرح قدر وقیمت کا معیار مال وثروت کے بجائے نفس کو قرار دیا۔

اسلام کی نگاہ میں انسان کی قدر وقیمت اسکے مال ودولت اور منقولہ وغیر منقولہ جائیداد سے

---

(۱) سورۂ توبہ آیت ۸۵۔

(۲) سورۂ ص آیت ۲۳۔

نہیں طے کی جاسکتی جیسا کہ جاہل افراد آج بھی یہی سوچتے ہیں بلکہ اسلام کی نگاہ میں انسانی قدر و قیمت کی بنیاد اللہ پر ایمان، تقویٰ، علم اور دیگر اخلاقی اقدار ہیں۔ اسلام لفظ ثروتمندی اور فقر کے اصل معنی کا منکر نہیں ہے بلکہ اسلام نے اس معنی کے مفہوم میں اضافہ کیا ہے کہ قدر و قیمت کے تعین کے وقت بے نیازی اور فقر کے معاشی رخ کو ملحوظ نہ رکھا جائے قدر و قیمت کا معیار فقر و غنی ہی ہیں مگر اس مفہوم میں کہ جو اسلام نے پیش کیا ہے۔

امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے:

﴿ليس الخير أن يكثر مالك،ولكن الخير أن يكثر علمك،وأن يعظم حلمك،وأن تباهي الناس بعبادة ربك،فان أحسنت حمدت الله،وأن أسأت استغفرت الله﴾(۱)

''بھلائی یہ نہیں ہے کہ تمہارا مال زیادہ ہو بلکہ حقیقی نیکی یہ ہے کہ تمہارا علم زیادہ ہو۔ حلم عظیم ہو اور عبادت پروردگار کو فخر و مباہات کا معیار قرار دو چنانچہ اگر تم نے اچھی طرح عبادت انجام دی ہو تو حمد خدا کرو اور اگر عبادت میں کمی کی ہو تو بارگاہ الٰہی میں استغفار کرو''

چنانچہ جب قدر و قیمت کا نظام بدل جائے گا تو خود بخود لوگوں کی سماجی اور سیاسی حیثیت میں بھی فرق آجائے گا اس لئے کہ کسی بھی تہذیب میں اگر اقدار ایک جانب اپنے نظام سے جڑے ہوتے ہیں تو دوسری جانب انکا تعلق سماجی، سیاسی معاشی اور علمی حیثیت و منزلت سے بھی ہوتا ہے۔

اگر آج ہمیں جاہلیت زدہ مغربی تہذیب میں یہ نظر آتا ہے کہ اس تہذیب میں سرمایہ داری کا دخل کتنا ہے، سیاست، معاشیات اور پروپیگنڈہ پر سرمایہ کا کتنا تسلط اور غلبہ ہے، صدر اور حکومت کے انتخابات میں سرمایہ داری کا کتنا اہم کردار ہے میڈیا یہاں تک کہ سیاسی روابط بھی کچھ سرمایہ داری

---

(۱) نہج البلاغہ حکمت ۹۴۔

کے تابع ہیں! ہماری نگاہ میں اسکا سبب یہ ہے کہ اس تہذیب کی بنیاد مادیت پر ہے نہ کہ اخلاقی اور روحانی اقدار پر۔ اسکے برخلاف اسلام کی نگاہ میں ان چیزوں کی بنیاد اخلاقی وروحانی اقدار، بندہ کا اللہ سے رابطہ، عدالت وتقوی اور علم پر استوار ہے۔ ارشاد پروردگار ہے:

﴿انما یخشیٰ اللّٰہ من عبادہ العلماءُ﴾(۱)

''اللہ سے ڈرنے والے اسکے بندوں میں صرف صاحبان معرفت ہیں''

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقیٰکُمْ﴾(۲)

''بیشک تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہی ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے''

اسلام، قائد اور رہبر مسلمین کے لئے تقوی اور عدالت کو ضروری قرار دیتا ہے اسی طرح قاضی، پیش نماز اور امین (جس کے پاس لوگ امانتیں رکھواتے ہیں) بہ الفاظ دیگران تمام افراد کے لئے تقوی وعدالت کولازمی شرط قرار دیتا ہے جو سماج اور معاشرہ میں کسی بھی عنوان سے مقام ومنزلت کے مالک ہوں۔ اسی لئے جب نظام اقدار میں تبدیلی آئے گی تو خود بخود معاشرہ کی سماجی، سیاسی، معاشی، علمی، دینی حیثیتوں میں تبدیلی ناگزیر ہے۔

اس طرح تین مرحلوں میں یہ عمل انجام پاتا ہے:

۱۔ نظام اقدار میں تبدیلی

۲۔ اقدار میں تبدیلی

۳۔ سماجی اور سیاسی حیثیت میں تبدیلی

---

(۱) سورۂ فاطر آیت ۲۸۔

(۲) سورۂ حجرات آیت ۱۳۔

اب جبکہ استغنا سے متعلق اسلامی نظریہ واضح ہوگیا اور لوگوں کی زندگی میں اس کے کردار کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوگیا تو اب ہم نفس کے استغنا اور بے نیازی کے بارے میں کچھ بیان کر سکتے ہیں جس کے بارے میں حدیث شریف کے الفاظ یہ ہیں ''جعلت غناہ فی نفسہ''

نفس کی بے نیازی

سوال یہ کہ نفس کی بے نیازی ہے کیا؟ اور ہم اپنے اندر یہ بے نیازی کیسے پیدا کر سکتے ہیں؟

دراصل نفس کی بے نیازی اس میں مضمر ہے کہ انسان مادیات اور دنیا پر اعتماد نہ کرے بلکہ اللہ پر بھروسہ رکھے اس لئے کہ دنیا فانی ہے اور ذات الٰہی دائمی، مادیات محدود ہیں اور خدا کی سلطنت لامحدود۔

لہٰذا جب انسان اللہ پر توکل اور بھروسہ کے سہارے مستغنی اور بے نیاز ہوگا تو کبھی بھی کمزوری اور ناتوانی محسوس نہیں کرے گا۔ حالات کتنے ہی منقلب کیوں نہ ہوجائیں، آسانیاں سختیوں میں تبدیل کیوں نہ ہوجائیں اللہ پر توکل کرنے والے کے پائے ثبات متزلزل نہ ہوں گے کیونکہ ایسی بے نیازی نفس سے تعلق رکھتی ہے اور کسی بھی عالم میں نفس سے جدا نہیں ہوسکتی ہے۔

مولائے کائناتؑ متقین کے صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

﴿فی الزلازل وقور، وفی المکارہ صبور﴾(۱)

''(متقین) مصائب وآلام میں باوقار اور دشواریوں میں صابر ہوتے ہیں''

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی بے نیازی نفس کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے اور کوئی بھی پریشانی یا سختی اس بے نیازی کو ان سے جدا نہیں کرسکتی اور یہ بے نیازی اللہ پر ایمان، اعتماد، توکل اور اس کی رضا پر راضی رہنے سے حاصل ہوتی ہے۔ دراصل بے نیازی یہی ہے اور اس سے بڑھکر کوئی بے نیازی

---

(۱) نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۳۔

نہیں ہوسکتی ہے اور حالات کی تبدیلی اس پر اثر انداز نہیں ہوتی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿یا أباذر استغنِ بغنیٰ اللہ تعالیٰ، یغنلك اللہ﴾(۱)

''اے ابوذر اللہ کی بے نیازی کے ذریعہ مستغنی بنو اللہ (واقعاً) بے نیاز بنا دے گا''

مولائے کائنات کا ارشاد ہے:

﴿الغنیٰ باللّٰہ أعظم الغنیٰ، والغنیٰ بغیر اللہ أعظم الفقر والشقاء﴾(۲)

''اللہ کے ذریعہ استغنا سب سے بڑا استغنا ہے اور اللہ کے بغیر استغنا سب سے بڑا فقر اور شقاوت ہے''

اس معیار کے بموجب اللہ پر جتنا زیادہ توکل اور بھروسہ ہوگا انسان اتنا ہی زیادہ مستغنی ہوگا

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿من أحبّ أن یکون أغنیٰ الناس فلیکن بما فی ید اللہ أوثق منه مما فی یده﴾(۳)

''جو سب سے بڑا مستغنی ہونا چاہتا ہے اسے چاہیئے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے اس سے زیادہ اس پر بھروسہ کرے جو خدا کے پاس ہے''

یہ بھی ملحوظ رہے کہ اللہ پر توکل کا مطلب مادی اسباب کو نظر انداز کرنا نہیں ہے مادی اسباب کو نظر انداز کرنا سنت الٰہی سے انحراف ہے اور اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ بلکہ توکل کا مطلب ہے غیر کے بجائے صرف اور صرف ذات پروردگار پر اعتماد و اعتبار کرنا۔ اگر یہ اعتماد ہے تو اپنے مقصود تک پہونچنے کے لئے کسی بھی طرح کے اسباب و وسائل اختیار کرنا توکل کے خلاف نہ ہوگا۔

---

(۱)مکارم الاخلاق ص ۵۳۳۔

(۲)غرر الحکم ج۱ص ۹۱۔۹۲۔

(۳)تحف العقول ص ۲۶۔

بے نیازی (استغنا) کے ذرائع

جن چیزوں کے ذریعہ انسان بے نیازی حاصل کرسکتا ہے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے ہم یہاں پر ان میں سے صرف اہم ترین عوامل کا تذکرہ کریں گے۔

۱۔ یقین: ذات پروردگار پر یقین بے نیازی کا اعلیٰ ترین درجہ ہے اس لئے کہ اگر انسان کو یہ یقین ہو کہ خدا اپنے بندوں پر مہربان رہتا ہے لطف وکرم کرتا ہے ان کی دعائیں قبول کرتا ہے اور یہ بھی یقین ہو کہ وہی رازق ہے رؤوف ورحیم ہے۔ اسکی رحمت وعنایت کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے اسکے خزانہ میں کوئی کمی واقع ہونے والی نہیں ہے اور کثرت عطا سے اسکے جود وکرم میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوتا ہے تو انسان کبھی بھی فقر واحتیاج کا احساس نہیں کرسکتا۔

فقر واحتیاج کا احساس اسی وقت ہوتا ہے کہ جب انسان کے پاس ایسا یقین مفقود ہو اور ایمان، یقین کی منزل تک نہ پہونچا ہو۔ یقین ہی ایمان کا سب سے بلند درجہ ہے بندوں کو ملنے والا سب سے بہترین رزق یقین ہے۔

مولائے کائناتؑ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿مفتاح الغنیٰ الیقین﴾ (۱)

''یقین بے نیازی کی کنجی ہے''

امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے:

﴿کفی بالیقین غنیً، وبالعبادة شغلا﴾ (۲)

''بے نیازی کے لئے یقین کافی ہے اور عبادت بہترین مشغلہ ہے''

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۸ ص ۹۔

(۲) اصول کافی ج ۲ ص ۸۵۔

۲۔تقویٰ: بے نیازی کے اسباب وعوامل میں تقویٰ بھی اہم ترین عامل ہے۔انسان جب احکام خدا کا پابند ہوگا اور حدود الٰہیہ کا خیال رکھے گا تو اللہ اس کے دل کو بے نیاز بنادے گا اور اس کے فقر واحتیاج کو ختم کردے گا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

﴿کفیٰ بالتقیٰ غنیً﴾(۱)

''مستغنی ہونے کے لئے تقویٰ کافی ہے''

امام محمد باقرؑ نے فرمایا:

﴿یاجابر ان أهل التقویٰ هم الأغنیاء،أغناهم القلیل من الدنیا،فمؤنتهم یسیرة،ان نسیت الخیر ذکّروك،وان عملت به أعانوك،أخّروا شهواتهم و لذّاتهم خلفهم،وقدّموا طاعة ربّهم أمامهم﴾(۲)

''اے جابر صاحبان تقویٰ ہی مالدار ہیں ان میں بھی سب سے بڑا غنی وہ ہے دنیا جس کا میں تھوڑا حصہ ہو ان کے اسباب معیشت بہت مختصر ہوتے ہیں اگر تم عمل خیر کو بھول جاؤ تو یہ تمہیں یاد آوری کریں گے اگر تم عمل خیر کروگے تو تمہارے معاون ومددگار ہوں گے وہ اپنے خواہشات کو موخر اور لذتوں کو پس پشت رکھتے ہیں ان کے پیش نظر صرف اطاعت پروردگار ہوتی ہے اور وہ اسی کو مقدم رکھتے ہیں''

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے:

﴿من أخرجه الله تعالیٰ من ذل المعاصی الیٰ عزّ التقویٰ،أغناه الله بلا مال،

---

(۱)تحف العقول ص۳۰۔

(۲)تحف العقول ص۲۰۸۔

و أعزّه بلا عشيرة، و آنسه بلا أنيس﴾(۱)

''خدا جسے گناہوں کی ذلت سے نکال کر تقویٰ کی عزت سے سرافراز کرتا ہے اسے بغیر مال کے غنی، بغیر خاندان وقبیلہ کے عزیز اور ساتھیوں کے بغیر تسکین قلب اور انسیت عطا کر دیتا ہے''

اس حدیث شریف میں نفس کی بے نیازی کے بعینہ وہی معنی پائے جاتے ہیں جو ہم نے بیان کئے ہیں کہ نفس مال وثروت کے بغیر بھی غنی ہو سکتا ہے بغیر خاندان کے صاحب عزت بن سکتا ہے ہم نوا اور مونس کے بغیر بھی اپنی وحشتناک تنہائی کا مداوا کر سکتا ہے۔اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بے نیازی کا منبع وسرچشمہ تقویٰ الٰہی ہے اسی تقوے کے ذریعہ نفس انسانی اپنے اندر عزت وانس کا احساس کرتا ہے اس لئے کہ جب انسان متقی اور حدود واحکام الٰہیہ کا پابند ہوگا تو اللہ بھی اسکے نفس کو غنی بنا دے گا اور اس سے فقر وذلت اور وحشت کو دور رکھے گا۔

جس حدیث قدسی کے بارے میں ہم گفتگو کر رہے ہیں اس کے الفاظ یہ ہیں:

﴿لا يؤثر هواى علىٰ هواه الا جعلت غناه في نفسه﴾

''کوئی بندہ میری مرضی کو اپنی خواہشات پر ترجیح نہیں دے گا مگر یہ کہ میں اسکے نفس میں استغنا پیدا کر دوں گا''

اور مخالفت نفس کا ہی نام تقویٰ ہے جس کا دوسرا نام اطاعت پروردگار ہے۔

۳۔شعور: یقین وتقویٰ اگر بے نیازی اور استغنا کی کنجی ہیں تو فہم وشعور یقین وتقویٰ کی کنجی اور ان تک پہونچنے کا راستہ ہے انسان فقط جہالت کے باعث ہی تقویٰ اور یقین سے محروم ہو سکتا ہے یہاں فہم وشعور سے ہماری مراد تدبر وتعقل ہے اسلامی روایات میں یہ معنیٰ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

---

(۱) وسائل الشیعہ ج۱۱ ص۱۹۱۔

(۲) عدۃ الداعی، ابن فہد حلی۔

امیرالمومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

﴿لاغنیٰ مثل العقل﴾(۱)

''عقل کے مانند کوئی بے نیازی نہیں ہے''

آپؑ ہی کا ارشاد ہے:

﴿ان أغنیٰ الغنیٰ: العقل﴾(۲)

''سب سے بڑی بے نیازی عقل ہے''

نیز آپؑ نے فرمایا ہے:

﴿غنیٰ العاقل بعلمه، وغنی الجاهل بماله﴾(۳)

''عاقل اپنے علم اور جاہل اپنے مال کے ذریعہ مستغنی ہوتا ہے''

مشہور و معروف حدیث کے مطابق امام موسیٰ کاظمؑ نے اپنے صحابی ہشام بن حکم سے فرمایا:

﴿یاهشام: من أراد الغنیٰ بلا مال، وراحة القلب من الحسد، والسلامة فی الدین، فلیتضرّع الیٰ الله فی مسالته بان یکمل عقله﴾(۴)

''اے ہشام جو انسان مال کے بغیر بے نیازی کا خواہاں ہو، اپنے قلب کو حسد سے محفوظ رکھنا چاہتا ہو، دین کی سلامتی چاہتا ہو اس کو تضرع و زاری کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں دعا کرنا چاہئے کہ خداوند عالم اس کی عقل کو سالم کردے''

---

(۱) تحف العقول ص ۱۴۲۔

(۲) نہج البلاغہ حکمت ۳۸۔

(۳) غررالحکم ج ۲ ص ۴۷۔

(۴) تحف العقول ص ۲۸۶۔

حیات انسانی میں بے نیازی کے آثار

انسانی زندگی میں نفس کی بے نیازی کے بہت فائدے ہیں چونکہ پروردگار جس کے نفس کو بے نیازی عطا کرتا ہے وہ ہمیشہ اپنے خدا سے رابطہ کا احساس کرتا ہے اسے ہر وقت یہ احساس رہتا ہے کہ اللہ اس کے ساتھ ہے اور ہر وقت تائید وعنایت الٰہی اس کے شامل حال ہے لہٰذا وہ تائید وعنایت الٰہی کے باعث سکون واطمینان کی زندگی بسر کرتا ہے اسے یہ یقین ہوتا ہے کہ میرا خدا مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑے گا اور نہ ہی کبھی مجھے میرے نفس کے حوالے کرے گا۔

اس طرح اس کی زندگی میں مکمل اعتماد واعتبار، اطمینان، ثبات قدم اور سکون قلب تو نظر آتا ہے مگر کبھی بھی حرص وہوس، حسد، لالچ اور اضطراب وپریشانی نظر نہیں آتی اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام نفسانی بیماریاں نفس کی کمزوری اور فقر سے پیدا ہوتی ہیں جس کی طرف ابھی ہم نے حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کی حدیث کے ذیل میں اشارہ کیا تھا۔

امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے:

﴿أغنیٰ الغنیٰ من لم یکن للحرص أسیراً﴾(۱)

''سب سے بڑا غنی وہ ہے جو حرص وہوس کا اسیر نہ ہو''

امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

﴿أشرف الغنیٰ، ترك المنیٰ﴾(۲)

''شریف ترین بے نیازی، خواہشات کا ترک کرنا ہے''

آپؑ ہی کا ارشاد ہے:

---

(۱) اصول کافی ج۲ ص۳۱۶۔

(۲) اصول کافی ج۸ ص۲۳۔

﴿الغنیٰ الاکبر: الیأس عمّافی أیدی الناس﴾(۱)

''سب سے بڑی بے نیازی یہ ہے کہ انسان اس کا امیدوار نہ ہو جو لوگوں کے پاس ہے''

اور جب مال نفس کو بے نیاز نہ بنا سکے تو پھر وہ اضطراب و بے چینی کا سبب بن جاتا ہے اور انسان کے حرص وطمع اور مشکلات میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ اس سلسلہ میں خداوند عالم کا ارشاد ہے:

﴿انّمایریداللّٰہ لیعذبھم بھافی الحیاۃ الدنیا وتزھق أنفسھم....﴾(۲)

''پس اللہ کا ارادہ یہی ہے کہ انھیں (اموال واولاد) کے ذریعہ ان پر زندگانی دنیا میں عذاب کرے اور حالت کفر میں ہی ان کی جان نکلے''

﴿انّما یرید اللّٰہ أن یعذبھم بھا فی الدنیا و تزھق أنفسھم......﴾(۳)

''اور خدا ان کے (اموال واولاد) ذریعہ ان پر دنیا میں عذاب کرنا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ کفر کی حالت میں ان کا دم نکلے''

۲۔ضمنت السمٰوات:

''زمین وآسمان اسکے رزق کے ضامن ہیں''

یہ جملہ ان لوگوں کی دوسری جزا ہے جو اللہ کے احکام کو اپنے خواہشات پر مقدم رکھتے ہیں اور اپنے خواہشات کو حکم وارادۂ الٰہی کا تابع بنا لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو خدا جزا وانعام سے نوازتا ہے ان کی پہلی جزا تو یہ تھی کہ خدا ان کے نفس کو غنی بنا دیتا ہے جس کے بارے میں ہم تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں اور ان کی دوسری جزا اور انعام یہ ہے کہ آسمان وزمین ان کے رزق کے ضامن ہوتے ہیں۔

---

(۱) نہج البلاغہ حکمت ۳۴۲۔

(۲) سورۂ توبہ آیت ۵۵۔

(۳) سورۂ توبہ آیت ۸۵۔

واضح سی بات ہے کہ اس جملہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان رزق حاصل کرنے کی کوشش ہی نہ کرے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ اس کی سعی کو کامیاب بنادیتا ہے اور اسے توفیق عطا کرتا ہے۔

توفیق

اللہ نے توفیق کی بنا پر زمین وآسمان کو ضامن بنایا ہے کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسانی کوشش رائیگاں چلی جاتی ہے اور اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان برسوں ہاتھ پیر مارتا ہے جدوجہد کرتا ہے لیکن اپنے مقصود تک نہیں پہونچ پاتا اسکے برخلاف کبھی تھوڑی سی جدو جہد ہی نیک اور بابرکت ثمرات کا سبب بن جاتی ہے یہ صرف حسن توفیق اور بے توفیقی کی بات ہے۔اور یہ طے ہے کہ خدا ہی توفیق دینے والا ہے۔

مومن اپنے خواہشات پر احکام خدا کو ترجیح دیتا ہے تو خداوند عالم بطور جزا زمین وآسمان کو اسکے رزق کا ضامن بنادیتا ہے۔تو یہ بھی توفیق کی بنیاد پر ہے۔یہاں توفیق کا مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم اسکی سعی وکوشش کو مفید وکارآمد جگہ پر لگادیتا ہے جس سے یہ سعی وکوشش نتیجہ خیز بن جاتی ہے بالکل اسی طرح جیسے زرخیز زمین پر بارش ہوتی ہے البتہ کبھی بارش ہوتی ہے مگر زمین سے دانہ نہیں اگتا ہے اور بارش کا پانی ضائع ہوجاتا ہے لیکن اگر زرخیز زمین پر تھوڑی سی بارش مناسب موقع پر ہوجائے تو خیر کثیر کا باعث بن جاتی ہے اور سبزہ لہلہانے لگتا ہے۔

توفیق ایک الگ چیز ہے اسکا انسان کی کوشش اور جدوجہد سے کوئی تعلق نہیں ہے انسان جدوجہد کرسکتا ہے مگر توفیق اسکے اختیار میں نہیں ہے۔یہ درست ہے کہ تھوڑے اسباب توفیق انسان کے ہاتھ میں ہیں لیکن جو اسباب توفیق اسکے اختیار میں نہیں ہیں انکی تعداد کئی گنا زیادہ ہے جو سب کے سب خدا کے ہاتھ میں ہیں۔خدا جب کسی بندہ کو توفیق سے نوازتا ہے تو اسکی زندگی اور جدوجہد بابرکت بن جاتی ہے جیسا کہ قرآن مجید نے جناب عیسیٰؑ کی زبانی نقل کیا ہے:

﴿وجعلنی مبارکاً أینما کنت﴾(۱)

''اور مجھے مبارک قرار دیا ہے چاہے میں جہاں رہوں''

جب تک اللہ کسی بندہ کو توفیق کرامت نہ فرمائے یا اسکے لئے بھلائی کا ارادہ نہ کرے تو بندہ اپنی جدوجہد اور عقل کے ذریعہ تھوڑے سے اسباب خیر ہی حاصل کرسکتا ہے۔

﴿لاینفع اجتھاد بغیر توفیق﴾(۲)

''کوئی بھی کوشش توفیق کے بغیر مفید نہیں ہوتی''

اور جب پروردگار عالم کسی بندہ کی بھلائی چاہتا ہے تو اس کو توفیق مرحمت کرتا ہے اور اسکی سعی وکوشش کو فلاح وکامیابی کے راستہ پر لگا دیتا ہے جس سے اسکی سعی وکوشش نتیجہ بخش ہوجاتی ہے۔

حضرت علی ؑ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿خیر الاجتھاد ما قارنہ التوفیق﴾(۳)

''بہترین کوشش وہ ہے جو توفیق کے ساتھ ہو''

دوسری حدیث میں وارد ہوا ہے:

﴿التوفیق أشرف الحظین﴾(۴)

''توفیق دو اشرف واعلیٰ حصوں میں سے ایک ہے''

اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کے پاس کچھ ایسے اسباب خیر وسعادت ہوتے ہیں جنھیں وہ اپنی عقل اور جدوجہد کے سہارے حاصل کرتا ہے یا وہ وسائل وذرائع ہوتے ہیں جو اللہ نے اسے عطا

---

(۱)سورۂ مریم آیت ۳۱۔

(۲)غرر الحکم ج۲ص ۳۴۵۔

(۳)غرر الحکم ج۲ص ۳۵۱۔

(۴)غرر الحکم ج۱ص ۸۲۔

کئے ہیں یہ بھی نتیجہ تک پہونچنے میں شریک ہیں مگر ان کا حصہ اور ان کی منزلت کم ہے۔دوسرا اجزا اور حصہ خیر و برکت کے وہ غیبی اسباب ہیں جنہیں اللہ اپنے بندہ کے شامل حال کرتا ہے یا جب بندہ کو اس کی سعی وکوشش سے اسباب خیر میسر نہیں ہوتے تو اللہ اسے خیر وسعادت کی راہ پر لگادیتا ہے یہ دوسرا حصہ ہے جو حدیث کے مطابق زیادہ مخفی ہوتا ہے۔

بلاشبہ توفیق جو ایک غیبی سبب ہے اور انسان کو خیر و برکت کی راہ دکھاتا ہے۔انسان کے پاس موجود دیگر عقلی اور فطری امکانات اور قوتوں سے جدا ایک چیز ہے اگر چہ یہ قوتیں اور صلاحتیں بھی عطائے پروردگار ہیں لیکن تنہا یہ صلاحتیں انسان کو خیر وسعادت کی منزل تک پہونچانے کے لائق نہیں ہیں یعنی صرف انھیں کے سہارے انسان شر سے محفوظ نہیں رہ سکتا ہے بلکہ پروردگار جب کسی بندہ کے لئے خیر کا ارادہ کرتا ہے تو اسکی سعی وکوشش اور صلاحیتوں کو خیر کے صحیح راستوں پر بروئے کار لانے میں اسکی مدد کرتا ہے۔مندرجہ ذیل حدیث اس حقیقت کی صاف وضاحت کرتی ہے۔

روایت میں ہے کہ ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ سے سوال کیا:

﴿یا بن رسول اللّه! ألست أنا مستطیعاً لما کُلِّفتُ؟فقال له(ع):﴿ما الاستطاعة عندك؟﴾ قال:القوة علی العمل،قال له(ع):﴿قد أُعطیت القوة،ان أُعطیت﴿المعونة﴾،قال له الرجل:فما المعونة ؟ قال(ع):﴿التوفیق﴾،قال(الرجل): فلم إعطاءُ التوفیق؟ قال(الامام)(ع): هل تستطیع بتلك القوة دفع الضرر عن نفسك،وأخذ النفع الیها بغیر العون من اللّه تبارك وتعالیٰ؟﴾قال:لا، قال(ع):﴿فلم تنتحل مالا تقدر علیه؟﴾ثم قال:﴿أین أنت من قول العبد الصالح:﴿وما توفیقی الا باللّه﴾(۱)

---

(۱)بحار الانوار ج۵ص۴۲۔''وماتوفیقی الاباللّه علیه توکلت والیه أُنیب''''میری توفیق صرف اللہ سے وابستہ ہے اسی پر میرا اعتماد ہے اور اسکی طرف میں توجہ کر رہا ہوں'' سورۂ ہود آیت ۸۸۔

"فرزند رسول اللہ! جب مجھے مکلف بنایا گیا ہے تو کیا میں مستطیع نہیں ہوں؟امامؑ نے فرمایا:استطاعت سے تمہاری مراد کیا ہے؟اس نے جواب دیا کہ عمل بجالانے کی قوت وطاقت'امام نے فرمایا:یہ درست ہے کہ تمہیں قوت دی گئی ہے مگر کیا تمہیں "معونہ" بھی نصیب ہوا ہے؟اس شخص نے سوال کیا:یہ معونہ کیا ہے؟امامؑ نے فرمایا:توفیق!اس شخص نے (تعجب سے) پوچھا:توفیق عطا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟امامؑ نے فرمایا کہ:کیا تم اللہ کی مدد کے بغیر صرف اپنی قوت کے ذریعہ اپنے کونقصانات سے محفوظ رکھ سکتے ہواور فائدے حاصل کرسکتے ہو؟اس نے جواب دیا ہرگز نہیں:پھر امامؑ نے دریافت فرمایا:پھر تم عبد صالح کے اس جملہ کا کیا مطلب سمجھتے ہو کہ"میری توفیق صرف اللہ سے وابستہ ہے"

اس روایت کے مطابق انسانی زندگی میں تین طرح کی قوتیں اور عوامل کارفرما ہیں:

۱۔وہ طبیعی اور سماجی قوانین جو انسان کو خیر یا شر کی جانب لے جاتے ہیں۔

۲۔وہ قوتیں اور صلاحتیں جو پروردگار عالم نے انسانی وجود میں رکھی ہیں اور جنھیں انسان طبیعت یا سماج میں خیر وشر تک رسائی حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔

۳۔توفیق وامداد الٰہی جس کے ذریعہ پروردگار اپنے بندوں کو اسباب خیر تک پہونچاتا ہے اوران مخفی اسباب کے لئے بندوں کی مدد کرتا ہے جو عام لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھے یا جن تک رسائی ممکن نہ تھی اس آخری سبب کے بغیر خیر تک پہونچنا ممکن نہیں ہے۔

کراجکی نے اپنی کتاب"کنز"میں روایت کی ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

﴿ما کلّ من نویٰ شیئاً قدرعلیه،وما کل من قدر علیٰ شیٔ وُفّق له...﴾(۱)

"ایسا نہیں ہے کہ ہر انسان ہر اس چیز پر قدرت بھی رکھتا ہو جس کی اس نے نیت کی ہے اور نہ ہی ایسا ہے کہ جو مقدور ہو اسکی توفیق بھی حاصل ہو اور نہ ہی ایسا ہے کہ جسکی توفیق حاصل ہو وہ شے خود

---

(۱)بحارالانوار ج۵ص۲۰۹۔۲۱۰۔

حاصل بھی ہوجائے۔ جب نیت، قدرت اور توفیق کے ساتھ وہ چیز بھی حاصل ہوجائے تو سعادت مکمل کہلاتی ہے"

توفیق، معرفت پروردگار کا بہت وسیع باب ہے اگر چہ اللہ کی معرفت کے تین راستے ہیں:

۱۔فطرت

۲۔عقل (عقلی دلیلوں کے ذریعہ)

۳۔تعامل مع اللہ (اللہ کے ساتھ تجارت اور معاملہ)

"تعامل مع اللہ" معرفت کا ایک وسیع دروازہ ہے لیکن اس دروازہ میں صرف صاحبان بصیرت داخل ہو سکتے ہیں اور اسکے ذریعہ انسان کو ایمان، اعتبار و اطمینان اور توکل کا وہ درجہ حاصل ہوتا ہے جو فطرت اور عقل کے ذریعہ حاصل کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ خداوند عالم کے ساتھ معاملہ اور اس کی عطا کے ساتھ لین دین اور اللہ تعالیٰ کے قرب اور اس کی معیت کی وجہ سے ہی تائید خداوندی اور اس کی توفیق ہر حال میں انسان کے شامل حال ہوتی ہے۔

توفیق الٰہی یونہی کسی انسان کے شامل حال نہیں ہوجاتی بلکہ توفیق نازل ہونے کے اپنے اسباب وقوانین اور اصول ہیں۔ جسے پروردگار نے توفیق جیسی نعمت عطا کی ہے یقیناً وہ اس لائق تھا کہ ایسی رحمت الٰہی اس کو نصیب ہو اور جو توفیق سے محروم ہے یقیناً اس نے اس عظیم نعمت کے نزول و حصول کے مواقع ضرور گنوائے ہیں ورنہ رحمت الٰہی میں بخل و کنجوسی کا دخل نہیں ہے اور نہ ہی اسکا خزانۂ رحمت ختم ہونے والا ہے۔ یہ عظیم نعمت اسی کے حصہ میں آتی ہے جس کے شامل حال خدا کی توفیق ہوتی ہے اور اس نعمت سے محروم صرف وہی ہوتا ہے کہ جسے توفیق نصیب نہ ہو۔ توفیق جیسی نعمت پانے والے افراد بھی برابر نہیں ہوتے بلکہ استحقاق، صلاحیت، لیاقت اور ظرف کے اعتبار سے ان کی توفیق کے مراتب ودرجات بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔

اسکی بارگاہ سے رحمت، توفیق کی شکل میں بے حساب نازل ہوتی رہتی ہے البتہ اس سے صرف وہی لوگ محروم رہتے ہیں جن کا نفس بداعمالیوں کے باعث گھاٹے میں ہے اور جنھوں نے اپنے آپ کو اور اپنے باطن اور ظرف کو اسکے حصول کے قابل نہیں بنایا ہے جبکہ ان کے برخلاف صاحبان ایمان اپنی استعداد اور ظرف کے مطابق اس نعمت سے بہرہ مند ہوتے رہتے ہیں۔(۱)

رزق اگرچہ عالم ظاہر وشہود کا معاملہ ہے لیکن آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مسئلہ رزق سے غیبی اسباب کا کتنا گہرا تعلق ہے۔

عالم غیب اور عالم شہود (ظاہر) کے درمیان رابطہ

مسئلہ ''غیب'' اور ''غیب وشہود کا تعلق'' جیسے مسائل اسلامی نظریات کے بنیادی مسائل میں شمار ہوتے ہیں اور اس سلسلہ میں لوگوں کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔کچھ ایسے افراد بھی ہیں جو سرے سے غیب کے منکر ہیں کچھ شہود کے مقابل غیب کا اقرار تو کرتے ہیں لیکن ان دونوں کے درمیان رابطہ کے منکر ہیں۔

اسلام ''غیب'' کو صرف تسلیم ہی نہیں کرتا بلکہ ''غیب'' پر ایمان کی دعوت دیتا ہے اور ''ایمان بالغیب'' کو اسلام کی سب سے پہلی شرط قرار دیتا ہے۔

﴿الٓمٓ ☆ ذلک الکتاب لاریب فیه هدیً للمتقین ☆ الذین یؤمنون بالغیب ویقیمون الصلاۃ و مما رزقناهم ینفقون﴾(۲)

''یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی طرح کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے یہ صاحبان تقویٰ اور پرہیزگار لوگوں کیلئے مجسم ہدایت ہے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں پابندی سے پورے اہتمام کے ساتھ

---

(۱)مؤلف کی کتاب ''المذهب التاریخی فی القرآن الکریم'' سے اقتباس، معمولی تبدیلی کے ساتھ صفحہ ۴۰۔۳۹۔

(۲)سورۂ بقرہ آیت ۱۔۳۔

نماز ادا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے رزق دیا ہے اس میں سے ہماری راہ میں خرچ بھی کرتے ہیں"

﴿الذین یخشون ربھم بالغیب وھم من الساعۃ مشفقون﴾(۱)

"جو از غیب اپنے پروردگار سے ڈرنے والے ہیں اور قیامت کے خوف سے لرزاں ہیں"

﴿انما تنذر من اتبع الذکر وخشی الرحمٰن بالغیب﴾(۲)

"آپ صرف ان لوگوں کو ڈرا سکتے ہیں جو نصیحت کا اتباع کریں اور بغیر دیکھے از غیب خدا سے ڈرتے رہیں"

اسلام عالم غیب اور عالم شہود کے درمیان ربط کا بھی قائل ہے اس کا یہ نظریہ ہے کہ ان دونوں وسیع افقوں کو جوڑنے والے بہت سے پل بھی پائے جاتے ہیں ان تمام باتوں سے بڑھکر اسلام کا عقیدہ ہے کہ دونوں عالم ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں یعنی عالم غیب، عالم ظاہر ومحسوس پر اثر انداز ہوتا ہے اور عالم محسوس وظاہر غیب پر، اگر انسان متقی و پرہیزگار ہے۔ ایمان بالغیب کے باعث دل میں خشیت الٰہی پائی جاتی ہے اور وہ گناہوں سے کنارہ کش رہتا ہے تو یہ چیزیں براہ راست انسان کی مادی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ معاش حیات کی سختیاں آسانیوں میں تبدیل ہوجاتی ہیں اور رزق کے دروازے اسکے لئے کھل جاتے ہیں۔ ارشاد پروردگار ہے:

﴿ومن یتق اللّٰہ یجعل لہ مخرجاً☆ویرزقہ من حیث لا یحتسب﴾(۳)

"اور جو بھی اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اسکے لئے نجات کی راہ پیدا کردیتا ہے، اور اسے ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جسکا وہ گمان بھی نہیں کرتا ہے"

---

(۱) سورۂ انبیاء آیت ۴۹۔

(۲) سورۂ یٰس آیت ۱۱۔

(۳) سورۂ طلاق آیت ۲۔۳۔

﴿ومن يتق الله يجعل له من أمره يسرا﴾(۱)

اور جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اسکے امر میں آسانی پیدا کر دیتا ہے"

یہ تو تھا عالم ظاہر و محسوس کا عالم غیب سے تعلق۔ اسکے برخلاف عالم غیب کا بھی عالم ظاہر سے تعلق پایا جاتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے:

﴿لو لا الخبز ما صلّينا﴾(۲)

"اگر روٹی کا مسئلہ نہ ہوتا تو ہم نماز نہ پڑھتے"

آپ ہی سے منقول ہے: ﴿وبه (الخبز) صمتم﴾(۳)

"تم لوگوں کے روزے اسی روٹی کیلئے ہیں"

آپ ہی کا ارشاد گرامی ہے:

﴿فلو لا الخبز ما صلّينا و لا صمنا، و لا أدّينا فرائض ربنا عزّ و جلّ﴾(۴)

"اگر روٹی (کی بات) نہ ہوتی تو نہ ہم نماز پڑھتے اور نہ روزہ رکھتے اور نہ ہی اپنے پروردگار کے احکام بجالاتے"

حرکت تاریخ کے سلسلہ میں غیبی عامل کا کردار

عالم غیب اور عالم محسوس میں اسی رابطہ کی بنا پر قرآن کریم "غیب" کو حرکت تاریخ کا اہم سبب شمار کرتا ہے اور تاریخ کے پیچھے مادی سبب کو بھی تسلیم نہیں کرتا چہ جائیکہ مادیت کو تاریخ کا تنہا محرک

---

(۱) سورۂ طلاق آیت ۴۔

(۲) اصول کافی ج۵ ص ۷۳۔

(۳) اصول کافی ج۶ ص ۳۰۲۔

(۴) اصول کافی ج۵ ص ۷۳۔

مانا جائے بلکہ بسا اوقات ایسا بھی دکھائی دیتا ہے کہ تاریخ مادی عوامل کے تقاضوں کے برخلاف حرکت کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ذرا قرآن کریم کی ان آیات میں غور وخوض کیجئے:

﴿لقد نصركم الله في مواطن كثيرة ويوم حنينٍ اذ أعجبتكم كثرتكم فلم تغنِ عنكم شيئاً وضاقت عليكم الارض بما رحبت ثم ولّيتم مدبرين☆ثم أنزل الله سكينته علىٰ المؤمنين وأنزل جنوداً لم تروها وعذّب الذين كفروا وذٰلك جزاء الكافرين﴾(۱)

''بیشک اللہ نے اکثر مقامات پر تمہاری مدد کی ہے اور حنین کے دن بھی جب تمہیں اپنی کثرت پر ناز تھا لیکن اس (کثرت) نے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہونچایا اور تمہارے لئے زمین اپنی وسعتوں سمیت تنگ ہوگئی اور اسکے بعد تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے، پھر اسکے بعد اللہ نے اپنے رسول اور صاحبان ایمان پر سکون نازل کیا اور وہ لشکر بھیجے جنہیں تم نے نہیں دیکھا اور کفر اختیار کرنے والوں پر عذاب نازل کیا کہ یہی کافرین کی جزا اور ان کا انجام ہے''

ان آیات کریمہ سے پہلا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ فتح وکامرانی عطا کرنے والا خدا ہے۔ مادی اسباب ووسائل صرف ذریعہ ہیں کامیابی دینے والا اصل میں خدا ہے۔تاریخ کی حرکت کو سمجھنے کے لئے بنیادی نقطہ یہی ہے اور یہیں سے اسلامی نظریہ، مادیت کے نظریہ سے جدا ہو جاتا ہے۔

آیات کریمہ میں دوسرا اہم تذکرہ لشکر اسلام کی کثرت کے باوجود حنین کی جنگ کا نقشہ منقلب ہونا ہے حالانکہ مادی نگاہ رکھنے والوں کے نزدیک افراد کی کثرت فتح کا سبب ہوتی ہے۔''اور حنین کے دن بھی جب تمہیں اپنی کثرت پر ناز تھا لیکن اس نے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہونچایا اور

---

(۱)سورۂ توبہ آیت ۲۵۔۲۶۔

تمہارے لئے زمین اپنی وسعتوں سمیت تنگ ہوگئی اور اسکے بعد تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔

آیات کریمہ میں تیسرا تذکرہ اللہ کی جانب سے اپنے رسول اور مومنین پر عین میدان جنگ میں سکینہ نازل ہونا ہے۔اسی سکینہ کے باعث شدت کے لحات میں انہیں اطمینان وسکون حاصل ہوا اور وہ میدان جنگ میں ثابت قدم رہ سکے اور ان کے دلوں سے خوف واضطراب زائل ہوا یہ سکینہ فقط خدا کی جانب سے تھا اللہ نے فرشتوں کا نہ دکھائی دینے والا لشکر نازل کیا جو لشکر کفار کو ہزیمت پر مجبور کر رہا تھا ان کی صفوں میں رعب پھیلا رہا تھا اسکے برخلاف دشمن سے مقابلہ کے لئے مومنین کے دلوں کو تقویت عطا کر رہا تھا۔

اب ہم سورۂ آل عمران کی ان آیات کو پڑھیں:

﴿بلیٰ ان تصبروا وتتقوا ویأتوکم من فورهم هذا یُمددکم ربّکم بخمسة آلاف من الملائکة مسوّمین ☆ وما جعله الله الا بشریٰ لکم ولتطمئنّ قلوبکم به وما النصر الا من عندالله العزیز الحکیم﴾(۱)

''یقیناً اگر تم صبر کروگے اور تقویٰ اختیار کروگے اور دشمن فی الفور تم تک آجائیں تو خدا پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کریگا جن پر بہادری کے نشان لگے ہوں گے۔اور اس امداد کو خدا نے صرف تمہارے لئے بشارت اور اطمینان قلب کا سامان قرار دیا ہے ورنہ مدد تو صرف خدائے عزیز وحکیم کی طرف سے ہوتی ہے''

جنگ کی شدت اور سختیوں کے دوران پانچ ہزار ملائکہ کے ذریعہ غیبی امداد نے فیصلہ مسلمانوں کے حق میں کرادیا۔اللہ نے ملائکہ کے ذریعہ مومنین کے دلوں کو سکون واطمینان عطا کیا اور اس طرح سخت ترین لحات میں انہیں اسطرح بشارت وخوش خبری سے نوازا۔اسی آیہ شریفہ میں اس

---

(۱)سورۂ آل عمران آیت ۱۲۵۔۱۲۶۔

بنیادی نقطہ کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جو نقطہ تاریخ کی حرکت کے بارے میں اسلام اور مادیت کے درمیان حد فاصل ہے ﴿وما النصر الا من عندالله العزیز الحکیم﴾ فتح وکامرانی صرف اور صرف اللہ کی جانب سے ہے جنگ احد میں جیتی ہوئی جنگ کا نقشہ پلٹ جانے کے بعد مومنین کو سکھائے گئے اسباق سورۂ آل عمران میں موجود ہیں:

﴿ولا تهنوا ولا تحزنوا وأنتم الاعلون ان کنتم مؤمنين﴾(۱)

''خبردار سستی نہ کرنا مصائب پر محزون نہ ہونا، اگر تم صاحب ایمان ہو تو سربلندی تمہارے ہی لئے ہے''

میدان جنگ میں یہ برتری خدا پر ایمان سے پیدا ہوتی ہے۔ ایمان کے بعد پھر کہیں ان مادی اسباب وعوامل کی باری آتی ہے جنکی ضرورت میدان جنگ میں پڑتی ہے۔

سورۂ اعراف میں بھی یہی مضمون نظر آتا ہے:

﴿ولو أنّ أهل القریٰ آمنوا واتّقوا لفتحنا عليهم برکاتٍ من السماء والارض ولکن کذّبوا فأخذناهم بما کانوا یکسبون﴾(۲)

''اور اگر اہل قریہ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کر لیتے تو ہم ان کے لئے زمین وآسمان سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے لیکن انھوں نے تکذیب کی تو ہم نے ان کو ان کے اعمال کی گرفت میں لے لیا۔''

''پروردگار عالم اپنے بندوں پر زمین وآسمان کی برکات کے دروازے کھول دیتا ہے'' یہ چیز ایمان وتقوے سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ اسکے ساتھ ضمنی طور پر مادی وسائل بھی درکار ہوتے ہیں۔

یہ تصویر کا ایک رخ تھا جو کہ مثبت رخ تھا کہ کس طرح میدان جنگ میں ایمان اور تقوی سے

---

(۱) سورۂ آل عمران آیت ۱۳۹۔

(۲) سورۂ اعراف آیت ۹۶۔

فتح و کامرانی ملتی ہے معاشی زندگی میں وسعت رزق، آسانیاں اور خوشیاں میسر ہوتی ہیں۔ اسکے برخلاف عالم غیب اور عالم محسوس کا یہی تعلق اور رابطہ غلطیوں اور گناہوں میں مبتلا ہونے اور حدود الٰہی سے تجاوز، تہذیبوں کے خاتمہ اور امتوں کی تباہی و بربادی کا سبب بھی ہوتا ہے۔

سورۂ انعام کی ان آیات کو غور سے پڑھئے:

﴿الم یرواکم أھلکنامن قبلھم من قرنٍ مکنّاھم فی الارض مالم نمکّن لکم وأرسلنا السماء علیھم مدراراً وجعلنا الانھارتجری من تحتھم فأھلکناھم بذنوبھم وانشأنا من بعدھم قرناً آخرین﴾(۱)

''کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی نسلوں کو تباہ کر دیا ہے جنہیں تم سے زیادہ زمین میں اقتدار دیا تھا اور ان پر موسلا دھار پانی بھی برسایا تھا ان کے قدموں میں نہریں بھی جاری تھیں پھر ان کے گناہوں کی بنا پر انہیں ہلاک کر دیا اور ان کے بعد دوسری نسل جاری کر دی''

یہ ہلاکت و بربادی بے عملی، عصیان اور گناہوں کی وجہ سے تھی مادیت کو تاریخ کا محرک سمجھنے والوں کی نگاہ میں ان اسباب کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے جبکہ قرآن بداعمالیوں کو بھی بربادی کا سبب مانتا ہے۔

اسی سورۂ مبارکہ کی یہ آیات کریمہ بھی ملاحظہ فرمائیں جن میں قرآن مجید نے تسلسل کو مکمل طور پر پیش کر دیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿ولقد ارسلناإلیٰ امم من قبلك فاخذناھم بالبأسآء والضرّآء لعلھم یتضرعون☆ فلو لااذجاء ھم بأسنا تضرّعوا ولکن قست قلوبھم و زیّن لھم الشیطان ماکانوا یعملون☆فلمانسوا ما ذکّروا بہ فتحنا علیھم أبواب کل شیٔ حتّٰی اذا فرحوابما اُوتوا أخذنٰھم بغتۃً فاذا ھم مبلسون☆فقطع

---

(۱) سورۂ انعام آیت ۶۔

دابر القوم الذین ظلموا والحمد للہ ربّ العالمین﴾(۱)

''ہم نے تم سے پہلے والی امتوں کی طرف بھی رسول بھیجے ہیں اسکے بعد انہیں سختی اور تکلیف میں مبتلا کیا کہ شاید ہم سے گڑگڑائیں۔ پھر ان سختیوں کے بعد انہوں نے کیوں فریاد نہیں کی؟ بات یہ ہے کہ ان کے دل سخت ہو گئے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لئے آراستہ کردیا ہے۔ پھر جب وہ ان نصیحتوں کو بھول گئے جو انہیں یاد دلائی گئی تھیں تو ہم نے امتحان کے طور پر ان کے لئے ہر چیز کے دروازے کھول دئے، یہاں تک کہ جب وہ ان نعمتوں سے خوشحال ہو گئے تو ہم نے اچانک انہیں اپنی گرفت میں لے لیا، اور وہ مایوس ہو کر رہ گئے، پھر ظالمین کا سلسلہ منقطع کردیا گیا اور ساری تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو رب العالمین ہے''

تمام امتوں کے آغاز سے لیکر ان کے انجام تک تین مرحلے ہیں جن کی طرف ان آیات کریمہ میں اشارہ پایا جاتا ہے اسی طرح ان تینوں مرحلوں میں عالم غیب اور عالم محسوس کے درمیان رابطہ کی وضاحت پائی جاتی ہے۔

پہلا مرحلہ

یہ آزمائش کا مرحلہ ہے اس مرحلہ میں پروردگار امتوں کو نعمتوں اور صلاحیتوں سے نوازتا ہے۔ اس مرحلہ میں گناہ و معصیت نزول بلا اور بارگاہ خداوندی میں تضرع وزاری بلاؤں سے نجات کا ذریعہ بنتی ہے۔

﴿فاخذناھم بالبأساء والضرّاء لعلّھم یتضرّعون﴾

''اسکے بعد ہم نے انہیں سختی اور تکلیف میں مبتلا کیا کہ شاید ہم سے گڑگڑائیں''

گناہ سے بلاؤں کا نازل ہونا اور تضرع وزاری سے بلاؤں کا برطرف ہونا یہ دراصل عالم

---

(۱) سورۂ انعام آیت ۴۲۔۴۵۔

غیب اور عالم محسوس کے رابطہ کو بیان کرتا ہے اور اس نقطہ تک مادی فکر کی رسائی نہیں ہو سکتی ہے یہ بات ہمیں کتاب خدا سے معلوم ہوئی ہے۔

دوسرا مرحلہ

مہلت اور چھوٹ کا مرحلہ ہے۔ اس مرحلہ میں بھی عالم غیب و محسوس کا تعلق نمایاں ہے اس لئے کہ برائیوں اور گناہوں میں غرق ہو جانے اور آزمائش کے مرحلہ میں مصائب و مشکلات کو نظر انداز کرتے رہنے کے باوجود کبھی کبھی امت پر نعمت کا دروازہ بند نہیں ہوتا لیکن اس مرحلہ میں رزق، نعمت نہیں بلکہ عذاب ہوتا ہے اور اللہ اس طرح انہیں ان کی سرکشی میں چھوٹ دیکر ان کی رسی دراز کر دیتا ہے تا کہ پھر اچانک ایک دم پوری سختی و قوت کے ساتھ انہیں جکڑ لے:

﴿فلما نسوا ما ذکروا به فتحنا علیهم أبواب کلّ شیٴ﴾(۱)

''پھر جب وہ ان نصیحتوں کو بھول گئے جو انہیں یاد دلائی گئی تھیں تو ہم نے امتحان کے طور پر ان کے لئے ہر چیز کے دروازے کھول دئے''

تیسرا مرحلہ

بربادی اور نابودی کا مرحلہ ہے:

﴿فقطع دابر القوم الذین ظلموا والحمد لله ربّ العالمین﴾(۲)

''پھر ظالمین کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا اور ساری تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو رب العالمین ہے''

حمد خدا یہاں عذاب پر ہے نعمت پر نہیں۔ یعنی نعمت حیات کے بجائے ''سرکش افراد کی'' نابودی اور ہلاکت پر حمد و ثنائے الٰہی کی جا رہی ہے۔

---

(۱) سورۂ انعام آیت ۴۴۔

(۲) سورۂ انعام آیت ۴۵۔

عالم غیب ومحسوس کا رابطہ اس مرحلہ میں بھی گذشتہ مراحل سے جدا نہیں ہے کیونکہ جب افراد قوم اکڑتے ہیں روئے زمین پر سرکشی اور تکبر کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ان چیزوں میں فرحت محسوس کرتے ہیں تو ان پر ایسا عذاب نازل ہوتا ہے کہ پوری قوم نیست ونابود ہوجاتی ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر میں غیبی عامل، حرکت تاریخ کا اہم عنصر ہے۔

غیبی عامل، مادی عوامل کا منکر نہیں

اگر چہ اسلام کی نگاہ میں حرکت تاریخ کا اہم عنصر غیبی عامل ہے مگر اسکا ہر گز یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام انسانی زندگی میں مادی عوامل کو تسلیم ہی نہیں کرتا بلکہ در حقیقت حرکت تاریخ کا عامل، کسی ایک چیز کو ماننے کے بجائے اسلام متعدد اور مشترکہ عوامل کا قائل ہے یعنی غیبی اور مادی عوامل ایک ساتھ مل کر تاریخ کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اور ان میں سے صرف کوئی ایک عامل تاریخ کا محرک نہیں ہے وہ مادی عامل ہو یا معنوی۔ اسلام کی نگاہ میں زندگی بسر کرنے کے لئے ان دونوں عوامل کو بروئے کار لانا ضروری ہے۔

تقویٰ اور رزق کا تعلق

جب عالم غیب اور عالم محسوس کا تعلق اور ربط واضح ہوگیا'' تو آیئے ایک نگاہ، حدیث قدسی کے اس فقرہ پر ڈالتے ہیں:

﴿لا یؤثر عبد هوای علی هواه الاضمنت السموات والارض رزقه﴾

'' کوئی بندہ اگر اپنی خواہشات پر میرے احکام اور مرضی کو ترجیح دے گا تو میں زمین وآسمان کو اسکے رزق کا ضامن بنادوں گا'' عالم غیب وعالم محسوس کے درمیان تعلق کی گذشتہ توضیح کے پیش نظر غیب اور معنویت سے تعلق رکھنے والے ''تقویٰ'' اور عالم غیب وعالم محسوس وشہود سے تعلق رکھنے والے ''رزق'' کے درمیان ربط کی وضاحت کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہ جاتی۔

اسلامی تہذیب میں یہ نظریہ بالکل واضح وروشن ہے اس لئے کہ تقویٰ بھی رحمت الٰہی کا وسیع

دروازہ ہے تقوے کے ذریعہ انسان اللہ سے رزق نازل کراسکتا ہے۔تقوے سے ہی باران رحمت نازل ہوتی ہے اور مشکلات برطرف ہوتی ہیں تقوے کے سہارے ہی اللہ کی جانب سے فتح وکامیابی میسر ہوتی ہے۔اسی کے طفیل بند دروازے کھل جاتے ہیں تقوے کی ہی بدولت خداوند عالم زندگی کے مشکلات میں لوگوں کے لئے آسانیاں فراہم کرتا ہے۔جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ومن يتق الله يجعل له مخرجاً☆ويرزقه من حيث لايحتسب ومن يتوكّل على الله فهو حسبه انّ الله بالغ أمره قد جعل الله لكلّ شي ء قدرا﴾

''اور جو بھی اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لئے نجات کی راہ پیدا کردیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جس کا خیال بھی نہیں ہوتا ہے اور جو خدا پر بھروسہ کریگا خدا اسکے لئے کافی ہے بیشک خدا اپنے حکم کا پہنچانے والا ہے اس نے ہر شے کے لئے ایک مقدار معین کردی ہے۔''(۱)

جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ومن يتّق الله يجعل له من أمره يُسراً﴾(۲)

''اور جو خدا سے ڈرتا ہے خدا اسکے معاملات میں آسانی پیدا کردیتا ہے''

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

﴿لوأن السمٰوات والارض كانتا رتقاً علىٰ عبد ثم اتقىٰ الله لجعل الله منهما فرجاً ومخرجاً﴾(۳)

''اگر کسی بندے پر زمین وآسمان کے دروازے بالکل بند ہوجائیں پھر وہ تقوائے الٰہی اختیار کرے تو اللہ اسکو زمین وآسمان میں کشادگی اور آسانیاں عطا کردے گا''

---

(۱)سورۂ طلاق آیت ۲۔۳۔

(۲)سورۂ طلاق آیت ۴۔

(۳)بحار الانوار ج ۷۰ ص ۲۸۵۔

روایت کے مطابق جب حضرت ابوذر(رح) ربذہ کے لئے جلاوطن کئے گئے تو ان سے امیرالمومنین حضرت علیؑ نے فرمایا:

﴿یاأباذر؛ انك غضبت لله فارجُ من غضبت له،ولوأن السموٰات والارض کانتاعلیٰ عبد رتقاً ثم اتقیٰ اللہ لجعل منهمافرجاًومخرجاً﴾(۱)

''اے ابوذر تمہاری ناراضگی اور غضب اللہ کے لئے تھا لہٰذا اسی کی ذات سے لو لگائے رکھنا۔اگر زمین وآسمان کے راستے کسی بندہ پر بند ہو جائیں اور وہ تقوائے الٰہی اختیار کرے تو اللہ اسکے لئے زمین وآسمان میں آسانیاں فراہم کردے گا''

مولائے کائنات حضرت علیؑ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿من أخذ بالتقویٰ عزبت(غابت)عنه الشدائد بعد دنوّها،واحلولت له الامور بعد مرارتها،وانفرجت عنه الامواج بعد تراکمها،وأسهلت له الصعاب بعد انصابها﴾(۲)

''جوتقویٰ اختیار کرے گا شدائد ومصائب اس سے نزدیک ہونے کے بعد دور ہو جائیں گے تلخیوں کے بعد حلاوت محسوس کرے گا۔امواج بلا اسکے گرد جمع ہونے کے بعد پراکندہ ہو جائیں گی مشکلات پڑنے کے بعد آسانیوں میں تبدیل ہو جائیں گی''

امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے:

﴿من اعتصم باللہ بتقواہ عصمه اللہ،ومن أقبل اللہ علیه وعصمه لم یبال لو سقطت السماء علیٰ الارض،وان نزلت نازلة علیٰ أهل الارض فتشملهم بلیة،کان فی حرز اللہ بالتقویٰ من کل بلیة،ألیس اللہ تعالیٰ یقول:ان المتقین فی مقام أمین﴾

---

(۱)نہج البلاغہ خطبہ ۱۳۰۔

(۲)نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۸۔

''جوتقوائے الٰہی کی پناہ میں آئے گا اللہ اسے محفوظ رکھے گا اور جس کی طرف اللہ کی توجہ ہوجائے اور اللہ اسے محفوظ رکھے تو چاہے آسمان، زمین پر گر جائے اسے کوئی پرواہ نہیں ہوتی اگر تمام اہل زمین پر کوئی بلا نازل ہوتو وہ تقوے کے باعث امان خدا میں رہے گا۔کیا خدا کا یہ قول نہیں ہے:

﴿ان المتقین فی مقام أمین﴾(۱)

''بیشک متقین امن کے مقام پر ہیں''

امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ:

﴿ان اللہ قد ضمن لمن اتّقاہ أن یحوّلہ عمایکرہ الیٰ مایحب ویرزقہ من حیث لایحتسب﴾(۲)

''اللہ نے متقی کی ضمانت لی ہے کہ اسکے ناپسندیدہ امور کو پسندیدہ امور میں تبدیل کردے گا اور اسے ایسے راستہ سے رزق عطا کرے گا جس کا اسے گمان بھی نہ ہوگا''

امام محمد تقیؑ نے سعد الخیر کو تحریر فرمایا:

﴿ان اللہ عزّوجل یقی بالتقویٰ عن العبد ماغرب عنہ عقلہ،ویجلّی بالتقویٰ عماہ وجھلہ،وبالتقویٰ نُجّی نوح ومن معہ فی السفینۃ،وصالح ومن معہ من الصاعقۃ،وبالتقویٰ فاز الصابرون ونجت تلک العصب من المھالک﴾(۳)

''پروردگار عالم،تقویٰ کے ذریعہ اپنے بندہ سے ان چیزوں کو محفوظ رکھتا ہے جو اسکی عقل سے مخفی تھیں اور تقویٰ کے ذریعہ اسے مکمل بینائی عطا کردیتا ہے اور ان چیزوں کو بھی دکھادیتا ہے جو جہالت کے باعث اس سے پوشیدہ تھیں۔تقویٰ کے باعث ہی نوحؑ اور کشتی میں سوار ان کے ساتھیوں

---

(۱)بحارالانوار ج۷۰ص۲۸۵۔

(۲)گذشتہ حوالہ۔

(۳)فروع کافی ج۸ص۵۲۔

نے نجات پائی، صالحؑ اور ان کے ساتھی آسمانی بجلی سے محفوظ رہے۔ تقویٰ کی بناء پر ہی صبر کرنے والے بلند درجات پر فائز ہوئے اور ہلاکت خیز مشکلات سے نجات حاصل کر سکے"

خلاصۂ کلام یہ کہ جو لوگ اللہ کی مرضی اور احکام کو اپنی خواہشات پر ترجیح دیتے ہیں اور حکم خدا کے سامنے اپنی ضرورتوں، خواہشوں اور ترجیحات کو اہمیت نہیں دیتے ہیں تو خداوند عالم زمین و آسمان کو ان کے رزق کا ضامن بنا دیتا ہے۔ ان کے امور کا خود ذمہ دار ہو جاتا ہے اور انھیں ان کے نفسوں کے حوالہ نہیں کرتا اور انکی سعی و کوشش میں توفیق و برکت عطا کرتا ہے۔

یہاں پھر سے یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ان باتوں کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تقویٰ کے بعد رزق حاصل کرنے کے لئے سعی و جستجو کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حصول رزق کے لئے صرف تقویٰ کو کافی سمجھ لینا اسلامی نظریہ نہیں ہے البتہ اتنا ضرور ہے کہ تقویٰ کے ذریعہ بندہ پر رزق نازل ہوتا ہے اور اس طرح آسانی کے ساتھ مختصر زحمت سے ہی رزق حاصل ہو جاتا ہے۔

تقویٰ کی بنا پر نجات پانے والے تین لوگوں کا واقعہ

نافع نے ابن عمر سے نقل کیا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تین آدمی چلے جا رہے تھے کہ بارش ہونے لگی تو وہ لوگ پہاڑ کے دامن میں ایک غار میں چلے گئے اتنے میں پہاڑ کی بلندی سے ایک بڑا سا پتھر گرا اور اسکی وجہ سے غار کا دروازہ بند ہو گیا۔ تو ان لوگوں نے آپس میں کہا: اپنے اپنے اعمال صالحہ پر نظر دوڑاؤ اور انھیں کے واسطہ سے خدا سے دعا کرو شائد خدا کوئی آسانی پیدا کر دے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ میرے والدین بہت بوڑھے تھے اور میرے بچے بھی بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔ میں بکریاں چرا کر ان کا پیٹ پالتا تھا واپس آکر بکریوں کا دودھ نکالتا تو پہلے والدین کے سامنے پیش کرتا اس کے بعد اپنے بچوں کو دیتا۔

اتفاقاً میں ایک دن صبح سویرے گھر سے نکل گیا اور شام تک واپس نہ آیا۔ جب میں واپس پلٹا تو میرے والدین سو چکے تھے میں نے روزانہ کی طرح دودھ نکالا اور دودھ لے کر والدین کے

سرہانے کھڑا ہو گیا مجھے یہ گوارہ نہ ہوا کہ انھیں بیدار کروں اور نہ ہی یہ گوارہ ہوا کہ والدین سے پہلے بچی کو دودھ پیش کروں حالانکہ بچی بھوک کی وجہ سے رو رہی تھی اور میرے قدموں میں بلبلا رہی تھی مگر میری روش میں تبدیلی نہ آئی یہاں تک کہ صبح ہو گئی پروردگارا! اگر تو یہ جانتا ہے کہ یہ عمل میں نے صرف تیری رضا کے لئے انجام دیا ہے تو اسی عمل کے واسطہ سے اتنی گنجائش پیدا کر دے کہ ہم آسمان کو دیکھ سکیں اللہ نے اتنی گنجائش پیدا کر دی اور ان لوگوں کو آسمان دکھائی دینے لگا۔

دوسرے نے کہا: میرے چچا کی ایک لڑکی تھی میں اس سے ایسی شدید محبت کرتا تھا جیسے کہ مرد عورتوں سے کرتے ہیں میں نے اس سے مطلب برآری کی خواہش کی اس نے سو دینار کی شرط رکھی میں نے کوشش کر کے کسی طرح سو دینار جمع کئے انھیں ساتھ لے کر اسکے پاس پہونچ گیا۔ اور جب شیطانی مطلب پورا کرنے کی غرض سے اس کے نزدیک ہوا تو اس نے کہا ''اے بندۂ خدا اللہ سے ڈرو اور ناحق میرا لباس مت اتارو'' یہ بات سن کر میں نے اسے چھوڑ دیا۔ پروردگار اگر میرا یہ عمل تیرے لئے ہے تو تھوڑی گنجائش اور مرحمت کر دے۔ اللہ نے تھوڑی سی گنجائش اور عطا کر دی۔

تیسرے آدمی نے کہا میں نے ایک شخص کو تھوڑے چاول کی اجرت پر اجیر کیا جب کام مکمل ہو گیا تو اس نے اجرت کا مطالبہ کیا میں نے اجرت پیش کر دی لیکن وہ چھوڑ کر چلا گیا میں اسی سے کاشت کرتا رہا یہاں تک کہ اسکی قیمت سے بیل اور اسکا چرواہا خرید لیا۔ ایک دن وہ مزدور آیا اور مجھ سے کہا: خدا سے ڈرو اور میرا حق مجھے دے دو۔ میں نے کہا جاؤ وہ بیل اور چرواہا لے لو اس نے پھر کہا خدا سے ڈرو اور میرا مذاق مت اڑاؤ۔ میں نے کہا میں ہرگز مذاق نہیں کر رہا ہوں یہ بیل اور چرواہا لے لو۔ چنانچہ وہ لے کر چلا گیا۔ پروردگار میرا یہ عمل اگر تیرے لئے تھا تو ہمارے لئے بقیہ راستہ کھول دے۔ اللہ نے راستہ کھول دیا۔(۱)

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الادب، باب اجابة دعاء من برّ والدیہ ج۵ ص۳۰ ط: مصر ۱۲۸۶ھ ق۔ فتح الباری للعسقلانی ج۱۰ ص۳۳۸ شرح القسطلانی ج۹ ص۵۔ صحیح مسلم کتاب الرقاق باب قصة اصحاب الغار الثلاثة والتوسل بصالح الاعمال ج۸ ص۸۹ ط: دار الفکر۔ وشرح النووی ج۱۰ ص۳۲۱ وذم الہوی لابن الجوزی ص۲۳۶

۳۔ كففت عليه ضيعته

اس جملہ کے دو معنی ہو سکتے ہیں کیونکہ ''کف'' جمع کرنے اور اکٹھا کرنے کے معنی میں بھی ہے اور یہی لفظ منع کرنے اور روکنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے لہٰذا پہلے معنی کے لحاظ سے اس جملہ ''و كففت عليه ضيعته'' کے معنی یہ ہوں گے ''میں اس کے درہم برہم امور کو جمع کردوں گا اس کے سامان واسباب کا نگہبان، اسکے امور کا ذمہ دار اور اسکی معیشت کا ضامن ہوں' ابن اثیر اپنی کتاب ''النہایۃ'' میں ''کف'' کے معنی کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ احتمال ہے کہ یہ لفظ ''جمع کرنے'' کے معنی میں ہو جیسے کہ حدیث میں آیا ہے:

﴿المؤمن أخ المؤمن يكفّ عليه ضيعته﴾(۱)

''ایک مومن دوسرے مومن کا بھائی ہے جو اسکے سرمایہ کو اسکے لئے اکٹھا کر کے رکھتا ہے''

اسکے دوسرے معنی منع کرنا، روکنا اور دفع کرنا ہیں جیسے:

﴿كفّه عنه فكفّ، أى دفعه وصرفه ومنعه، فاندفع وانصرف، وامتنع﴾

اس نے اسکو روکا یعنی اسکا دفاع کیا منع کیا اور واپس پلٹایا تو وہ دفع ہو گیا، پلٹ گیا اور رک گیا اس معنی کے لحاظ سے مذکورہ حدیث کے معنی یہ ہونگے:

''میں نے اسکی بربادی کو دفع کردیا اور اسکی بربادی اور اسکے درمیان حائل ہو گیا اور اسے ہدایت دیدی اور راستے کے تمام نشانات واضح وروشن کردئے''(۲)

علامہ مجلسی (رح) نے اس فقرہ کی تفسیر میں اپنی کتاب بحار الانوار میں تحریر کیا ہے: کہ اس جملہ میں چند احتمالات پائے جاتے ہیں: ا۔ وہ معنی جو ابن شیر نے نہایہ میں ذکر کئے ہیں یعنی اسکے درہم

---

(۱) النہایۃ لابن الاثیر ج۴ص ۹۰۔

(۲) اقرب الموارد ج۲ص ۱۰۹۳۔

برہم معاملات معیشت کو سمیٹ دونگا اور اسمیں "عــلــی" کے ذریعہ جو تعدیہ ہے اسکی بناپر، برکت اور شفقت وغیرہ کے معنی میں ہے یا "عــلــی" "الٰی کے معنی میں ہے جسکی طرف نہایہ میں اشارہ موجود ہے البتہ اس صورت میں برکت وغیرہ کے معنی مراد نہ ہونگے"

۲۔"کف" منع کرنے اور "عــلــی" "فــی" کے معنی میں ہو اور "ضــیــعــہ" ضائع اور برباد ہونے کے معنی ہو یعنی اس نے اسکی جان، مال، محنت اور اسکی تمام متعلقہ چیزوں کو ضائع ہونے سے بچالیا اسکی تائید اس فقرہ "و کــفــفــت عــنــه ضــیــعــتــه" سے بھی ہوتی ہے جو شیخ صدوق (رح) کی روایت کے ذیل میں آئندہ ذکر ہوگا۔

ہمیں یہ دوسرے معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں جو حدیث کے سیاق کے مطابق اور اس سے مشابہ بھی ہیں خاص طور سے جب ہمیں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ شیخ صدوق (رح) نے بعینہ اسی روایت میں "و کــفــفــت عنه ضیعته" نقل کیا ہے جس میں علیٰ کی جگہ عن سے تعدیہ آیا ہے اور جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے کہ کف دفع یا منع کرنے اور پلٹانے کے معنی میں ہے جو کہ رفع کے معنی سے مختلف ہیں کیونکہ دفع کے معنی، کسی چیز کے وجود میں آنے سے پہلے اسے روک دینا ہیں اور رفع کے معنی کسی چیز کے وجود میں آجانے کے بعد اسے زائل کردینا یا ختم کردینا ہیں یا دوسرے الفاظ میں یہ سمجھ لیں کہ رفع علاج کی طرح ہوتا ہے اور دفع بیماری آنے سے پہلے اسے روک دینے کی طرح ہے۔

اور کف، دفع کے معنی میں ہے نہ کہ رفع کے معنی میں جسکے مطابق اسکے معنی یہ ہونگے خداوند عالم نے اسکو ضائع نہیں ہونے دیا، یا وہ اسکی بربادی کے لئے راضی نہ ہوا اور یہ بھی ایک قسم کی ہدایت ہے کیونکہ ہدایت کی دو قسمیں ہیں:

۱۔گمراہی کے بعد ہدایت

۲۔گمراہی سے پہلے ہدایت

ان دونوں کو ہی ہدایت کہا جاتا ہے لیکن پہلی والی ہدایت اس وقت ہوتی ہے جب انسان

گمراہی اور تباہی میں مبتلا ہو چکا ہو لیکن دوسری قسم کی ہدایت اسکی گمراہی اور بربادی سے پہلے ہی پوری ہو جاتی ہے اور یہ قسم پہلی قسم سے زیادہ بہتر ہے۔

حدیث میں (کف ضیعتہ) بربادی سے حفاظت کا تذکرہ ہے نہ کہ ہدایت کا اور بربادی سے حفاظت، ہدایت کا نتیجہ ہے اس لئے یہ منزل مقصود تک پہونچانے کے معنی میں ہے نہ کہ راستہ دکھانے اور یاددہانی کے معنی میں۔

ہدایت کے معنی

لفظ ہدایت دو معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ہدایت کے ایک معنی منزل مقصود تک پہونچانا ہیں اور دوسرے معنی راستہ بتانا، راہنمائی کرنا ہیں جیسا کہ خداوند عالم کے اس قول:

﴿انك لاتهدی من احببت و لکن الله یهدی من یشاء﴾(۱)

''پیغمبر بیشک آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیدیتا ہے''

میں یہ لفظ پہلے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ طے شدہ بات ہے کہ یہاں جس ہدایت کی نفی کی جارہی ہے وہ منزل مقصود تک پہنچانے کے معنی میں ہے کہ یہ چیز صرف پروردگار عالم سے مخصوص ہے ورنہ راستہ دکھانا رہنمائی کرنا تو پیغمبر اسلام کا فریضہ اور آپ کی اہم ترین ذمہ داری ہے اس معنی میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لئے ہدایت کا انکار کرکے اسے صرف پروردگار سے مخصوص کردینا ممکن نہیں ہے کیونکہ خداوند عالم پیغمبر کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿و انك لتهدی الی صراط مستقیم﴾(۲)

''اور بیشک آپ لوگوں کو سیدھے راستہ کی ہدایت کررہے ہیں''

اسی معنی میں قرآن کریم میں مومن آل فرعون کا یہ جملہ ہے:

---

(۱) سورۂ قصص آیت ۵۶۔

(۲) سورۂ شوریٰ آیت ۵۲۔

﴿یا قوم اتبعون أهدکم سبیل الرشاد﴾(۱)

''اے قوم والو: میرا اتباع کرو، میں تمھیں ہدایت کا راستہ دکھادوں گا''

یہاں پر بھی ہدایت، راہنمائی اور راستہ دکھانے کے معنی میں ہے نہ کہ منزل مقصود تک پہنچانے کے معنی میں۔۔۔اس حدیث شریف میں بھی ہدایت کے پہلے معنی (منزل تک پہنچانا) ہی زیادہ مناسب ہیں اس لئے کہ دوسرے معنی کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ انسان ضائع نہ ہو بلکہ ایصال الی المطلوب ہی انسان کو ضائع ہونے سے بچاتا ہے اور انسان کو قطعی طور پر اللہ تک پہنچانے کا ضامن ہے سیاق وسباق سے بھی یہی معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں اس لئے کہ یہ گفتگو ان لوگوں پر خصوصی فضل الٰہی کی ہے کہ جو اپنے خواہشات پر اللہ کی مرضی کو مقدم کرتے ہیں لہٰذا فضل وعنایت کا خصوصی تقاضا یہ ہے کہ انھیں منزل مقصود تک پہنچایا جائے ورنہ رہنمائی اور راستہ دکھانا تو خدا کی عام عنایت ورحمت ہے جو صرف مومنین سے یا ان لوگوں سے مخصوص نہیں ہے کہ جو اللہ کی مرضی کو مقدم کرتے ہوں بلکہ یہ عنایت تو ان لوگوں کے شامل حال بھی ہے کہ جو اپنی خواہشات کو اللہ کی مرضی پر مقدم کرتے ہیں۔

اللہ بندہ کو بربادی اور ضائع ہونے سے کیسے بچاتا ہے؟

درحقیقت یہ کام بصیرت کے ذریعہ ہوتا ہے۔بصیرت کے اعلیٰ درجات پر فائز انسان قطعی طور پر ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے۔

لہٰذا جب خداوند عالم کسی بندہ کیلئے خیر کا ارادہ کرتا ہے اور اسے بربادی سے بچانا چاہتا ہے تو اسے بصیرت مرحمت کردیتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ نجات پاجاتا ہے اور خدا تک اس کی رسائی قطعی ہوجاتی ہے یہ بصیرت اس منطقی دلیل وبرہان سے الگ ہے کہ جس کے ذریعہ بھی انسان خدا تک پہنچتا

---

(۱)سورۂ غافر آیت ۳۸۔

ہے اور اسلام اس کا بھی منکر نہیں ہے بلکہ اسے اپنانے اور اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہے وہ اسے ہر شخص کے دل کی گہرائیوں میں اتارنا چاہتا ہے اس لئے کہ انسانوں کی بہت بڑی تعداد عقل و منطق کے سہارے ہی خدا تک پہنچتی ہے۔

بصیرت کا مطلب حق کا مکمل طریقہ سے واضح دکھائی دینا ہے۔ایسی رویت منطق استدلال کا نتیجہ بھی ہوسکتی ہے اور صفائے نفس اور پاکیزگی قلب کے ذریعہ بھی حاصل ہوسکتی ہے یعنی انسان کسی ایک راستہ سے اس بلند مقام تک پہنچ سکتا ہے یا عقلی اور منطقی دلائل کے ذریعہ یا پاکیزگی نفس کے راستہ۔

اسلام ان میں سے کسی ایک کو کافی قرار نہیں دیتا بلکہ اسلامی نقطۂ نظر سے انسان کے اوپر دونوں کو اختیار کرنا ضروری ہے۔یعنی عقلی روش کو اپنانا بھی ضروری ہے اور نفس کو پاکیزہ بنانا بھی۔اس آیۂ شریفہ میں قرآن مجید نے دونوں باتوں کی طرف ایک ساتھ اشارہ کیا ہے:

﴿ھو الذی بعث فی الامیّین رسولاً منھم یتلوا علیھم آیاتہ و یزکّیھم و یعلّمھم الکتاب و الحکمۃ و ان کانوا من قبلُ لفی ضلالٍ مبینٍ﴾(۱)

''اس خدا نے مکہ والوں میں ایک رسول بھیجا جو انھیں میں سے تھا کہ ان کے سامنے آیات کی تلاوت کرے، ان کے نفوس کو پاک کرے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے''

تزکیہ کا مطلب صفائے قلب اور پاکیزگی نفس ہے جس سے معرفت الٰہی کے بے شمار دروازے کھلتے ہیں۔

معرفت کا دوسرا باب (تعلیم) ہے بہر حال بصیرت چاہے عقل و منطق کا ثمرہ ہو یا تزکیہ وتہذیب نفس کا یہ طے ہے کہ حیات انسانی میں بصیرت کا سرچشمہ پروردگار عالم ہی ہے اسکے علاوہ کسی اور جگہ سے بصیرت کا حصول ممکن نہیں ہے اور اس تک رسائی کا دروازہ عقل و تزکیۂ نفس ہے۔

---

(۱)سورۂ جمعہ آیت ۲۔

بصیرت اور عمل

ایک بار پھر اس بات کی وضاحت کردیں کہ اسلام بصیرت کیلئے ''علم'' اور تزکیہ یا ''عقل اور صفائے قلب'' دونوں کو تسلیم کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ ان میں سے ایک، دوسرے سے بے نیاز نہیں کرسکتا لیکن یہ بھی طے ہے کہ حصول بصیرت کیلئے تزکیہ زیادہ اہم اور موثر ہے اسی لئے قرآن کریم نے آیہ بعثت میں تزکیہ کو علم پر مقدم رکھا ہے:

﴿یزکیهم ویعلّمهم الکتاب والحکمة﴾(۱)

''ان کے نفوس کو پاک کرے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے''

مناسب ہوگا کہ چند لمحے ٹھہر کر ہم خود (تزکیہ) کے بارے میں بھی غور کریں اور دیکھیں کہ تزکیہ نفس کیسے ہوتا ہے؟

رہبانیت کے قائل مذاہب میں تزکیہ کا مطلب یہ ہے کہ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی جائے اور حیات دنیوی سے فرار اختیار کیا جائے اس طرح تزکیہ کا خواہشمند انسان جب اپنی ہوئی وہوس اور خواہشات نفسانی اور فتنوں سے پرہیز کرے گا تو اسکا نفس پاکیزہ ہوجائے گا لیکن اسلامی طریقۂ تربیت میں صورتحال اس کے بالکل برعکس ہے۔ اسلام تزکیہ کے خواہشمند کسی بھی مسلمان کو ہرگز یہ نصیحت نہیں کرتا کہ فتنوں سے فرار کرے خواہشات اور ہوئی وہوس کو کچل دے بلکہ اسلام فرار کے بجائے فتنوں سے مقابلہ اور خواہشات کو کچل کر ختم کرنے کے بجائے انھیں حد اعتدال میں رکھنے کی دعوت دیتا ہے۔

اسلام کا طریقۂ تربیت، عمل کو تزکیہ کی بنیاد قرار دیتا ہے نہ کہ گوشہ نشینی، رہبانیت اور محرومی کو ۔اور یہی عمل بصیرت میں تبدیل ہوجاتا ہے جس طرح بصیرت عمل میں ظاہر ہوتی ہے لہٰذا

---

(۱) سورۂ جمعہ آیت ۲

دیکھنا یہ ہوگا کہ عمل کیا ہے؟ بصیرت کسے کہتے ہیں؟ اوران دونوں میں کیا رابطہ ہے؟

بصیرت اور عمل کا رابطہ

بصیرت کے بارے میں اجمالی طور پر گفتگو ہو چکی ہے۔۔ یہاں عمل سے مراد ہر وہ سعی وکوشش ہے جس کو انسان رضائے الٰہی کی خاطر انجام دیتا ہے اس کے دو رخ ہوتے ہیں ایک مثبت، یعنی اوامر خدا کی اطاعت اور دوسرا سلبی یعنی اپنے نفس کو حرام کاموں سے محفوظ رکھنا۔ اس طرح عمل سے مراد یہ ہے کہ خوشنودی پروردگار کی خاطر کوئی کام کرے چاہے کسی کام کو بجالا یا جائے اور چاہے کسی کام سے پرہیز کیا جائے۔ بصیرت اور عمل کے درمیان دوطرفہ رابطہ ہے۔ بصیرت عمل کا سبب ہوتی ہے اور عمل، بصیرت کا۔۔۔ اور دونوں کے آپسی اور طرفینی رابطے سے خود بخود بصیرت اور عمل میں اضافہ ہوتا رہتا ہے عمل صالح سے بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے اور بصیرت میں زیادتی عمل صالح میں اضافہ کا سبب بنتی ہے اس طرح انمیں سے ہر ایک دوسرے کے اضافہ کا موجب ہوتا ہے یہاں تک کہ انسان انھیں کے سہارے بصیرت وعمل کی چوٹی پر پہونچ جاتا ہے۔

۱۔ عمل صالح کا سرچشمہ بصیرت

بصیرت کا ثمرہ عمل صالح ہے۔ اگر دل وجان کی گہرائیوں میں بصیرت ہے تو وہ لامحالہ عمل صالح پر آمادہ کرے گی بصیرت کبھی عمل سے جدانہیں ہوسکتی ہے روایات اس چیز کو صراحت سے بیان کرتی ہیں کہ انسان کے عمل میں نقص اور کوتاہی دراصل اس کی بصیرت میں نقص اور کوتاہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں چند روایات ملاحظہ فرمائیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبرئیل امین سے نقل فرمایا ہے:

﴿الموقن یعمل للہ کأنہ یراہ،فان لم یکن یریٰ اللہ فان اللہ یراہ﴾(۱)

''درجۂ یقین پر فائز انسان اللہ کیلئے اس طرح عمل انجام دیتا ہے جیسے وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے اگر وہ اللہ کو نہیں دیکھ رہا ہے تو کم از کم اللہ تو اس کو دیکھ رہا ہے''

مولائے کائنات سے منقول ہے:

﴿یُستدل علیٰ الیقین بقصر الامل،واخلاص العمل،والزھد فی الدنیا﴾(۲)

''آرزووں کی قلت،اخلاص عمل اور زہد،یقین کی دلیلیں ہیں''

آپ ہی کا ارشاد گرامی ہے:

﴿التقویٰ ثمرۃ الدین،وأمارۃ الیقین﴾(۳)

''تقویٰ دین کا ثمرہ اور یقین کا سردار ہے''

نیز آپ سے مروی ہے:

﴿من یستیقن،یعملُ جاھداً﴾(۴)

''صاحب یقین بھرپور جدوجہد کے ساتھ عمل انجام دیتا''

امام جعفر صادق کا ارشاد ہے:

﴿ان العمل الدائم القلیل علیٰ الیقین،أفضل عنداللہ من العمل الکثیر علیٰ غیر یقین﴾(۵)

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۷ ص ۲۱۔

(۲) غرر الحکم ج ۲ ص ۳۷۶۔

(۳) غرر الحکم ج ۱ ص ۸۵۔

(۴) غرر الحکم ج ۲ ص ۱۶۶۔

(۵) اصول کافی ج ۲ ص ۵۷۔

"یقین کے ساتھ مسلسل تھوڑا عمل کرنا اللہ کے نزدیک یقین کے بغیر بہت زیادہ عمل سے افضل ہے"

آپ ہی کا ارشاد گرامی ہے:

﴿لاعمل الابیقین، ولایقین الابخشوع﴾(۱)

"یقین کے بغیر عمل اور خشوع کے بغیر یقین بے فائدہ ہے"

آپ نے ارشاد فرمایا:

﴿العامل علیٰ غیربصیرة کالسائر علیٰ سراب بقیعة لا یزیده سرعةالسیر الابعدا﴾(۲)

"بصیرت کے بغیر عمل انجام دینے والا ایسا ہے جیسے سراب کے پیچھے دوڑنے والا کہ اسکی تیزی اسے منزل سے دور ہی کرتی جاتی ہے"

صادق آل محمدؐ کا ہی یہ بھی فرمان ہے:

﴿انکم لا تکونون صالحین حتیٰ تعرفوا، ولا تعرفون حتیٰ تصدقوا ولاتصدقون حتیٰ تسلموا﴾(۳)

"تم اس وقت تک صالح نہیں ہو سکتے جب تک معرفت حاصل نہ کرلو اور یقین کے بغیر معرفت اور تسلیم کے بغیر تصدیق حاصل نہ ہوگی" یعنی تصدیق معرفت اور معرفت، عمل صالح کا ذریعہ ہے

امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے:

﴿لایقبل عمل الا بمعرفة، ولامعرفة الا بعمل، فمن عرف دلّته المعرفة علیٰ

---

(۱) تحف العقول ص ۲۳۳۔

(۲) وسائل الشیعہ ج ۱۸ ص ۱۲۲ ح ۳۶۔

(۳) بحار الانوار ج ۶۹ ص ۱۰۔

العمل﴾(۱)

''معرفت کے بغیر کوئی عمل قابل قبول نہیں ہے اور عمل کے بغیر معرفت بھی نہیں ہوسکتی جب معرفت حاصل ہوجاتی ہے تو معرفت خود عمل پرابھارتی ہے''

امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے:

﴿لا یقبل عمل الا بمعرفة، ولا معرفة الا بعمل، ومن عرف دلّته معرفته علیٰ العمل، ومن لم یعرف فلا عمل له﴾(۲)

''معرفت کے بغیر عمل قبول نہیں ہوتا اور عمل کے بغیر معرفت حاصل نہیں ہوتی جب معرفت حاصل ہوجاتی ہے تو وہ خود انسان کو دعوت عمل دیتی ہے جس کے پاس معرفت نہیں ہے اس کے پاس عمل بھی نہیں ہے''

۲۔بصیرت کی بنیاد عمل صالح

ابھی آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ عمل صالح کی بنیاد بصیرت ہے اسی کے بالمقابل بصیرت کا سرچشمہ عمل صالح ہے۔دوطرفہ متبادل رابطوں کے ایسے نمونے آپ کو اسلامی علوم میں اکثر مقامات پرنظر آئیں گے۔

قرآن کریم عمل صالح اور بصیرت کے اس متبادل اور دوطرفہ رابطہ کا شدت سے قائل ہے اور بیان کرتا ہے کہ بصیرت سے عمل اور عمل صالح سے بصیرت حاصل ہوتی ہے اور عمل صالح کے ذریعہ ہی انسان خداوند عالم کی جانب سے بصیرت کا حقدار قرار پاتا ہے۔

﴿والذین جاهدوا فینا لنهدینّهم سُبُلَنا وان الله لمع المحسنین﴾(۳)

---

(۱)اصول کافی ج۱ص۴۴۔

(۲)تحف العقول ص۲۱۵۔

(۳)سورۂ عنکبوت۶۹۔

''اور جن لوگوں نے ہمارے حق میں جہاد کیا ہے انھیں اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے اور یقیناً اللہ حسن عمل والوں کے ساتھ ہے''

آیت واضح طور پر بیان کررہی ہے کہ جہاد (جو خود عمل صالح کا بہترین مصداق ہے) کے ذریعہ انسان ہدایت الٰہی کو قبول کرنے اور حاصل کرنے کے لائق ہوتا ہے۔

﴿لنهدينّهم سبلنا﴾(۱)

''ہم انہیں اپنے راستوں کی ہدایت کرینگے''

حدیث قدسی میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے:

﴿لايزال عبدي يتنفّل لي حتىٰ اُحبّه ، فاذا أحببته كنت سمعه الذي به يسمع، وبصره الذي يبصر به،و يده التي بها يبطش﴾(۲)

''میرا بندہ مجھ سے نزدیک ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن کے ذریعہ وہ سنتا ہے اسکی

---

(۱) خداوند عالم ہمارے شیخ جلیل مجاہد راہ خدا شیخ عباس علی اسلامی پر رحمت نازل کرے میں ان سے اکثر یہ سنا کرتا تھا: کہ انسان کو ہر حرکت کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جن کا بدل ممکن نہیں ہے ایک تو وہ اس چیز کا محتاج ہوتا ہے جو تحرک میں اس کی مدد کرے اور حرکت کی تکان کو ہلکا کردے اور اسے ایسی طاقت وقوت عطا کرے جس سے وہ اپنی حرکت کو جاری رکھ سکے اور دوسرے اس چیز کا محتاج ہوتا ہے جو اسے صحیح راستہ کی رہنمائی کرتی رہے تاکہ وہ راستہ سے بھٹکنے نہ پائے یعنی اسے ایسی قوت وطاقت کی ضرورت ہوتی ہے جو ہدایت اور بصیرت کے مطابق اس کی حرکت کا راستہ معین کرے تاکہ وہ صراط مستقیم پر چلتا رہے اور انہیں دونوں چیزوں کا وعدہ ہم سے پروردگار عالم نے سورۂ عنکبوت کی آخری آیت میں فرمایا ہے: ﴿والذين جاهدوا فينالنهدينهم سبلناوانّ الله لمع المحسنين﴾ پس جولوگ خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہیں پروردگار عالم ان کو پہلے تو پشت پناہی اور قوت وطاقت عطا کرتا ہے اور یہی خدا کی معیت ہے''انّ الله لمع المحسنين﴾ اور دوسرے ان کو بصیرت وہدایت عطا کرتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے ﴿لنهديهم سبلنا﴾۔

(۲) اصول کافی ج۲ص ۳۵۲۔

آنکھیں بن جاتا ہوں جنکے ذریعہ وہ دیکھتا ہے اسی کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن کے ذریعہ وہ چیزوں کو چھوتا ہے''

یہ بہت ہی مشہور و معروف حدیث ہے تمام محدثوں، معتبر راویوں اور مشائخ حدیث نے اس حدیث قدسی کو نقل کیا ہے نقل مختلف ہے مگر الفاظ تقریباً ملتے جلتے ہیں اور روایت صحیح ہے اور وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ عبادت، معرفت و یقین کا دروازہ ہے اور بندہ قرب الٰہی کی منزلیں طے کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ اسے بصیرت عطا کر دیتا ہے پھر وہ اللہ کے ذریعہ سنتا ہے دیکھتا ہے اور ادراک حاصل کرتا ہے۔۔۔اور ظاہر ہے کہ جو اللہ کے ذریعہ یہ کام انجام دے گا تو اسکی سماعت بصارت اور معرفت میں خطا کا کوئی امکان نہیں ہے۔

دوسرا رخ

عمل اور بصیرت کے درمیان دوطرفہ رابطہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کس طرح بصیرت سے عمل اور عمل سے بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے اسی کے ساتھ ساتھ اس رابطہ کا دوسرا رخ بھی ہے جس کے مطابق برے اعمال اور کردار کی خرابی بصیرت میں کمی، اندھے اور بہرے پن کا سبب ہوتے ہیں اس کے برعکس یہ چیزیں بے عملی اور گناہ و فساد کا باعث ہوتی ہیں۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے روایات کی روشنی میں عمل اور بصیرت کے درمیان مثبت رابطہ کی وضاحت کی تھی اسی طرح اس رابطہ کے دوسرے رخ کو بھی احادیث کی روشنی میں ہی پیش کر رہے ہیں۔

بے عملی سے خاتمۂ بصیرت

اسلامی روایات سے یہ صاف واضح ہوجاتا ہے کہ برے اعمال سے بصیرت ختم ہوتی رہتی ہے قرآن کریم نے بھی متعدد مقامات پر اس حقیقت کا اظہار و اعلان کیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿افرایت من اتخذ الٰهه هواه و اضلّه الله علیٰ علمٍ و ختم علیٰ

سمعه و قلبه وجعل علیٰ بصره غشاوۃً فمن یهدیه من بعد الله﴾(۱)

''کیا آپ نے اس شخص کو بھی دیکھا جس نے اپنی خواہش ہی کو خدا بنالیا اور خدا نے اسی حالت کو دیکھ کر اسے گمراہی میں چھوڑ دیا اور اسکے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اسکی آنکھ پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور خدا کے بعد کون ہدایت کر سکتا ہے''

جن لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کی عبادت کر کے شرک اختیار کیا اللہ ان سے بصیرت سلب کر لیتا ہے اور ان کے کانوں اور دلوں پر مہر لگا دیتا ہے آنکھوں پر پردے ڈال دیتا ہے اور طے ہے کہ جب اللہ کسی بندہ سے بصیرت سلب کر لے تو پھر اسے کون ہدایت دے سکتا ہے؟ اسی کو قرآن مجید ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

﴿کذلك یُضلّ الله الکافرین﴾(۲)

''اللہ اسی طرح کافروں کو گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے'' یہ جملہ دراصل گذشتہ تفصیل کا اجمالی بیان ہے

﴿کذلك یُضلّ الله من هو مسرف مرتاب﴾(۳)

''اسی طرح خدا زیادتی کرنے والے اور شکی مزاج انسانوں کو انکی گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے''

اس لئے کہ اسراف گمراہی کی طرف لے جاتا ہے

اسی طرح ارشاد ہوتا ہے:

﴿وما یُضلّ به الا الفاسقین﴾(۴)

''اور گمراہی صرف انکا حصہ ہے جو فاسق ہیں''

---

(۱) سورۂ جاثیہ آیت ۲۳۔

(۲) سورۂ غافر آیت ۷۴۔

(۳) سورۂ غافر آیت ۳۴۔

(۴) سورۂ بقرہ آیت ۲۶۔

یا:﴿ ویُضلّ الله الظالمین﴾(۱)

''اللہ ظالمین کوگمراہی میں چھوڑ دیتا ہے''

اس کا مطلب یہ ہے کہ فسق اور ظلم، گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں۔

خداوندعالم کاارشاد ہے:

﴿کلا بل ران علیٰ قلوبهم ما کانوا یکسبون﴾(۲)

''نہیں بلکہ ان کے دلوں پران کے اعمال کا زنگ لگ گیا ہے''

انسان جب گناہوں اور معصیتوں کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کے یہی اعمال ایک ٹیلہ کی شکل میں جمع ہوکر اس کے قلب کے سامنے رکاوٹ بن جاتے ہیں اور پھر خدا اور حق اسے نظر نہیں آتے۔

خداوندعالم کاارشاد ہے:

﴿انّ اللّٰہ لا یَھدِ ی القومَ الظّالِمِیْنَ﴾(۳)

''اللہ ظالموں کی ہدایت نہیں کرتا''

﴿ان الله لا یهدی القوم الکافرین﴾(۴)

''اللہ کافروں کی ہدایت نہیں کرتا''

﴿انّ اللّٰہ لا یَھدِ ی القَوْمَ الْفاسقین﴾(۵)

''یقیناً اللہ بدکار لوگوں کی ہدایت نہیں کرتا''

---

(۱)سورۂ ابراہیم آیت ۲۷۔

(۲)سورۂ مطففین آیت ۱۴۔

(۳)سورۂ قصص آیت ۵۰۔

(۴)سورۂ مائدہ آیت ۶۷۔

(۵)سورۂ منافقون آیت ۶۔

﴿انَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِ ى من هوَ مُسْرِف كَذّا ب﴾(۱)

''بیشک اللہ کسی زیادتی کرنے والے اور جھوٹے کی ہدایت نہیں کرتا''

﴿انَّ اللّٰهَ لَايَهْدِى من هُو كاذب كفار﴾(۲)

''اللہ کسی بھی جھوٹے اور ناشکری کرنے والے کی ہدایت نہیں کرتا''

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

﴿لولا تكثير فى كلامكم ،وتمزيج فى قلوبكم، لرأيتم ما أرىٰ و سمعتم ما اسمع﴾(۳)

''اگر تمہارے کلام میں کثرت نہ ہوتی اور قلوب آلودہ نہ ہوتے تو تم بھی وہی دیکھتے جو میں دیکھتا ہوں اور وہی سنتے جو میں سنتا ہوں''

امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

﴿كيف يستطيع الهدىٰ من يغلبه الهوىٰ﴾(۴)

''جس پر ہوئی وہوس غالب ہو وہ کیسے ہدایت پاسکتا ہے؟''

آپؑ کا ہی ارشاد ہے:

﴿انكم ان اَمّرتُم عليكم الهوىٰ أصمّكم و أعماكم و أرداكم﴾(۵)

''اگر تم نے اپنے اوپر ہوئی وہوس کو غالب کرلیا تو وہ تمہیں بہرا، اندھا اور پست بنادیں گی''

اس سے معلوم ہوا کہ مسلسل باطل اور فضول باتیں کرنا اور دلوں میں حق و باطل کا گڈمڈ ہونا یہ

---

(۱) سورۂ غافر آیت ۲۸۔

(۲) سورۂ زمر آیت ۳۔

(۳) المیزان ج۵ص۲۹۲۔

(۴) غرر الحکم ج۲ص۹۴۔

(۵) غرر الحکم ج۱ص۲۶۴۔

آنکھوں کو اندھا اور کانوں کو بہرا بنا دیتا ہے۔

امام محمد باقرؑ نے فرمایا:

﴿مامن عبد الا وفی قلبه نکتة بیضاء،فاذا أذنب خرج فی تلک النکتة،نکتة سوداء،فاذا تاب ذهب ذٰلک السواد،وان تمادیٰ فی الذنوب زادذلک السواد حتیٰ یغطّی البیاض،فاذا غطّیٰ البیاض لم یرجع صاحبه الیٰ خیر أبداً،وهو قول الله عزّ وجل:﴿بل ران علیٰ قلوبهم ما کانوا یکسبون﴾(۱)

"ہر انسان کے دل میں ایک سفیدی ہوتی ہے انسان جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس سفیدی میں ایک سیاہ نقطہ نمودار ہو جاتا ہے اگر گناہگار توبہ کر لیتا ہے تو وہ سیاہی زائل ہو جاتی ہے لیکن اگر گناہوں کا سلسلہ جاری رہے تو سیاہی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ یہ سیاہی دل کی سفیدی کو ڈھانپ لیتی ہے اور جب سفیدی پوشیدہ ہو جاتی ہے تو ایسا انسان کبھی خیر کی جانب نہیں پلٹ سکتا۔ یہی خداوند عالم کے قول ﴿بل ران علیٰ قلوبهم ما کانوا یکسبون﴾ "نہیں نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کا زنگ لگ گیا ہے" کے معنی ہیں"

یہی سیاہی جب قلب پر چھا جاتی ہے تو اسکے لئے حجاب بن جاتی ہے جس کے نتیجہ میں انسان سے بصیرت سلب ہو جاتی ہے بالفاظ دیگر انسان جب گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے تو بصیرت ختم ہو جاتی ہے۔

امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے:

﴿ماشیء أفسد للقلب من الخطیئة،ان القلب لیواقع الخطیئة فماتزال به حتیٰ تغلب علیه فیصیر أسفله أعلاه،وأعلاه أسفله ،قال رسول الله(ص)﴾(۲)

---

(۱) نور الثقلین ج۵ ص ۵۳۱۔

(۲) گذشتہ حوالہ۔

''خطا سے بڑھ کر قلب کو فاسد کرنے والی کوئی شے نہیں ہے، بیشک جب دل میں کوئی برائی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اسی میں باقی رہ کر اس پر غلبہ حاصل کر لیتی ہے تو اس کا نچلا حصہ اوپر اور اوپری حصہ نیچے ہو جاتا ہے''

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ﴿انّ المؤمن اذا أذنب کانت نکتة سوداء فی قلبه، فاذا تاب ونزع واستغفر صقل قلبه، وان ازداد زادت فذلك الرين الذی ذکره اللّٰہ تعالیٰ فی کتابه ﴿کلّا بل ران علیٰ قلوبهم ماکانوا یکسبون﴾(۱)

''مومن جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نقطہ بن جاتا ہے اگر توبہ واستغفار کر لے تو اسکا قلب صیقل ہو جاتا ہے لیکن اگر گناہوں میں زیادتی ہوتی رہے تو یہی (رین) یعنی زنگ بن جاتا ہے جسے خدا نے آیت ﴿کلّا بل ران علیٰ قلوبهم﴾ میں فرمایا ہے''

امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

﴿انّ أطعت هواك اصمك وأعماك﴾(۲)

''اگر تم ہویٰ و ہوس کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہیں بہرا اور اندھا بنا دے گی''

فقدان بصیرت برے اعمال کا سبب

جس طرح برائیوں اور گناہوں سے گمراہی پیدا ہوتی ہے اسی کے برعکس ضلالت و گمراہی بھی گناہ اور بدعملی کا سبب ہوتی ہے اور اس طرح جہالت وضلالت اور فقدان بصیرت کے باعث شقاوت و بدبختی ظلم واسراف جیسے برے اعمال وجود میں آتے ہیں۔

خداوند عالم کا ارشاد ہے:

﴿قالوا ربّنا غلبت علیناشقوتنا و کنّا قوما ضالّین﴾(۳)

---

(۱) نور الثقلین ج۵ ص۵۳۱۔

(۲) غرر الحکم۔

(۳) سورۂ مومنون آیت ۱۰۶۔

"وہ لوگ کہیں گے کہ پروردگار ہم پر بدبختی غالب آ گئی تھی اور ہم لوگ گمراہ ہو گئے تھے"

امیرالمومنین حضرت علی ؑ نے فرمایا:

﴿لاورع مع غيّ﴾(۱)

"گمراہی کے بعد کوئی پارسائی نہیں رہتی"

مولائے کائنات ؑ نے ،معاویہ بن ابی سفیان کو اپنے خط میں تحریر فرمایا ہے:

﴿امرىء ليس له بصر يهديه،ولا قائد يرشده،قد دعاه الهوىٰ فأجابه،وقاده الضلال فاتبعه، فهجر لاغطاً،وضلّ خابطاً﴾(۲)

"(مجھے تیرا جو خط ملا ہے) یہ ایک ایسے شخص کا خط ہے جس کے پاس نہ ہدایت دینے والی بصارت ہے اور نہ راستہ بتانے والی قیادت۔اسے خواہشات نے پکارا تو اس نے لبیک کہدی اور گمراہی نے کھینچا تو اسکے پیچھے چل پڑا اور اسکے نتیجہ میں اول فول بکنے لگا اور راستہ بھول کر گمراہ ہو گیا"

آپ ہی کا ارشاد گرامی ہے:

﴿من زاغ ساءت عنده الحسنة،وحسنت عنده السيئة،وسكر سكر الضلالة﴾(۳)

"جو کجی میں مبتلا ہوا،اسے نیکی برائی اور برائی نیکی نظر آنے لگتی ہے اور وہ گمراہی کے نشہ میں چور ہو جاتا ہے"

لہٰذا معلوم ہوا کہ بصیرت اور عمل میں دوطرفہ مستحکم رابطہ ہے یہ رابطہ مثبت انداز میں بھی

---

(۱) غررالحکم ج۲ص ۳۴۵۔

(۲) نہج البلاغہ مکتوب ۷۔

(۳) نہج البلاغہ حکمت ۳۱۔

ہے اور منفی صورت میں بھی۔ جسے اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ بصیرت، عمل صالح کی طرف لے جاتی ہے۔

۲۔ عمل صالح، بصیرت وہدایت کا سبب ہوتا ہے۔

۳۔ ضلالت اور فقدانِ بصیرت، ظلم وجور جیسے دیگر برے اعمال اور گناہوں کا سبب ہوتی ہے۔

۴۔ برے اعمال اور ظلم وجور سے بصیرت ختم ہوجاتی ہے۔

خلاصہ کلام

حدیث شریف کے فقرہ ''کفف علیه ضیعته'' کے بارے میں جو گفتگو ہوئی اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان جب خواہشات نفس کی مخالفت کر کے اپنے خواہشات کو ارادۂ الٰہی کا تابع بنادیتا ہے اور مالک کی مرضی کا خواہاں ہوتا ہے تو خدا اسے نور ہدایت اور بصیرت عنایت فرمادیتا ہے اور تاریک راستوں میں اسکا ہاتھ تھام لیتا ہے۔

خداوند عالم کا ارشاد ہے:

﴿یاأیها الذین آمنوا اتقوا الله وآمنوا برسوله یؤتکم کِفلین من رحمته ویجعلْ لکم نوراً تمشون به﴾(۱)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور رسول پر واقعی ایمان لے آؤ تا کہ خدا تمہیں اپنی رحمت کے دو بڑے حصے عطا کردے اور تمہارے لئے ایسا نور قرار دیدے جس کی روشنی میں چل سکو''

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

﴿یاأیها الذین آمنوا انْ تتقوا الله یجعلْ لکم فرقاناً﴾(۲)

---

(۱) سورۂ حدید آیت ۲۸۔

(۲) سورۂ انفال آیت ۲۹۔

"ایمان والو! اگر تم تقوائے الٰہی اختیار کروگے تو وہ تمہیں حق و باطل میں فرق کرنے کی صلاحیت عطا کر دے گا"

﴿و اتقوا اللہ و یعلمکم اللہ﴾(۱)

"اور اللہ سے ڈرو تا کہ اللہ تمہیں علم عطا کرے"

حضرت علیؑ سے مروی ہے:

﴿ھُدی من أشعر قلبه التقویٰ﴾(۲)

"وہ ہدایت یافتہ ہے جس نے تقویٰ کو اپنے دل کا شعار بنالیا"

﴿ھُدی من تجلبب جلباب الدّین﴾(۳)

"وہ ہدایت یافتہ ہے جس نے دین کا لباس اوڑھ لیا"

﴿من غرس أشجار التُقیٰ، جنیٰ ثمار الهدیٰ﴾(۴)

"جس نے تقویٰ کے درخت بوئے وہ ہدایت کے پھل کھائے گا"

والحمدللہ رب العالمین

محمد مہدی آصفی

۱۰ ذی القعدہ ۱۴۱۲ قم

---

(۱) سورۂ بقرہ آیت ۲۸۲۔

(۲) غرر الحکم ج۲ ص ۳۱۱۔

(۳) گذشتہ حوالہ۔

(۴) غرر الحکم ج۲ ص ۲۳۵۔
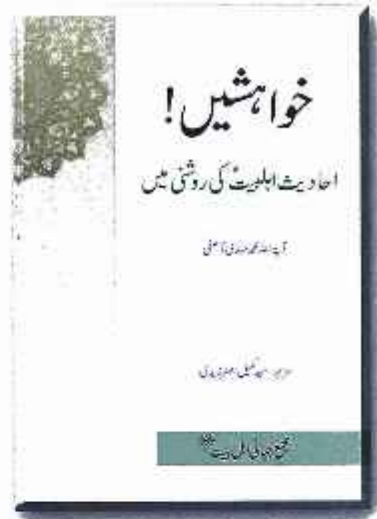
ISBN 964-529-067-8
9 789645 290670

Presented by: www.jafrilibrary.com